عشاق کے قافلے

5

مستیں توکلی

1825–1896

شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب:	مستیں توکلی
مصنف:	شاہ محمد مری
پہلی اشاعت:	2007ء
دوسری اشاعت:	2014ء
تعداد:	1000
قیمت:	500روپے

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ

فون:081-2843358

ای میل:Editorsangat@sangat.net

ویب سائٹ:www.sangatacademy.net

انتساب

مست کے نام
مست کی مہر کے نام،
مست کی سرمستی
اور جنون کے نام

ننـدوں کـاھـانـا بیثغوں کوھانی مری
وَرضــا بیثـو بھــانـغـے سـمّـوئے کثئی

کاہان کا (عام) کوہستانی مری ہوں
راضی تو (خدا) خود ہو گیا ، بہانہ سمو کو بنایا

فہرست

پیش لفظ

7

سمو.....محبوبہ بننے سے پہلے 21

Taukali 25

بگ بینگ 38

سمو کا حسن 51

مست توکلی.....اتاہ درد کا دوسرا نام 106

مناظر کا ڈائریکٹر 154

مست.....ویلیو سسٹم کا باغی 195

رستانی کانفرنس 233

پیرک وگراں ناز 239

کیا مست کی محبت یک طرفہ تھی؟ 252

مست کی یونیورسٹیاں 261

مستی، مستالائی 310

مست کی شاعری 338

پتھروں نے بولنا بند کر دیا 350

سمو کی قبر 356

زندگی کو موت نہیں 259

ضمیمہ جات

منتخب کلام کا سرائیکی ترجمہ، از' صوفی تاج گوپانگ 364

منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ، از' مہران بلوچ 374

پیش لفظ

یہ بلوچستان کے مری قبائلی علاقہ میں بسا دُور افتادہ گاؤں، ماوند ہے۔اس کے موسمِ گرما کی چاندنی سے راتیں نہائی ہوتی ہیں۔ایسی چاندنی راتوں میں اکثر ایک گھر کے آنگن میں توکلی مست کا نغمہ گونجا کرتا تھا۔ یہ ایک باپ تھا جو اپنے خوش قسمت بچوں کو اِس دھرتی کے عظیم فلسفی شاعر، توکلی کا کلام گا گا کر سناتا تھا۔کیا اُس وقت وہ اِس بات سے آشنا تھا کہ مست کا کلام اِن بچوں کے لیے فقط ایک میٹھی لوری ہی نہیں رہے گا؟۔کیا وہ یہی چاہتا تھا جو بعد میں ہوگیا؟۔اُن میں سے ایک بچہ اپنے دل میں اس شاعری کا ایک ایک حرف اس کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ رقم کرتا جارہا تھا۔ سوچتا ہوں کہ روایتی ڈگری والی تعلیم سے تہذیبی شعور کے تعلق کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

آج بھی اُس بچے کے ذہن میں اپنے باپ کا گایا ہوا مست توکلی کا کلام گونجتا ہے۔ جب بھی اردگرد کا ماحول اُسے متفکر کردیتا ہے تو وہ اسی خردمند کے فلسفے کی آغوش میں ڈوب جاتا ہے اور امید کی نئی کرنیں تلاش کرتا ہے۔مست توکلی سے وہ اپنی دہائیوں پرانی لگن کو کتابی صورت دیتا ہے۔اور یوں بڑا توکلی مست ایک وسیع دنیا میں پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے بھی فیض کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

توکلی مست کا نام لیتے ہی ذہن میں اُس کی تصویر بطور ایک محبت کرنے والے کے ابھر آتی ہے۔فخرِ عشاق، مست توکلی کے پاس صرف ایک سپیشلٹی تھی: محبت۔مست کا تذکرہ کسی اور طرح سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اُس کی شاعری، دوستیاں، دشت نوردیاں، سب اسی پروٹون مرکزے کے طواف کنندہ الیکٹرون تھے۔

مست اور سمو کی محبت خلا میں نہیں، زمین پہ برپا ہوئی کہ زمیں مکاں ہے۔ یہ محبت زمان کی چوکھاٹ ہی میں رونما ہوئی تھی کہ انسانی واقعات وقت کے تانے بانے میں سرزد ہوتے ہیں۔ زمانہ جغرافیہ کو اپنا پنگھوڑا بنائے رکھتا ہے اور جغرافیہ، خود پہ بسنے والوں کی معاشی معاشرتی زندگی کا خالق و پالن ہار ہوتا ہے۔ وقت، جغرافیہ اور انسانی پیداواری سرگرمی، تینوں مل کر اپنی مطابقت میں حالات کو ہی نہیں بدلتے بلکہ اپنے آپ کو بھی سربلند کرتے جاتے ہیں۔انھی عناصر نے مستیں توکلی اور سمو کے کردار تخلیق کیے، انھیں وسیع سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنایا، تقدس وعظمت کے نمونے میں ڈھال دیا اور ان کی داستان کو ابدیت عطا کی۔مہر بہانہ بنادیا گیا۔

ایک ایسا محبّ جس نے زندگی میں کچھ اور کام نہ کیا تھا۔مست توکلی کی بینا آنکھیں جب ایک بار محبت سے چار ہوئی تھیں تو پھر زندگی بھر اُسی کے سامنے بچھی ہی رہیں۔مست نے اپنے روح وجسم کا ایک ایک خلیہ شرابِ عشق میں بھگودیا اور پھر زندگی بھر اسی عشق کا ہوگیا۔

ظاہر ہے اُس پہ لکھی گئی ہر کتاب، ہر مضمون بھی محبت ہی کے موضوع پر ہوگا۔اور بقول مولانا روم ''وہ جو محبت کے سامنے اندھا ہے، وہ کتے سے بھی بدتر ہے''۔

مگر مست کا مہر رہبانیت کو فروغ دینے والا نہیں ہے۔ یہ مہر فلسفہ میں گندھا ہوا مہر ہے۔ لٹریچر میں ملفوف، فنونِ لطیفہ میں جذب شدہ۔ مادری قومی زبان ترقی پاتی ہے، موسیقی عروج پاتی ہے اور عوامی کلچر مزید لطیف و دلپذیر بن جاتا ہے۔

اس نے ہمارے قبائلی معاشرے میں شاید پہلی بار بتایا کہ محبت لامحدود ہے، اُسے محض جسمانی سرحدوں تک محدود رکھنا بہت زیادتی ہے۔مست کی پوری زندگانی میں جسم بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔گورا کالا، ننگ، نام، جنت دوزخ، قبیلہ قوم سب پیچھے رہ جاتے ہیں۔بس ایک ''اُس'' کا خیال

ساتھ رہتا ہے۔ خیال جو درد بھرا ہوتا ہے۔ درد جو دوزخ جیسا تکلیف دہ ہوتا ہے، درد جو عاشق کی ہستی مٹا دیتا ہے۔ درد جو بوڑھے کو مار کر جوان بنائے رکھتا ہے۔ جو انسان کو عدم میں پہنچا کر دوام عطا کرتا ہے۔ درد جو قلب، روح اور نفس سب کچھ کو نکال باہر کرتا ہے، اُسے شریک پسند نہیں ہوتا۔ وہ لاشریک سے وصل کی خاطر لاشریک رہنا چاہے۔

مہر کا انعام دلِ پُرخوں ہی ہوتا ہے۔ مہر کا اپنا ہی مے کدہ ہوتا ہے، اپنا ساقی ہوتا ہے، اُس کے سلام دعا کا اپنا طرز ہوتا ہے، اس کے اپنے اسلاف ہوتے ہیں۔ اپنے بزرگ اور اپنا شجرۂ نسب ہوتا ہے۔ یہ خود اپنا برخوردار ہوتا ہے، اور خود ہی اپنا بزرگوار..... مہر ہر زمانے ہر سماج کا بزرگ ہے۔

توکلی مست کا زمانہ وہ ہے جہاں اُس کے قبیلے پر انگریز کی عمل داری بہت ڈھیلی ڈھالی ہے۔ 1839 کی جنگ کے وقت وہ کم سن تھا۔ اور بعد میں اُس کی زندگی میں (اور اس کی موجودگی میں) کوئی بہت بڑی جنگ ہوئی نہیں۔ سرداری بھی اس قدر مضبوط نہ تھی۔ اُسے تو بعد میں سنڈیمن نے آبِ حیات پلانا تھا۔ ذرائع پیداوار وہی مویشی بانی تھے۔ ایک ڈھیلا ڈھالا، قدیم کمیونسٹ سماج سے حال ہی میں نکلا باشرف بلوچ سماج، جہاں قبائلی اخلاق کوڈز کی پاس داری ہوتی تھی۔ ہر لحاظ سے انیسویں صدی کے وسط کا بلوچستان جہاں کوئی بڑی سماجی تحریک نہیں، معاشی اتھل پتھل نہیں۔ فطرت بھی خاموش..... ایک آدھ برس قحط کی پیدا کردہ ہل جُل کے علاوہ مکمل خاموشی۔

ایسے میں مست توکلی منظر پہ ابھر آتا ہے۔ ایک محبّ، ایک سیلانی، ایک اَن پڑھ، ایک مفکر، ایک فلسفی اور ایک شاعر کی حیثیت سے وہ اِس خفتہ سماج میں ارتعاش و جنبش کے ایسے بیج بو دیتا ہے جن کی زود افزائش کے تو کوئی امکان نہیں تھے، البتہ بہت دیرپا اور مستقل اثرات کی پیش گوئی حتمی تھی۔ مستیں توکلی دو سو برس قبل کے بلوچ سماج کا دانش ور تھا۔ ایسا معاشرہ جو خود کفالت کی مرگ آور خاموشی میں مبتلا نہ تھا۔ غربت بہت تھی۔ کھیتی باڑی اور مویشی بانی پورا سال پیٹ بھرنے کو ناکافی تھی۔ اس ناکافی پن سے نمٹنے کی خاطر قبائل ایک دوسرے پر حملے کر کے مالِ غنیمت سے حاصل شدہ کو بارہ ماہ کے بقیہ دو چار ماہ اپنے گزارہ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مست توکلی اسی تلخ قبائلی

کشت و خون پہ مشتمل جنگوں میں تلوار ڈھال کے ساتھ حاضر رہا۔ اور پھر جب باشعور ہوا تو انہی قبائلی جنگوں کے خلاف بہت توانائی سے بولتا رہا۔

عمومی عالم گیر صداقتوں پر مشتمل مست کے فلسفے نے کوئی تحریری صورت اختیار نہ کی کہ لکھ پڑھ کا رواج تھا نہیں۔ صرف سینے تھے، دھڑکتے دل تھے، دماغ تھا (اور دماغ یادداشت کا مرکز تھا)۔ سو نہ صرف اس کے مصرعے اِس قبیلے کی یادداشت مرکز میں محفوظ رہے بلکہ وہ اپنی قبائلی سرحدات کو ملیا میٹ کرتے ہوئے عالمی ادب کا حصہ بن گئے۔ ٹیپ، فلمیں، ڈرامے، رسائل، ریڈیو، ٹی وی..... مست ہماری ارواح اور روحانی سرگرمیوں کا حصہ بن گیا۔ دو سو برس بعد۔ مست نے بلوچ سماج کو اپنے پڑوسی سرائیکستان، پنجاب، سندھ، اور پشتون دیس کے بود و باش سے بڑے پیمانے پر متعارف کرا دیا، جغرافیائی و قبائلی بندشیں حدیں ملیا میٹ کر دیں اور لولا کی عشق کے جھنڈے اپنے فلک بوس پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پہ لہرائے۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس نے تو اپنی شاعری کو ابد تک قائم رکھنے کا ایک اور بندوبست بھی کر لیا:

ہر کسے شیرانہ گشی مستئے قصواں
کل گناہ معافہ بنت ژہ خاوندہ درا

ترجمہ:

جو بھی اُس کے اشعار کہے گا، اُس کا ذکر کرے گا
مالک کے دربار میں اس کے سارے گناہ معاف ہوں گے

مطلب یہ ہے کہ مست کی خواہش ہے کہ اُس کے اشعار دہرائے جاتے رہیں۔ اُسے فراموش نہ کیا جائے۔ اُس کی محبت کے تذکرے جاری رہیں۔ ویسے تو اس نے اتمامِ حجت کے بطور یہ فرمائش کر دی اس لیے کہ اُس کی شاعری ہی ایسی نادر ہے کہ جمال و جمالیات بھری روحیں، معانی و مطلب کی متلاشی بصیرتیں، رسیاؤں کی طرح تا ابد اِس پہ ٹوٹ ٹوٹ پڑیں گی۔

بھئی مست کی شاعری تو زرتشی بلوچوں کی مقدس دائمی آگ ہے جس میں وہ ساری زندگی اپنی روح، اپنے دل، اور اپنے وجود کی ہڈیاں توڑ کر پھینکتا رہا۔ ایسی آفاقیت اُس میں ڈال دی

کہ ابد تک اس کے روشن رہنے کا انتظام کر دیا۔

تو کلی مست کی شاعری کا محور اور منبع سمو ہے.....سمو جو محبت کے اس بڑے ناول کی ہیروئن ہے۔ اُس کا مرکزی نکتہ، اُس کی نیوکلیئس ۔سمو نہ ہو تو مست کے الیکٹرون کائنات کی وسعتوں میں بے مالکن بھیڑوں کی طرح بکھر بکھر جائیں۔سمو، مست کے نظامِ شمسی کی سورج ہے۔

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فن پارے کے تخم تو فطرت نے مشرقی بلوچستان میں پھینکے، اور یہ ناول خلق بھی وہیں مشرقی بلوچستان میں ہوا.....رستر انی کے خوب صورت مرمریں کوہی دیواروں میں، ہث وانا روکٹار کے سرسبز درختوں میں، بیہو کے ڈھلوانی سبزہ زار میں، بیورغ وگزین کے ڈیروں میں، ماوند ومنجھرا کی وسعتوں میں۔مگر پھر اس کی سایہ فگن شاخیں سندھ کے بیٹ و بھٹ میں، سرور وقلندر کے بھنگ آگیں روضوں پہ، سخی سرور کے اُس پار میدانوں میں انسانوں پہ ظلم کی دہکتی شعاؤں سے بچاؤ بن گئیں۔الغرض پورا بلوچستان، مغربی وجنوبی پنجاب اور سندھ سب اس کی متبرک زد میں آئے۔اور اب تو مشرقِ وسطیٰ، یورپ، وسطی ایشیا، ایران، افغانستان اور افریقہ میں نہ صرف اُس کے اپنے ہم زبان اُس کی شاعری کا شہد چاٹتے ہیں بلکہ تراجم اور انٹرنیٹ اور فیس بک سگھڑ سفیر بن کر چار چودھار مست کے دلدادگان کی تعداد اور اُن کے باہمی ربط کی مضبوطی کا سامان کر رہے ہیں۔

مست نے بہت کچھ ان علاقوں سے لیا، بہت کچھ ان خطوں کو دیا۔فنِ عشق کی نازک اندامیوں سے لے کر شاعری کی باریکیوں تک، اور موسیقی کے ابجد سے لے کر فلسفہ کے اوج تک مست اس خطے اور اس عہد کا سب سے بڑا درآمد برآمد کنندہ بنا۔

ہمارے ہاں نیم پڑھے اور سست دماغ کو عملِ فکر سے کوسوں دور رکھے ہوئے ادیبوں دانش وروں پر فیوڈل ساکن ورجعتی سوچ دبیز تہیں ڈال چکی ہے۔اُن کا بدبخت وطیرہ رہا ہے کہ وہ محبت کو ''کامیاب'' یا ''ناکام'' قرار دینے کی خوردبین سجائے ہر وقت فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں۔ بھلے لوگو! لفظ ''مہر'' خود اس قدر مکمل، جامع اور حتمی ہے کہ اس کے ساتھ کامیابی ناکامی، کے پستہ قد اضافے تحقیر آمیز لگتے ہیں۔ہمیں تو ایک بات معلوم ہے: محبت انسان کو نجات دلاتی ہے، آزادی

عطا کرتی ہے، دوام واستقلال دیتی ہے۔ چنانچہ اسی محبت کے طفیل مست کو، اور سمو کو وہ مقام ملا جو بہت کم انسانوں کو ملتا ہے: Emancipation!!۔مگر، جس نے محبت جیسی، پر کی طرح ہلکی پھلکی اور نور کی طرح ملائم، نعمت کو کامیابی وناکامی کے ترازو میں رکھنا ہو وہ بے شک اپنے بے ہودہ کھیل کو جاری رکھے، محبت خود اُن سے نمٹ لے گی۔

اسی طرح کچھ لوگ محبت کو ایک اور کراہت بھرا نام دیتے ہیں: ''عشقِ مجازی''۔اور محض دامنِ مہر کے بدطنیت کیڑے مکوڑے ہی ایسا نہیں کرتے بلکہ میں نے آسمانِ شعر وادب تک کو اِس منحوس غلطی سے آلودہ دیکھا ہے۔ارے بھئی، عشق بھی بھلا مجازی ہوتا ہے، سچ بھی کبھی مجازی ہوتا ہے، حسن بھی کبھی مجازی ہوتا ہے؟.....دل کرتا ہے نا قابلِ تقسیم ''محبت'' کی مجازی گیری اور حقیقی پن دونوں کو اٹھا کر اِن کبیر وصغیر دانش وروں کی عقل کے منہ پر شڑاپ سے دے ماروں۔بھئی یا تو لفظ محبت، مہر، عشق استعمال ہی مت کرو، اور اگر کر لیا تو جان لو کہ یہ لفظ خود کافی ہے، کُل ہے، کامل ہے۔اِسے مجازی حقیقی کے چمچوں، بدرقوں، اور باڈی گارڈوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک تیسری کیٹیگری بھی ہے۔ وہ، جو مست کی روحانیت میں غرق ہو کر اُسے دنیاوی دکھوں مصیبتوں بیماریوں کا سدباب سمجھتے ہیں۔ہم اُن لوگوں میں سے ہیں جو ساری زندگی اُن دانش وروں کے خلاف رہے ہیں جو پیری فقیری میں، حاکمی رعیت گیری میں، یا مرشدی مریدی میں تعقل، غور وفکر اور نقد ونظر کے دروازے کھڑکیاں بند کر دیتے ہیں۔

مست پر لکھنے والا میں اولین شخص نہیں ہوں، آخری تو بالکل بھی نہیں۔مست کا تحریری تذکرہ سب سے پہلے ڈیمز نے اپنی کتاب ''پاپولر پوئٹری آف بلوچیز'' میں کیا تھا۔پھر، اور لوگوں نے بھی اس پہ کام کیا جن میں میر مٹھا خان مری، ذکیہ سردار خان، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور غوث بخش صابر قابلِ ذکر ہیں۔مگر بلوچی شاعروں کے اس سرتاج پر بنیادی اور وسیع کام تو محترم مٹھا خان مری کا ہے۔اُس نے مست پر دو کتابیں لکھیں، جامع، معتبر اور مکمل۔

میں بچپن میں راتوں کو اپنے والد سے الحان کے ساتھ مست کی شاعری سنا کرتا تھا۔ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ خوش الحانی کے ساتھ مست کی شاعری کی میری یادداشت کتنی بڑی نعمت

رہی۔اُس کے علاوہ مست پر کام کے اپنے پچیس تیس برس میں نے سمجھو میر مٹھا خان مری کی دانش کی سخی اطاق پہ ہی گزارے' سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے اپنے چچا بختیار خان سے مانگے ، کچھ توشہ محمد خان پیرداذانڑیں اور کریمو لانگھانڑیں سے لیا،ایک آدھ برس کا زادِراہ ماما محمد اکبر قلندرانڑیں سے مانگا اور بقیہ لوازمات عالمی کلاسیکی ادب اور ہم عصر دانش وروں سے حاصل کیے۔ مثلاً مولوی عبدالکریم ظہیری مرحوم نے یوں میری مدد کی:

''نیک تمناؤں کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر شاہ محمد کے متعین کردہ روشن راہ ساتھ روشن کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہ باغِ عدن دائمی گلستان جن کا بیج مست زمین کائنات میں بطور نرسری رکھ گئے جس کو ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اپنی محنت اَن تھک کوشش کے ساتھ ایک چمنِ لالہ زار باغ بہار اندر بہار میں وہ آبیاری کی کہ داستانِ عشقِ مست روحِ مست کی طرح ابدی ازلی لازوال ہوگئی۔ آیئے اس چمن میں ایک اور خوشبودار پودا لگا دیتا ہوں.....''(اس خوشبودار پودے یعنی مولانا کی مست پر تحریر کا ذکر ہم آگے کریں گے)۔اس طرح کے بے شمار خوشبودار پودے دوسرے ہم عصروں نے بھی اس چمن میں لگا دیے ہیں۔

اور بلا شبہ میرے اپنے دیوانہ پن کے تجربات بھی میری تحریر کا حصہ بنے۔ اس طرح میں نے مست کے اوپر اب تک کیے گئے کام میں منکسرانہ اضافے اور وسعت و گہرائی میں اپنا حصہ ڈالا۔

میں ان بیس پچیس برسوں میں مست پر لکھتے ہوئے ہر لمحہ تڑپا، جاگا ہوں، ہر لمحہ محظوظ ہوا ہوں۔ میں اس کتاب کے ہر ہر صفحہ کو لکھتے وقت ڈوبتا رہا ہوں۔ دل کا ڈوب جانا جانتے ہیں آپ؟۔آپ یقین جانیے کہ مجھے اپنی سخت جانی کا اس کتاب کی تکمیل پر ہی انداز ہوا۔ چار سو صفحے لکھنے میں، میں کم از کم چار سو بار مرنے کی حد تک مرا۔شاید سب لکھاریوں پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہوگی ،مگر سچی بات یہ ہے کہ مست پر کوئی ٹکڑا لکھنے سے چند دن پہلے اور اُس پر لکھ چکنے کے چند دن بعد تک ایک خاص کیفیت مجھ پر طاری رہتی رہی ہے۔اتنی پُر کیف کیفیت کہ سوچتا ہوں مجھ پہ تو یہ معمولی وقت تک رہی۔مست کا کیا حال ہوگا جو زندگی بھر اِس سکون آور بے چینی کا سرچشمہ رہا،اسی

کو جیتا رہا۔اضطراب میں اطمینان ،تشنگی میں آسودگی، بے قراری میں قرار.....ایک نشہ ایک خمار۔مست ایک ٹرانس ہے!!،مہر کا ٹرانس!!۔

ایک بات آپ کو بتاؤں۔ وہ جو ٹی وی پہ ریسلنگ یا جوڈو وغیرہ دکھا کر ایک نوٹس دیا جاتا ہے، ناں کہ:''گھر میں یہ پریکٹس نہ کریں''۔مطلب اپنے بھائی بہن کے ساتھ ٹی وی والا ریسلنگ یا جوڈو نہ دہرائیں ، اطراف میں کسی کی تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ آپ بھی یہ کتاب پڑھ کر اپنے محبوب یا محبوبہ پر اس کا اطلاق نہ کریں۔ آپ کی محبت کئی بار ٹوٹے گی، آپ کئی پارٹنرز سے محبت توڑ دیں گے۔مست اور سمو استثنائی جوڑی تھی۔اُن کے عشق کے معیار پہ نہ آپ اتر سکتے ہیں نہ آپ کا محبوب۔اس لیے یہ کتاب پڑھتے وقت بار بار کہیں موٹے الفاظ میں سامنے لکھ رکھیے:

''میں مست نہیں، میری محبوبہ سمو نہیں''۔

مگر آپ اُن کے نقشِ قدم پر ضرور چلیے وگرنہ آپ کو کسی نہ کسی کی طرف سے یہ لکھا ملے گا: " You dont deserve love "۔مگر اُن کی ہمسری کا سوچیے بھی مت کہ بڑی تباہی چاہیے اُس منزل تک رسائی کے لیے۔

پھر، میں اپنے قارئین کا قبائلی یا فیوڈل بھرم کیوں رکھوں؟۔کون ایسا شخص ہے جو مست کو پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو پُرنم ہونے سے کامیابی سے بچا پایا؟۔کون قاری ہے جو مست کو پڑھتے ہوئے دل کی ایک دھڑکن کھو نہ گیا ہو؟۔میں نے عام مری سے لے کر وڈے اور وڈیرے تک ،اور دانش ور سے لے کر سردار تک سب کو مست کا ''شکار'' پایا۔ میں نے مست کے تذکرے کے دس منٹ کے اندر اندر سخت دل شخص کو پگھلتے دیکھا، میں نے ہمہ وقت کمپوزڈ جنگ باز کو پسیجتے دیکھا۔ میں نے ذکرِ مست پہ ہر اُس شخص کی آنکھ میں ایک منور شفافیت دیکھی جس کے دل پہ ازل نے حتمی اور مستقل مہر نہ لگا دیے ہوں۔ نام نہیں بتاؤں گا مگر پوری زندگانی میں مجھے محض تین ہی ایسے بلوچ ملے جو مست سے متاثر نہ تھے۔اور یہ تینوں لوگ اُمی اَن پڑھ نہیں بہت تعلیم ''یافتہ'' اور لفاظی کی حد تک ''تنقیدی تجزیہ نگار'' تھے۔کلامِ مست وحشی کو اشرف بنانے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ بلوچ قبائلی شخص تعریف ہی تب کرتا ہے جب اس کے دل کی جڑوں کا ایک ایک فائبر ہل کر نہ رہ گیا ہو.....اور

کلامِ مست پڑھنے کے بعد تو میں نے ایک بھی قبائلی نہیں دیکھا جس نے ٹھنڈی سانس بھر کر ''جی ترا مست'' نہ کہا ہو۔

مجھے مست کے کلام کی ترتیب میں بہت مشکل پیش آئی۔ایک بہت ہی وسیع وعریض وطن میں مقبولِ عام اِس شاعر کے مصرعوں کا اِدھر اُدھر ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ میں نے تو مصرعوں ،اشعار اور کبھی کبھی تو پورے بند کے بند کو اپنی اصل جگہ کے بجائے کسی اور شیئر میں پیوست پایا۔مست کی شاعری کو دو صدیاں گزرنے کے بعد،آج صورت یہ ہے کہ لوگوں نے مشہور ضرب الامثال، عالمی ادب کے ٹکڑے،حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کے اشعار مست کی شاعری میں ڈال دیے ہیں۔جو کچھ بھی اچھا لگا مست کی جھولی میں ڈال دیا۔اس طرح مست کے شیئر میں تسلسل ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا تھا۔

صرف باریک بین چھان پھٹک ہی سے آپ اِن ''گھس بیٹھیے'' ،مگر معزز اشعار کو دور کر سکتے ہیں۔یہاں مست کا عہد، اُس زمانے کے مظاہر وحقائق اور مست کا اپنا ڈکشن آپ کو بہت مدد دیں گے۔اسی طرح مست کے عہد کے مری قبیلہ کے بارے میں جان کاری،اُس زمانے میں بلوچستان ،سندھ اور پنجاب کے ملحقہ علاقوں کی معاشی سماجی حالات سے واقفیت، اور مروج ادبی ثقافتی سطح سے شناسائی آپ کو مست کے کلام کو خالص کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔واضح رہے کہ توکلی کا اسلوب اپنے زمانے کے شاعروں میں سب زیادہ ''عالمانہ'' ہے اور اُس میں اپنے عہد کی بلوچی لسانی جغرافیائی سرحدوں سے پار کی، دانش اور الفاظ بھی موجود ہیں۔

مست بے شمار ایسی اصطلاحات اور الفاظ استعمال کرتا ہے جو بلوچی میں بعد میں مستعمل نہ رہے، یا زیادہ مستعمل نہ رہے۔اُن اصطلاحات کا پیچھا کرنا، اُن کے لسانی روابط وجغرافیہ تلاش کرنا اور اُن کے معنی ڈھونڈنا مجھے بہت ستاتا رہا۔

انسان بہت معصوم ہوتے ہیں۔کوئی ذرا سا پسند آیا اُسے جھٹ سے دیوتا قرار دیا اور اُس کے نام، مقام اور کلام پہ نذر و نیاز تیار کر لیے، اُس کی پسند و ناپسند کو باقاعدہ حلال وحرام گردانا اور پرستش کا باقاعدہ ایک ڈھانچہ تیار کر لیا۔ایک فلسفی شاعر کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دِہ چیز کیا

ہو سکتی ہے۔ہماری سادگی اور عقیدت کی حد تک پیار سے اُس کی تعلیمات پسِ پشت جاتی ہیں نا!۔

مست اور فکرِ مست کے ساتھ میری چاکری بھی عجیب ہے۔فلک نے مجھے مست کے دربار جانے سے بہت پہلے سمو کی درگاہ کی بھرپور زیارتیں کروائیں۔ میں جب کاہان میں میڈیکل آفیسر تھا تو اپنے گاؤں ماوند سے کاہان آتے جاتے سمو کی آرام گاہ، راستے میں پڑتی تھی۔میلوں تک پھیلی بے کراں خاموشی میں آپ سمو کی قبر کے ساتھ بیٹھ کر مراقبہ میں مست وسمو کی محبت کے اسباب و علل کی ناممکن دنیا میں داخل ہو پاتے ہیں اور زندوزیست کے فلسفہ میں بھی دور تک جاتے ہیں۔سمو تفکر کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے اُس فکرگاہ پہ سرخم کرنے کے بے شمار بابرکت مواقع ملے۔

بہت عرصہ بعد کہیں جا کر مست کے فلسفے (مقبرے) کی قدم بوسی نصیب ہوئی۔ یہ تعداد ابھی تک صرف ایک رہی ہے۔یوں ایک لحاظ سے مست تک میری رسائی سمو کے ذریعے ہوئی۔اور یہ اچھا ہوا، یہی اچھا ہوا۔مست تک رسائی کا مستحسن ترین راستہ بھی یہی ہے۔ نیا راہی ضرور یہ راستہ اختیار کرے۔ ورنہ مست کا مقبرہ آپ کو بزرگی برگزیدگی ،عقیدہ وعقیدت اور کرامت وتوہمات کی دنیا میں لے جائے گا۔اور لگے گا جیسے آپ کوئی دنیاوی غرض وطلب کے لیے ایک ولی کے دربار آ گئے ہیں۔فکرِ مست کنکریٹ، اگربتی اور جالیوں جھالروں میں پردہ کناں ہوگی۔

میں کئی برس سے مست پر کام کر رہا ہوں۔میں نے کئی لوگوں سے انٹرویو کیے، بہت سی محفلوں میں مست کا ذکر چھیڑ کر ان کی باتیں نوٹ کرتا رہا۔میں اس کتاب کو اضافوں ترمیموں کے ساتھ اب تک تین بار شائع کر چکا ہوں۔لوگ دلچسپ ہیں۔ جب کچھ سال بعد پھر یہی لوگ ملتے ہیں تو مست کی کتاب کا پوچھ کر فوراً اپنا پسندیدہ سوال پوچھتے ہیں: ''اتنے عرصے سے لگے ہوئے ہو، مست سے کوئی یاری، کوئی ملاقات، کوئی خواب، کوئی نزدیکی، کوئی کرامت ملی''؟۔.....قبائل بہت پاک ہوتے ہیں۔

گو کہ آج تک میری جتنی بھی کتابیں چھپی ہیں اُن میں سے ہر ایک کے مکمل ہونے پر کئی کئی سال لگے ہیں۔مگر مست پہ اس کتاب نے تو حد کر دی۔وقت نے مجھے جلد بازی سے چلنے ہی نہ دیا۔چار چار چھ چھ ماہ بعد کہیں ایک قسط رسالے میں چھپنے کے لیے تیار ہو جاتی۔قارئین اور دوستوں

نے بہت اصرار کیا اور میں یہ کتاب جلد تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ بھی کرتا رہا ہوں مگر ہر بار بریکیں لگتی رہیں۔ بالآخر اسے مکمل کرنے کی میری آرزو کی تکمیل ہوگئی۔ اب مست کی یہ کتاب قیامت میں میرے دائیں ہاتھ میں ہوگی۔ (یہ تو میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اِس جہاں میں اس کتاب نے مجھے کتنی عزت بخشی!)۔

اس کتاب کے ہر بار چھپنے میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ گرامر میں تکلیف دہ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ''آپ، اُن، آیئے گا، جایئے گا'' جیسے غیر بلوچی القابات ہٹا کر عام مروج ''تم، وہ، اُس، آؤ، جاؤ'' جیسے بے تکلف بلوچی صیغے استعمال کیے گئے۔ دوسری تکلیف دِہ تبدیلی یہ کی کہ جن بزرگوں نے مست کے بارے میں مجھے انٹرویو دیے تھے، اُن میں کئی لوگ اب اِس دنیا میں نہ رہے۔ اُن کے لیے حال کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا پڑا۔

اس نئے ایڈیشن کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آٹھ دس سال قبل والے ایڈیشن کا مجھے بہت فیڈ بیک آتا رہا۔ میں نے بے شمار نئے واقعات کے ساتھ ساتھ مست کے بہت سے نئے الفاظ، مصرعے اور اشعار بھی حاصل کر لیے۔ یوں مست کی ایک فصیح تر تصویر قائم ہوئی۔ جن جن جگہوں پہ مجھے شکوک وشبہات تھے اُن کی توثیق، تردید یا درستگی ہوگئی۔ اُن کو حوالہ جات کے ساتھ درج کرنے یا نکال دینے میں جرأت بڑھی۔

بالخصوص ایسی روایات کو، دوبارہ تصدیق وتردید کے پراسیس میں ڈالا جن کی بنیادیں محض اوہام پرستی پر تھیں، قبائلی شاؤنزم پر تھیں یا بلاوجہ کسی دوسرے بڑے دانش ور سے نتھی کرنے یا موازنہ ومشابہت دینے کی نیت پر تھیں۔ بہت سے احباب نے میری کتاب کو نظر انداز ہی اس لیے کیا کہ وہاں اُن کے دادا' پردادا کا بہت ذکر نہیں ہے۔ مگر جب کہا گیا کہ '' کچھ بھیج دو'' تو پھر وہی قبرستان والی خاموشی۔ چنانچہ خود ہی کوشش کر کے ایسی کمی بیشیوں کا ازالہ کیا۔

ہمارا مست اپنے زمان و مکان کا فلاسفر تھا۔ اس کی فکری اٹھان اپنے تجربات سے ہوئی۔ مست کے فکر کا ناپ تول کرنا فضول ترین کام ہے۔ اور دوسروں سے موازنہ و مقابلہ بازی ایک قبیح عمل ہے۔ میں اُس سے دور بھاگا ہوں۔

میں نے اس کے فکر کو عام قبائلیوں کے سینے کی یادداشت سے حاصل کیا اور انھی کو واپس کر رہا ہوں۔

اس نئے ایڈیشن میں بہت سے پیراگراف نئی صورت میں جلوہ افروز ہو کر ایک باب سے کسی دوسرے باب میں شفٹ کیے گئے تاکہ بات مزید واضح ہو۔ حتیٰ کہ پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کو بھی جان کی امان نہ ملی۔

پھر میرا جگری دوست ہوا کرتا تھا، مہران بلوچ۔ اس نے میرے اردو ترجمے کو لے کر مست کی شاعری کے ایک بڑے حصے کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔ میں جب اُس کے انگریزی ترجمے پر نظر ثانی کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ خود میرے اردو ترجمے میں کچھ غلطیاں موجود تھیں۔ انہیں درست کر دیا اور اب اس ایڈیشن میں پیش کر رہا ہوں۔

عابد میر نے یہ ساری کتاب دیکھی۔ مذکر مونث ڈھونڈ ڈھونڈ کے ٹھیک کیے۔ اس نے کاما فل سٹاپ ہی درست نہ کیے بلکہ اگر کوئی ڈسپلن شکن آوارہ فقرہ دیکھا تو بڑی بے دردی سے اس نقصان دِہ جڑی بوٹی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اور کبھی کبھی تو پیراگراف کی روانی میں بہک کر خود اپنا بھی ایک آدھ فقرہ امانتاً ڈال دیا۔

میرا دوست سلیم شہباز برسوں سے میرے ساتھ ٹائپسٹ کا کام کرتا ہے۔ مست کی یہ کتاب بھی اُسی نے ٹائپ کر دی۔ کامریڈ کلیم اور میری دوستی ربع صدی پر محیط ہے۔ وہ ایسے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے کہ اُن کا نوٹس تو نہیں لیا جاتا مگر اُن کے کیے بغیر میری دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی نہ چھپ سکتی تھی۔

ایک انتہا درجے کی تفہیم مجھے اپنے گھر میں حاصل رہی ہے۔ بہت کم لکھنے والوں کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے جنھیں اپنے گھر میں سوائے کھانا کھانے کے کسی کام کے لیے مجبور نہ ہونا پڑے۔ ماما عبداللہ جان متحرک وصحت مند ہوتا تو مجھے اندازہ ہے کہ وہ کتنا بڑا دیباچہ لکھ دیتا اور کتاب کے اندر موجود ہر لفظ کو تولتا، اُس پہ بولتا اور ترامیم واضافوں کی تجاویز سے حوصلہ افزائی کرتا۔ مگر اب کے ڈاکٹر عطاءاللہ بزنجو اور محترمہ نوشین قمبرانڑیں نے مست سے میری وابستگی کو لاکھ سے ضرب دے

کر ہمہ وقت واہ واہ جیسی حوصلہ افزائیوں سے مجھے بہت حد تک مست کے ٹرانس میں رکھ کر یہ کتاب مکمل کروادی۔

ان سب کا احسان مند ہوں.....

اور زندگانی کا بھی جس نے اس کتاب کو مکمل کرنے کی مہلت بخش دی۔ میں نے بھی اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ کیا۔

''مست توکلی پر تحقیق، در پردہ گوشوں پر پروفیسر شاہ محمد انتہائی جستجو اور محبت کامل کے جذبہ صادق کے ساتھ خدمت مرشد کامل کا پورا بلکہ مکمل حق ادا کر کے خود بھی زندہ جاوید ہو کر امر ہو گئے''۔

میں اپنے استاد مرحوم عبدالکریم ظہیری کے مندرجہ بالا توصیفی اور حوصلہ افزائی کے فقروں کے آخر میں دیے گئے اس فقرے کو بہت اہمیت دیتا ہوں:

''خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہے گی''۔

شاہ محمد مری

ماوند

6 جولائی، 2015ء

سمو.....محبوبہ بننے سے پہلے

سمو، مست توکلی کی محبوبہ تھی۔ مست کے عشق اور شاعری نے سمو کو ''چار چودہار'' مشہور کردیا۔ مگر یہ نام ویسے بھی بلوچوں میں ایک مقبولِ عام نام ہے۔ میں اس نام کا لفظی مطلب ڈھونڈنے نکلا۔ سمو کا مطلب ظہور شاہ ہاشمی نے اپنی ڈکشنری میں ''ملوک، شرف دار، خان وادہ، نازک، اچھا'' لکھا ہے۔ غنی پرواز کے خیال میں سمو کا مطلب ہے: جور، یعنی زہر۔ نیز سمل، سایہ دار درختوں پر لگی پھلی کو بھی کہتے ہیں جو کہ سرسبزی، خوشحالی اور سیر سالی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر جن عام بلوچوں سے میں نے اس نام کا مطلب پوچھا، وہ ایک لمحے کو تو گہری سوچ میں پڑ کر ارشمیدس بن جاتے، اور اس کے بعد بڑی ہزیمت کے احساس کے ساتھ اپنی لاعلمی مان لیتے۔ مگر اس کے باوجود ہزاروں بچیوں کے نام ''سمّی'' ہیں۔

مست نے اپنی شاعری میں اپنی سمو کو سمی، سمو، اور سمل جیسے پیار کے ناموں سے بھی پکارا ہے۔ بلوچ، توکلی کی سمو کے احترام بھرے نام کے آخر میں یا تو ''مائی'' کا لفظ لگا کر اُسے تکریم دیتے ہیں، یا پھر سمو، اِس انداز میں کہتے ہیں کہ خود اس لفظ کے تلفظ سے احترام، ادب اور عقیدت کے جذبات ٹپکتے محسوس ہوتے ہیں۔

سمّو کا سن پیدائش اور سنِ وفات نامعلوم ہیں۔ بلوچوں میں ویسے ہی سالگرہ اور ہیپی برتھ ڈے نہیں ہوتا، نہ مرد کا، نہ عورت کا۔ کوئی جشن کوئی میلہ اس حوالے سے موجود نہیں رہا۔ (پنجابیوں، سندھیوں، پشتونوں میں بھی نہیں ہوتا)۔ لہٰذا نہ سمو کی تاریخ پیدائش معلوم ہے اور نہ ہی

توکلی مست کی۔ (اور یہ کتنی اچھی بات ہے۔ عرس، دھمال، چرس، وزیر، گورنر، صدر، اور اگربتی سے خدا نے اِن کی جان چھڑائی)۔

سمّو، بلوچوں کے مری قبیلے میں کلوانڑیں شاخ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ قبیلہ آبادی کے لحاظ سے مری کا سب سے بڑا قبیلہ ہے اور اسی قبیلے کے تصرف میں مری کے علاقے کا سب سے بڑا رقبہ بھی ہے۔ اونچے قد والے، گورے چٹے اور بڑی بڑی آنکھوں والے کلوانڑیں۔ یہ لوگ مری قبیلے میں غالباً سب سے خوب صورت لوگ ہیں۔ یہ لوگ مویشی پالتے ہیں اور زیادہ تر دریائے بیجی کے کناروں میں کاشت کاری کرتے ہیں۔ دیگر قبائل کی طرح مری قبیلے کا یہ ذیلی فرقہ بھی بہت ڈسپلن والا ہے۔

سمو کے والد کا نام ''بشکیا'' تھا (بخشا ہوا، نجات یافتہ)۔ سمو کے ایک بھائی کا نام بھی معلوم ہوسکا ہے، ''دل مراد''۔ بس، ہمارا علم یہیں تک۔ ان دو کے علاوہ سمو کے دیگر عزیزوں رشتہ داروں کے بارے میں ہم کچھ بھی معلوم نہ کرسکے۔

یہ کلوانڑیں خاتون، مری کے ایک اور ذیلی فرقے ''پروئی'' میں دلاّزئی سجوانڑیں طائفے میں بیورغ نامی ایک شخص کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ محبت کی اس دیوی کا ''لب'' کیا تھا۔ اور نہ ہی یہ معلوم ہوسکا ہے کہ اس کے لب کی رقم بیورغ نے نقد ادا کی تھی یا پھر وہ مال مویشی کے عوض، پرائے گھر روانہ کی گئی تھی۔ مست کی شاعری میں شاید لب کا تصور موجود نہیں ہے۔ تو کیا مری قبیلے میں دوسو برس قبل ''لب'' موجود نہیں تھا؟۔ کیا یہ قبیح رواج بعد میں آیا؟۔

پروئی کے بارے میں یہ بتادوں کہ تعداد کے اعتبار سے یہ کوئی بہت بڑی شاخ نہیں ہے۔ اپنے دیگر ہم قبیلہ مریوں کی طرح یہ لوگ بھی بھیڑ پال معیشت سے وابستہ ہیں اور خشک آبہ کی کاشت کاری بھی کرتے ہیں۔ ان کا علاقہ ماوند سے 25-30 میل مشرق کی جانب ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس قبیلے میں خواہ جتنا مشہور و معروف انسان پیدا ہو، سمو جتنا بڑا نہیں ہوسکتا؟ (پورے مری قبیلے، حتیٰ کہ پوری بلوچ قوم میں بھی سمو کی شہرت و احترام کی ہمسری کرنے والی کوئی عورت نہیں ہے)۔ اسی لیے ازل تک پروئی، محترمہ سمو ہی کی وجہ سے جانا جاتا رہے گا۔ اور پروئی ہی کیوں؟۔

سارا مری قبیلہ اسی ہستی کی وجہ سے پہچانے جانے کے قابل ہوا۔ میں، میرا دادا شادیھان، میرے بزرگ بلوچان، میرے محترم بہار خان، عمر خان، میرا ماوند، میرا تدڑی، رستزانی، میرا دودا، میرا گزین،.....میرا نصیر خان نوری.....سب نام ومظاہر سمو کے حوالے ہی تو ہیں۔

واضح رہے کہ توکلی کو، مستیں توکلی بنانے والی سمو، کے اپنے بارے میں ہماری تقریباً ساری معلومات حبیبِ سمو، یعنی مست ہی کے توسط سے ہیں۔ یوں سمجھو، سمو، مست کا عکسِ ہنر ہے۔ ایک اور بات پہ بھی توجہ رہے کہ جس وقت مست کی سمو سے جان پہچان ہوئی اُس وقت سمو اپنے والدین کے گھر میں کوئی اَن بیاہی دوشیزہ نہ تھی۔ وہ تو اُس وقت ایک شادی شدہ، گھر بار والی خاتون تھی۔ روایتیں سمو اور بیورغ کا ایک بیٹا بھی بتاتی ہیں جو لڑکپن میں ہی مر گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی دو بیٹیاں سندھ میں محنت کش مریوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ مگر جب خود سمو کے بارے میں معلومات نہیں ہیں تو اُس کی اولاد وغیرہ کے بارے میں کیا معلومات ہوں گی؟۔

سمؤ اُنیسویں صدی کی بلوچ عورت تھی۔ وہ کیا کرتی تھی، کس طرح زندگی گزارتی تھی.....بھئی جیسی آج کی بلوچ عورت ہے۔ بلوچ عورت تو دو صدیوں بعد بھی اپنی اسی زندگانی میں جی رہی ہے۔ لوگو، سمو اب تک چرواہا ہی ہے۔ جی ہاں، مرشد سمو کو دو سو برس گزر گئے مگر اب بھی اُس کی رعیت کا بڑا حصہ مال مویشی چراتی ہے۔ انہیں پینے کا صاف پانی گھر میں نصیب نہیں ہے اور وہ اب بھی دور دراز فاصلوں سے گندہ اور کیڑوں اور جراثیم آلود پانی مشکیزوں، گھڑوں، بالٹیوں میں سر پر رکھ کر ڈھو کر لاتی ہیں۔ آج بھی ''سمو کی قوم'' کی اکثریت پاپوش سے محروم ہے اور ننگے پیر بھیڑ بکریوں کے پیچھے ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔ سیاہی سیاہ کاری، لب و فروخت، غیرت و پابندی کی اسیر، سمو کی یہ رعایا کسی ایسے نجات دہندہ مست کی منتظر ہے جو اپنی بڑی اور منظّم عوامی مدد سے مساوات اور عدل پہ مبنی معاشرہ قائم کرے۔ سمو کی رعیت کے گلے میں اب بھی کوئی ''برگڑی'' نہیں ہے۔ اُس کی ناک میں سونے کی ''پُکڑی'' اب بھی نہیں ہے۔ اُس کے سر پہ ''چنڑی'' اور پاؤں میں ''جتڑی'' نہیں ہے۔ یہ سب علامتی خواہشیں مست اور اس کے پیروکاروں کے دل میں ہیں۔ یہ سمو کی رعیت کو آزادی دلانے والی تحریک کا ابھی محض منشور ہیں۔

مست توکلی کی محبت میں بندھ کر سمو کا مقام ایک عام عورت کا نہ رہا۔ توکلی بھی پھر عام توکلی نہ رہا۔ وہ ''سمو بیلی'' بن گیا۔ ابتدائی دس بارہ برسوں کے لڑکپن کے جوانی میں ڈھلنے کے بعد اُن دونوں کی آئندہ زندگیاں، انفرادی زندگی کے بجائے اُن کی مشترک داستان بن گئیں۔ اس لیے ہم اگلے ابواب میں اس باہم ضم شدہ ''واحد'' زندگی کو بیان کرتے رہیں گے۔

TAUKALI

انیسویں صدی کے سارے قبائلیوں کی طرح توکلی بھی' خانہ بدوش خیمہ زن گھرانے کا فرزند تھا۔ اس کے والد کا نام ''لعلہان'' تھا۔ بلوچ ''لعل'' کو ''لال'' کہتا ہے۔ ع کی عربی گیری صرف ملاّ کے ہاں ہوگی۔ اور وہ بھی ، یوں ادا کرنے کے بعد شرما جاتا ہے۔ اب زمانے نے '' سرخ'' کے رنگ دینے والے ہمارے ہیرے موتی ''لعل'' کے عین کو پیچھے کر دیا اور الف لگا کر '' لال'' کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم جتنا بھی تلفظ ''لال'' والا ادا کریں، اصل میں بلوچ موتی والا ''لعل'' ہی بول رہا ہوتا ہے۔

ہم (بالخصوص ہمارے مغربی بلوچستان کے بلوچ) حتی الوسع ''خ'' کا بھی بیڑہ غرق کرتے ہیں اور اُس کی جگہ ''ہ'' استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہ ہم ''خدا'' کو ''ھدا'' شادی خان کو شاذیہاں، ''خر'' کو ''ہر'' کہتے ہیں۔ ہبر، ہیمہ، ہبر.....سب میں ''خ'' کو ملک بدر کر کے ''ہ'' سے بدل دیا گیا ہے۔ چنانچہ ''خان''، ''ہان'' ہوگیا۔ یوں لعل خان، لال ہان بن گیا۔

توکلی، بلوچ قوم میں مری تھا، مری میں لوہارانڑیں تھا، لوہارانڑیں میں شیرانڑیں، شیرانڑیں میں درکانڑیں اور درکانڑیں میں بیڑازئی (1)۔

لالہان کیا کام کرتا تھا، وہ کیسا شخص تھا اور اس کے کتنے بہن بھائی تھے، تاریخ کو کچھ معلوم نہیں۔ تاریخ ویسے بھی بہت جاہل شعبہ ہے۔ ہارس ٹریڈنگ کرتا شعبہ۔ طاقت ور کے علاوہ کسی کی تفصیل اس کے پاس موجود ہی نہیں۔ بادشاہ، شہزادی، راجا، سردار، دیو، اور پری کے علاوہ اُس

کے پاس نہ موضوع ہوتے ہیں اور نہ مضمون۔

چوں کہ کاہان کے مضافات کا یہ علاقہ بارانی کھیتی باڑی کا تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ لالہان کاشت کاری سے بھی وابستہ رہا ہو۔ مگر مست کی اپنی شاعری میں کاشتکاری سے وابستگی کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ ہاں مویشی بانی تو پکی بات ہے۔ گو کہ اس کی اپنی شاعری یا دوسری بلوچ روایت یا شاعری میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ مویشی اُس کے اپنے تھے یا وہ کسی کا چرواہا تھا۔۔۔۔ مگر یہ بات حتمی ہے کہ وہ لائیوسٹاک سے متعلق تھا۔ ہمارے ہاں یادداشت کا یہ عالم ہے کہ جب میں نے شیرانڑیوں ہی سے مست کے والد کا نام پوچھا تو لالہان کا نام تک معلوم کرنے میں مجھے بہت عرصہ لگا۔ شاید اس شخص کا نام لال خان ہی نہ ہو پاندھی ہو؟۔ (مگر پاندھی والی روایت بہت کمزور ہے)۔

توکلی کے سنِ ولادت کا تو بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ موسم بہار والی بات کے بھی شواہد شاید ملتے ہوں مگر جناب انعام الحق کوثر کے اس دعوے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شام کے وقت پیدا ہوا تھا (2)۔

جب ہمیں لالہان کی سوانح حیات، اس کے پیشے اور تاریخ وفات کا علم نہیں تو توکلی کی والدہ محترمہ کے بارے میں بھی ظاہر ہے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ ویسے بھی ایک مردانہ سماج میں عورت کیا، اس کا نام کیا اور اس کی سوانح حیات کیا؟۔ مست کے اپنے کلام میں بھی اس کی والدہ ماجدہ کے بارے میں کوئی شعر، کوئی مصرع اور کوئی حوالہ نہ مل سکا۔ البتہ مری کے کچھ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس کی مہربان ماں اس کی کم سنی ہی میں فوت ہوگئی تھی۔ لالہان کی موت کو البتہ مست کی 14 سالہ بلوغت والی عمر میں بتایا جاتا ہے۔ (شعری ثبوت اُس کا بھی موجود نہیں ہے)۔

کسی بھی سماج کے مست توکلی' اُس سماج کے نئے جنم کا سبب بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں پرانی اچھی اقدار کے تو ترجمان ہوتے ہی ہیں، مگر بہ یک وقت بے شمار نئی راہیں بھی بناتے ہیں لوگوں کے لیے۔ نئے خواب، نئی آدرشیں اور نئی حکمت لے کر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دور کی فرسودہ اقدار اور مقتدروں سے زبردست بغاوت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ نئے انسان وضع کر کے نیا

سماج تعمیر کرنے کا کام کرتے ہیں۔

مست کی ولادت اور وفات کے سال تو محققین نے تقریباً تقریباً طے کر دیے ہیں۔لیکن اپنے قبائلی معاشرے کو بات سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔وہ اعتبار بہت کم کرتے ہیں۔(بلوچ تفصیلات بہت طلب کرتا ہے۔شک بھرے سوالات کرتا ہے۔کرید کرید کر، کھرچ کھرچ کر، بے شمار موڑ کاٹ کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے)۔اُس پہ غضب یہ کہ ہر قبائلی معاشرے کی طرح بلوچ کے ہاں بھی سال کو ہندسوں میں لکھنے کا رواج نہیں ہے۔وہاں قحط کے برس، سیلاب کے برس، زلزلے کے برس، انگریز جنگ کے برس یا فلاں قبائلی لڑائی کے برس، زمان کے بہت مقبول سنگ ہائے میل ہوتے ہیں۔یا پھر کسی سردار اور وڈیرہ کے عہد سے دیگر حالات و واقعات کا تعین کیا جاتا ہے۔میں خود مست کے عہد کا تعین کرنے میں کس طرح چکر کاٹ کر پہنچا، اس کا خاکہ آپ بھی دیکھیے۔میں نے اپنے قبیلے کے بزرگوں سے کرید کرید کر مست کا عہد معلوم کیا تو مجھے اپنے، اور سردار کے خاندان سے ہوتے ہوئے مست تک پہنچنا نصیب ہوا۔آپ کو بھی سمجھاتا ہوں۔

میرے اپنے زمانے میں مری کا سردار، خیر بخش دوم تھا جس کی تاریخ پیدائش 28 فروری 1929 تھی۔میرے والد حاجی محمد مراد کے زمانے میں مری کا سردار خیر بخش دوم کا والد مہراللہ خان دوم تھا جس کی وفات 1933 میں ہے۔میرے دادا، وزیر دوم کے زمانے میں ہمارا سردار، خیر بخش اول تھا۔میرے پردادا شادیھان دوم کے زمانے جب سردار مہراللہ اول تھا، تو اُس وقت مست توکلی موجود تھا۔شادیھان دوم کے والد وزیر اول کے زمانے میں سردار تھا دوداخان، اور مست توکلی موجود تھا۔وزیر اول کے والد شادیھان اول کے زمانے میں سردار تھا گزین سوم (وفات 1876)۔اس وقت بھی مست موجود تھا۔یوں حساب کتاب کرتے ہوئے، اور میر مٹھا خان کے تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے ہم مست توکلی کی پیدائش کو 1825 کا برس تسلیم کرتے ہیں(3)۔

اُس کی پیدائش موجودہ کاہان سے شمال مغرب کی طرف دو تین میل کے فاصلے پر ''ماں ژِک بند'' نامی علاقے میں ہوئی۔بہت سے لکھاریوں کی یہ بات درست نہیں کہ مانژک بند کسی گاؤں

کا نام تھا۔وہاں تو آج، یعنی مست کی ولادت سے دو سو برس بعد بھی کوئی گاؤں نہ بن سکا۔یہ تو بس اُس علاقے کا نام ہے۔ماں ژِک ایک شخص کا نام تھا۔اُسی کی نسبت سے اس علاقے کا نام پڑ گیا مانژک بند۔یہ علاقہ بقیہ بلوچستان ہی طرح بارشوں کے بعد بھیڑ بکریوں کے لیے زبردست چراگاہ بن جاتا ہے۔

مست کا نام توکلی (Taukali) تھا۔یہ ایک عام اور مقبول بلوچی نام ہے جس کے معنی ہیں: توکل کرنے والا، ایڈونچر کرنے والا، پہل کرنے والا، چست.....توکلی کے نام کے صحیح تلفظ اور پس منظر پہ دوستوں کو متوجہ کرنا بہت ضروری ہے۔اس سلسلے میں ہمارا مخاطب ہر قاری ہے۔خواہ وہ دانش ور ہو، سرکاری و غیر سرکاری ادبی اداروں سے منسلک ہو، بلوچ ہو، غیر بلوچ ہو، یا ''مستالوجی'' کا طالب علم ہو۔2005 میں حکومت پاکستان کے سب سے بڑے ادارے ''اکیڈمی آف لیٹرز'' نے مست توکلی کے نام سے ادبی ایوارڈ کا اعلان کیا تو باقاعدہ آفیشل طور پر اُسے ''مست توکلّی'' (MAST TAWAKKALI) پکار پکار کر یہ ایوارڈ دیا گیا۔جب دوستوں سے احتجاج کیا تو چیئرمین افتخار عارف نے بتایا کہ'' یہ سرکاری نام ہے جو کہ ہمیں بلوچ دانش وروں اور ادیبوں ہی کی طرف سے موصول ہوا تھا۔''

اب ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ماسوائے مشرقی بلوچستان کے بقیہ سارے بلوچ عربی، فارسی اور اردو ہی کی طرح لفظ ''توکل'' کو ''توکّل'' ہی تلفظ کرتے ہیں۔مگر ہمارے ہاں کوہِ سلیمان میں توکّل کو توکل (TAOKAL) بولا پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔اب آپ خود غور فرمائیے، چینیوں کے ''عوامی جمہوریہ چین'' اور بورژوا پریس کے نام والے ''چین'' میں کتنا بڑا فرق ہے۔کمیونسٹوں کے ''سوویت یونین'' اور نوائے وقت کے ''روس'' میں کتنا بڑا فرق ہے۔اصطلاحات میں زبرزیر کی تبدیلی سے بہت بڑی چالاکی کی جاتی ہے۔توکلی بلوچ پس منظر رکھتا ہے، عام آدمی والا، سیدھے سادھے سماج والا، نیک پرامن خطے والا۔اسے توکّل بنا کر ہم ''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر'' کے فلسفے والوں کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہوتے ہیں کہ اسے مزید بگاڑ کر ''طوق علی'' بنا ڈالنا تو بہت آسان ہو جاتا ہے۔

ہمارے ضیائی دانش وروں کے بس میں ہوتا تو وہ اُسے کسی مسجد کا پیش امام بناڈالتے، یا جہادی گروپوں کو منظّم کرنے والے کسی مدرسے کا مہتمم۔ ارے بابا، وہ نہ ''طوق علی'' تھا اور نہ ہی ''توکلّی'' تھا۔ وہ سیدھا سادہ ''توکلی'' تھا (پتہ نہیں بلوچی زبان کو اردو اتے اردو اتے ہم اس کی کتنی ٹانگیں اور کتنے کان کاٹ ڈالیں گے)۔

واضح رہے کہ فارسی والے ''طوق'' کو مست کے لہجے والی بلوچی میں طوق نہیں کہتے'' توخ'' کہتے ہیں۔ اور مشرقی بلوچی شاعری میں تو بالخصوص ''ق'' کی بہ نسبت ''خ'' بہت مطلوب و مقبول حرف ہوتا ہے۔ اس طرح شاعری میں ''توخ علی'' آسانی سے استعمال ہوسکتا تھا۔ مگر ایسا اُس کے پورے کلام میں نہیں ہے۔ وہ تو ''توکلی'' ہے ''و'' پر کوئی زبر نہیں، ''ک'' پر کوئی شَد نہیں ہے اور ''لی'' کے ساتھ کوئی ''ع'' نہیں ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ ماضی بعید کی بلوچ تاریخ سے لے کر عرب کے وقت تک اور اس وقت سے لے کر آج کے ''ڈسکو'' زمانے تک مردوں نے کبھی توخ نہیں پہنا۔ یار لوگوں نے مارشل لا والا مائنڈ سیٹ اپناتے اپناتے اپنی تاریخ و کلچر کا ہی بلیدان کر ڈالا!!۔

بات صرف یہیں تک محدود نہیں ہے۔ لسانی طور پر توکل اور توکّل کے تلفظ میں بہت فرق ہے۔ صوتی آہنگ دونوں کا جدا، موسیقیت الگ۔ یہ لفظ بلوچی شاعری میں استعمال ہوا ہے، اور بار بار استعمال ہوا ہے۔ یہ مست کی شاعری میں تو بالخصوص استعمال ہوا ہے۔ اور مست کی شاعری جو موسیقیت کی شاعری ہے، جام کی شاعری موسیقیت کی شاعری ہے، بلوچی شاعری موسیقیت کی شاعری ہے۔ اس گائی جانے والی شاعری میں توکل کو عربی اردو فارسی کی تحریری زبان والے توکّل میں بدل دیا جائے تو پوری موسیقیت تتر بتر ہو جائے گی، پورا سُر زخمی زخمی ہو جائے گا، پوری لَے کرچی کرچی ہو جائے گی، پورا آہنگ مچھلی منڈی ہو جائے گا۔..... اور شعر کے وزن کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اس لیے مست توکلی کو بے سُرا مت کیجیے، زندگی کا حسن بے سرا ہو جائے گا۔ آپ کی شخصی زندگی کا بھی اور جمعی سماجی زندگی کا بھی۔

لفظ ''مست'' نام نہیں ہے بلکہ اُس کے نام کے ساتھ نتھی یہ لفظ، لقب ہے۔ یہ اُس کے

نام کا حصہ نہ تھا، بعد میں نام کے ساتھ شامل ہوا۔ یہ، لفظ ''مستی'' کی وجہ سے نہیں پڑا بلکہ ''مستالائی'' کی وجہ سے پڑا جو کہ نیم دیوانگی، لاابالی، بے پرواہی، لاتعلقی، درویشی، اور لو لگانے کی کیفیت کا اظہار ہے۔ انگریزی میں اس مستالائی کا ممکنہ موزوں نعم البدل لفظ Lunatic ہے۔ مست اپنی اس کیفیت کو خود بھی بیان کرتا ہے:

پـــلـــوے مـــاخ و پـــلـــوے گُـــدّا
هـر دوں مـڑد جـوانیـا نـه اوں سدّهـا

ترجمہ:

ایک طرف سے میں آ رہا ہوں اور دوسری طرف سے گدّا
ہم دونوں کی ذہنی حالت کچھ اچھی نہیں ہے

اِس طرح ہوتے ہوتے ''مست'' کا لفظ اس کے اصل نام کے ساتھ کچھ اس طرح جڑتا گیا کہ یہ بالآخر اس کی محترم شخصیت کا مکرم حصہ بنا۔ حصہ کیا ہوا، کبھی کبھی تو یہ توکلی کو ہی replace کر گیا۔ اُسے صرف توکلی کہنا بے حرمتی میں شمار ہونے لگا۔ حضرت، جناب اور صاحب جیسے الفاظ بلوچوں میں ہیں نہیں۔ لہٰذا لفظ ''مستیں'' کا سابقہ ہی اس کی توقیر بن گیا اور وہ ''مستیں توکلی'' بن گیا..... اور خواہ میں اور میرا قاری رہیں، نہ رہیں ''مستیں توکلی'' کا نام رہتی دنیا تک رہے گا۔

''مستیں'' کا لفظ ایک اور طرح سے بھی امتیازی پہچان بن گیا۔ وہ یوں کہ بلوچوں میں تو ''توکلی'' نام کے اور بھی بہت لوگ ہیں۔ تو فرق کس طرح کیا جائے؟ مستیں توکلی، دراڑیں توکلی، کنگرانڑیں توکلی.....

البتہ شاعری کی مجبوریوں سے یا اس کا تذکرہ روانی سے کرتے کرتے کبھی کبھی ''مستیں'' کے بجائے ''مست'' کا مقلوب شدہ رنگ بھی اپنایا جاتا رہا۔ بات چیت اور تحریر میں علیحدہ ''مستیں'' کا لفظ مکمل معانی نہیں دیتا جب کہ صرف ''مست'' استعمال کرنے سے ''مستیں توکلی'' ہی کا تصور بنتا

ہے۔علاوہ ازیں محنت نہ کرنے والے دانش وروں، ٹی وی پروڈیوسروں اور غیر بلوچ لوگوں کے لیے مست ہی موزوں لفظ ہے اس لیے کہ وہ تو جام دُرّک جیسے سرشاعر کو ''دَرَک'' کہہ ڈالتے ہیں۔تو اسی طرح ''توکلی'' (Toukali) کو ''توکلّی'' اور اس کی جائے پیدائش ''ماں ڑک بند'' کو ''مان ٹرک بند'' کہتے ہیں۔میرے محترم سردار خان بلوچ(4) کی طرح کچھ لوگ(5) وہ زیادتی کرتے ہیں جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔یعنی وہ درویش اور فلاسفر مست کو دوبارہ مسلمان بنانے کے جنون میں اُسے ''توکلی'' سے ''طوق علی'' بنا ڈالتے ہیں۔

میں پیہرسن کے اس مطالعے سے سو فیصد متفق ہوں کہ مست وسمو دونوں کی زندگی کی کہانی میں ایک بھی ایسا پہلو نہیں ہے جو انھیں مذہبی صورت دے سکے۔ان دونوں سے متعلق مشہور روایتوں، اور معجزوں کی ساری طاقت صرف اور صرف محبت، وابستگی اور اپنائیت سے بندھی ہے۔وہ جو مبارک قاضی کا مصرع ہے: مہرئے دیما زندگی پابند بیت۔ یہ مست کی مثالی مہر تھی جو اُس کی درویشانہ شہرت کا سبب بنی۔

مست توکلی کو سمو سے ٹوٹ کر محبت کرنے کے حوالے سے ''سمو بیلی'' بھی کہا جاتا ہے ۔بیلی، ساتھی کو کہتے ہیں اور وہ بھی ناخن اور گوشت جیسی قربت والے، جُڑواں رہنے والے ساتھی یعنی Comrade-in arms کو۔مست نے خود بھی اپنے لیے بہت بار ''سمو بیلی'' کا نام استعمال کیا اور دوسروں سے بھی اپنے اس نام کو رائج کروادیا۔یقیناً اسے ''سمو بیلی'' کا نام سب سے زیادہ پسند تھا۔ جب سمو ہی دعا ہو، دعا گو ہو، پیر ہو مرشد ہو، ساتھی ہو، چاندنی چکور ہو، میٹھا ٹھنڈا پانی ہو، شاعری ہو، لے ہو، درد ہو دوا ہو، مہر ہو، دانا ہو.....اور مست سمیت پوری کائنات جب سمو میں سمٹ آئے تو ''ہیر نہ آکھو کوئی، رانجھا بولو''، کہ اسی میں ہیر کی پہچان ہے۔

یہ بلوچی لفظ ''بیل'' نہیں ہے جب گھوڑے کا سوار اپنے پیچھے ایک اور سواری بٹھائے تو اس دوسری یا پچھلی سواری کو ''بیل'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل، بلوچی، سرائیکی، سندھی اور پنجابی زبانوں کا مشترکہ لفظ ہے، جیسے ''سنگت بیلی''۔مگر بلوچی میں اور بالخصوص مست کے استعمال میں آکر یہ لفظ بہت زوردار بن جاتا ہے۔''سمو بیلی'' یعنی سمو کا اٹوٹ، جڑا ہوا، ہمہ وقت کا ساتھی۔ یہ

بیلی بلوچی میں پھر کبھی اور کہیں نہیں استعمال ہوا۔ یہی اس کا اولین اور آخری، حتمی اور متبرک اعلیٰ، اور اونچا مقام تھا۔

شہری علاقوں میں تو ''لفظ'' کا تقدس ویسے ہی اپنی قدر کھوٹی کر چکا ہے۔اگر آپ نے ''بیلی'' لفظ کی حرمت دیکھنی ہو تو کسی دیہی اور کوہی بلوچ سے ''سمو بیلی'' سن لیں، آپ کو اُس کی آنکھوں کی تعظیم بھری چمک اور اس لفظ کی ادائیگی میں اس کے پورے وجود کی شمولیت نظر آئے گی۔

لہٰذا، مست، سمو بیلی، توکلی مست، اور مستیں توکلی والے مذکورہ بالا سارے نام توکلی مست سے محبت، احترام، عقیدت اور تکریم کے نام تھے۔جنہیں عام مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی اپنی شاعری میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگے۔حتیٰ کہ ''گنوخ'' اور ''دیوانغ'' (پاگل) کے لفظ بھی:

نَیں گنوخ گڑدی نَیں که سهرابی چرغاں

یا

نِیں گنوخ کائیے مں سرا قربانه کناں

یا

اِشته مں تڈا گوں گنوخ شلی عقلاں

یا

اے گنوخیناں ، گوئشتناں میغاں نه نه گیڑ

یا

بیا، نواں پوه بئے، ته گنوخانی اٹکلاں

یا

پاذا، او دیوانغ ترا درمانے کناں

ایک رائے یہ بھی ہے کہ مست توکلی کا نام بچپن میں سہراب خان رکھا گیا تھا۔ اور، اُسی زمانے میں مری قبیلہ کے سردار گھرانے میں بھی سہراب خان نامی ایک شخص گزرا تھا۔ بلوچوں میں یہ عقیدہ راسخ انداز میں موجود ہے کہ اگر کسی بڑے شخص کا نام کوئی دوسرا شخص اپنے بیٹے پہ رکھ دے تو وہ بچہ یا تو جلد مر جائے گا، یا پاگل ہو جائے گا اور یا پھر زندگی بھر بیمار رہے گا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ نواب اکبر خان بگٹی، سلیم بگٹی اور میر ہمایوں مری اپنے اصلی نام سے منسوب نہیں ہیں۔ ان سب کے والدین نے بعد میں اُن کے نام بدل دیے تا کہ اس کا نام مرحوم بزرگ کی بچے پر ناراضگی کا باعث نہ بنے۔ اسی وجہ سے سہراب خان کا نام بدل کر بچے پر ''توکلی'' نام رکھا گیا۔

مگر دلچسپ حقیقت یہ دیکھئے کہ جس بچے نے سہراب خان کی بڑائی کے ڈر سے خود کو توکلی کروا دیا تھا وہ خود سہراب خان سے بدرجہا بڑا بن گیا۔ اور سہراب خان کا تذکرہ آج ہم توکلی ہی کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اب لوگ اِسی توکلی کی بڑائی اور کرامت کے خوف سے اپنے بچوں کا نام توکلی نہیں رکھتے۔

توکلی کا لڑکپن جوانی تک ماوند میں گزرا تھا۔ مگر جب وہ نوجوان ہو گیا تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ زمان و مکان سے اونچا ہو گیا۔ پھر وہ لولاک بھر کا شہری ہوتے ہوئے بھی کہیں کا نہ رہا۔ اُس کی جوانی کی آماج گاہ تو پھر ہر جگہ تھی اور کہیں بھی نہ تھی۔

لڑکپن میں وہ ماوند میں گائیں چراتا تھا۔ یوں ماوند کے سومرانڑیوں سے اُس کی وہ ساری دوستیاں اور رشتے وجود میں آ گئے جن کا ذکر اُس کی اپنی شاعری میں موجود ہے۔ وہاں بلوچاں نامی ایک غریب پرور انسان تھا، اس نے ہی مست کی پرورش کی۔ اُس زمانے میں اُس گاؤں اور قبیلے کا سربراہ شاذی ہان تھا۔ بہار خان ایک اور کیریکٹر تھا مست کی شاعری میں، جو اُس کا دوست تھا، اُس کے رازوں کا امین تھا۔ مست ماوند کے اپنے اِن محسنوں کو یوں طرح یاد کرتا ہے:

گوئر بلوچانا دعائیں ملخانی
آسر و او میثے گریوانی

سرجمیں شاذیھاں کلاتانی
تامیناں باثیل بور بناتاتی

ترجمہ:

بلوچ ہان کو فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں
وہ غریبوں کے لیے آسرا، اور امید ہے
(وہیں) قلعہ اور فصیل کا مالک شاذیھان ہے
جواں مرد باثیل بھی وہیں ہے

یا

ھَیر گوئر بھارخانئے لڑیں تیغاں
سُورِھا برجاہ بی ھموگیغاں

یا

شاذیھاں شاروءَ لوغہ دھیمغ اثش مں گورا
مٹے پہ دیما ھزل اث گوں ھذائی قدرتا

ترجمہ:

شاذیھان کا گھرانہ جنگی سربراہوں والا گھرانہ ہے۔ ان ہی پہ ذمہ داری ہے
دشمن ان کے سامنے بحکم خدا گرا ہوا ہے

اُس وقت بلوچوں میں لڑکپن، آج کے لڑکپن سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ مست کا لڑکپن آج کے بلوچ کے لڑکپن سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ کپڑا، ابھی ہمارے وقت میں بھی بہت کم یاب تھا، مست کے زمانے میں تو بالکل ناپید تھا، اور راشن پہ ملتا تھا۔ اس لیے بلوچ لڑکے بڑی عمر تک، شلوار نہیں پہنتے تھے۔ بیس بائیس برس کی عمر تک ایک لمبی چوغہ نما قمیص اور ایک پگڑی ہمارا لباس ہوا کرتے تھے۔ اِس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ ہر بلوچ اُس وقت تک پورا آدمی شمار نہیں ہوتا تھا

جب تک کہ وہ شلوار پہننا شروع نہیں کرتا، ''شلوار پاذی'' نہ ہوتا۔ اُس پہ لٹھائی (مار پیٹ) اور کوش (قتل) کا انتقام معیوب ہوتا تھا۔ اس لیے کہ اُسے کم سِن سمجھا جاتا تھا۔ اور کم سِن، بوڑھے، یا خاتون کی طرح وہ لڑکا بھی انتقام وغیرہ سے مستثنیٰ ہوتا تھا۔.....تو ہمیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مست کا ''لڑکپن'' کافی طویل رہا ہوگا۔

مست کا قد کاٹھ کیا تھا۔ اس کی رنگت اور خدوخال کیا تھے، کچھ بوڑھوں نے پچیس تیس سال قبل ہمیں بتایا تھا۔ ''تھا'' اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اب وہ لوگ خود اِس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندگی موت کی امانت جو ٹھہری!!۔ راوی خود کسی راوی کے حوالے بن جاتے ہیں!!۔

نواب اکبر بگٹی اپنے جبر وقہر و بادشاہی و سرداری اور پھر بالآخر، اپنی شان دار شہادت کے حوالے سے بلوچ سماج میں کس طرح یاد کیا جائے گا، ہمیں اندازہ نہیں۔ مگر اُس نے پرانے بادشاہوں کی طرح اپنے کلچر کی بڑی حفاظت کی تھی۔ جو انسال اُسی کی دریافت تھا، مرید بلیدی کو بھی اُسی نے متعارف کرایا۔ اسی طرح آثار قدیمہ، بلوچی کشیدہ کاری، بلوچ شاعری اور بلوچ موسیقی کی حفاظت اور بہبود میں اُس کا اچھا خاصا کردار ہے۔

اُس شام اُس نے بڑی چاہ اور تکریم سے اپنے مہمانوں کو مست شناس بنانے کے لیے اپنے خداداد ملازموں کو کہا تھا: ''جاؤ، میرے کپڑوں والی الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں ایک پوش میں لپٹی ہوئی ایک پوشاک رکھی ہے، عزت سے اٹھا لاؤ''۔ اور جب وہ بگٹی ملازم اُس باعزت پوشاک کو لایا تھا تو دونوں ہاتھوں پہ اس تقدس سے تھامے ہوئے، جیسے کوئی مقدس کتاب اٹھائی ہو۔ نواب بگٹی باقاعدہ پوش میں سے حضرت توکلی مست کی قمیص نکال کر ہمیں دکھاتا ہے۔ یہ سفید رنگ کی قمیص ہے۔ باوقار، شائستہ اور مہذب۔ کالر والی نہیں، بلکہ ''کرتی'' جو بلوچوں کی خاص قمیص ہوا کرتی تھی۔ اس کے بٹن، دھاگہ کو خود پہ لپیٹ لپیٹ کر بنائے گئے تھے۔ جیسے کرکٹ کی وکٹوں کے اوپر والی چھوٹی لکڑیاں ہوں۔ انگریزوں کے اوور کوٹوں پہ بھی چمڑے یا لکڑی کے ایسے بٹن میں نے دیکھے ہیں۔ قمیص درزی کی مشین سے نہیں بلکہ ہاتھ سے سلی ہوئی تھی۔ (اُس وقت درزی کہاں ہوں گے!!)۔ ڈک بہت چھوٹے چھوٹے۔ سفید قمیص کی سلائی بھی سفید دھاگے سے

کی گئی تھی۔ اس قمیص میں خاص بات یہ ہے کہ یہ لمبی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مست بہت زیادہ لمبے قد کا آدمی نہ تھا۔

اکبر بگٹی کے پاس مست توکلی سے منسوب ایک چھڑی بھی موجود تھی۔ یہ تقریباً ایک گز لمبی اور دو انچ قطر کی سیاہ رنگ کی چھڑی تھی۔ چھڑی اپنی لمبائی اور موٹائی کے برعکس وزن میں بہت ہی ہلکی پھلکی تھی۔ اکبر خان نے ہم حاضرین سے پوچھا کہ یہ چھڑی کس نام کے درخت کی ہے۔ مگر ہم اور بگٹی وڈیرے اتنے ہلکے وزن والی چھڑی کے درخت کا نام نہ بتا سکے۔ میں نے ''وازی'' کہا مگر ہمارا اتفاق نہ ہو سکا۔ یوں، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس درخت کی لکڑی ہے۔ (اب تو نہ اکبر خان رہا، نہ اُس کی وہ مقدس الماری رہی اور نہ وہ گھر۔ سب کچھ بے دلیل زور آوری کی خاکستر گری کی نذر ہو گیا۔ مست کا یہ ''منی میوزیم'' اپنے Curator کے ساتھ بلوچستانِ کبیر کی کوکھ میں!!)۔

مست کی ایک تصویر کے بارے میں بتایا جاتا رہا کہ مری علاقے میں تمبو کے علاقے میں وزیر ہان شیرانڑیں کے خانوادے کے پاس موجود ہے جس میں وہ ایک سفید ریش بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ مگر بہت جستجو اور محنت کے بعد جب اُس گاؤں کا میرا ایک دوست وہ تصویر مجھے دکھانے لایا تو وہ تصویر مست توکیا عام مری، یا بلوچی لباس والی بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ تو ملتان کے درویشوں میں سے کسی کی پینٹنگ تھی۔ اُس معزز خاندان نے اُسے مست کی تصویر سمجھ کر برسوں تک حفاظت و تکریم سے رکھا ہوا تھا۔

ممتاز محقق اور بلوچستان کا علمی محسن ڈاکٹر انعام الحق کوثر کوئی حوالہ اور ریفرنس مہیا کیے بغیر مست کی صورت یوں بیان کرتا ہے: ''چھریرا بدن، گھنگھریالے بال، بیضوی چہرہ، گورا رنگ، سرخ آنکھیں، ستواں ناک اور بڑے گھنے ابرو۔ وہ سفید کپڑے پہنتے تھے'' (6)۔

اِن ساری مذکورہ باتوں میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر صاحب کی سفید لباس والی بات ہی حتمی سچی بات ہے۔ کہ اُس زمانے میں سفید لباس ہی میسر تھا۔ اور مست کی قمیص تو میں نے خود دیکھی جو سفید رنگ کی تھی۔ باقی سب قیاس ہے۔

حوالہ جات

1۔شیرانڑیں سہراب خان۔انٹرویو

2۔کوثر،انعام الحق۔''تذکرہ صوفیائے بلوچستان'' 1976۔مرکزی اردو بورڈ لاہور۔صفحہ 275

3۔میر مٹھا خان''سموبیلی''۔1991۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ: صفحہ 10

4۔ذکیہ سردار''سرمستِ بلوچستان''۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔1965

5۔بلوچ،سردار خان''اے لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ''جلد نمبر 2 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔1984

6۔کوثر،انعام الحق۔صفحہ 275

بِگ بَینگ

مست ماوند میں عام بلوچوں کی طرح مال مویشی چراتا تھا۔وہاں اُس کی بہار خان کے ساتھ زبردست دوستی تھی۔اٹھنا بیٹھنا،آنا جانا.....وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔

ایک خوش نصیب صبح وہ دونوں قریب میں مناظر بھرے''رستر انی''کے علاقے میں سفر پہ گئے۔مجھے اپنی جستجو کے دوران اُن محققوں،مؤرخوں اور مؤلفوں کے اِس بیان میں کوئی سچائی نظر نہ آئی جن کے مطابق وہ کسی جنگی مہم پر جا رہے تھے۔اُن دونوں کی کبھی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہ رہی۔وہ تو عام سَچے،ستھرے اور سُچے لوگوں کی طرح تھے.....شکار،سیر وتفریح،چھوٹا موٹا کام۔

حسن وقدرتی مناظر سے مزین علاقہ رستر انی،ماوند سے ایک پہر کے فاصلے پر ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔گرمی جو کہ مون سون کی ساتھی ہوتی ہے۔بلوچستان کا مون سون اگر ایک طرف اپنے روٹھے پن میں جلاوطن رہنے کے لیے بدنام ہے تو یہ وطن واپسی پر اپنے روکھے پن، تباہ کاری اور وحشت میں یکتا بھی ہے۔جب برسنے کا پروگرام ہو تو ہمارا آوارہ بشام (ساون) بہت شارٹ نوٹس پر ہنگامی سیلابی حالت کا اعلان کرواتا ہے۔پہاڑی ندی نالے اچانک والی اپنی تیزی تندی میں دوسری ہر حرکت پر سبقت لے جاتے ہیں۔یک دم بقیہ زندگی کچھ گھنٹوں کے لیے جامد ہو جاتی ہے۔بس پانی،بس جل تھل،بس بچاؤ اور دفاعی صورت حال!۔

مست اور بہار خان کو ساون کے انھی بادلوں نے گھیر لیا۔ڈھلتی شام کا وقت تھا۔شمال مشرق سے بادل کا ایک پنبہ نما ٹکڑا نمودار ہوا،آن کی آن میں وسعت پا گیا۔کوئی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا

کہ گرج چمک شروع ہوئی۔موٹے موٹے قطروں کی آمد تیز وکثیر بارش کے آثار بن گئی۔

انھی آثار نے ان دونوں دوستوں کو اوٹ اور پناہ گاہ کی تلاش پہ مجبور کیا۔ یہ کوئی شہر نہیں تھا کہ رکشہ ٹیکسی لے کر کسی ہوٹل میں کمرہ بک کیا جاتا۔ یہ تو سنسان، بے آبادی والا علاقہ تھا جو سیلابی ندی نالوں سے بپھرنے والا تھا۔ لہٰذا کوئی خیمہ، کوئی ''کڑی''، کوئی گھر ملے جہاں ناقابلِ عبور دریاؤں کی مسلط کردہ مجبوری میں اُس وقت تک کے لیے پناہ لی جا سکے جب تک اِن ندی نالوں کا پاگل پن شانت ہو جائے۔ اُس وقت تک بس ایک وقت کا کھانا مل سکے اور چٹائی رضائی والی شب بسری مہیا ہو۔ تاکہ سیلاب اتر آنے پہ گھر واپسی کا راستہ بنے۔

انھیں ایک ہلک (خیمہ والا گھر) نظر آیا۔ دونوں مہمان (پناہ گزین) بننے وہیں جا پہنچے۔ نا آشنا انسانوں کی یہ مہمانی اور میزبانی بھیڑ پال بلوچ ویلیو سسٹم کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ایک طرح کا استحقاق۔

وہاں اُس وقت کوئی مرد موجود نہ تھا۔ دن کو گھر کون بیٹھے گا؟۔ چرواہی معیشت میں روٹی روزگار اور محنت مشقت کوئی سنڈے کوئی ہالی ڈے کرنے نہیں دیتیں۔ یہاں کے مرد بھی آس پاس کی چراگاہوں سے اپنے مویشیوں کو بارش وسیلاب کے ممکنہ خطرہ سے بچا کر گھر لانے کی جنگی کیفیت میں تھے۔

خاتونِ خانہ نے انھیں بلوچی رسم کے مطابق تڈا (مہمان نوازی کی چٹائی) لا کر دیا۔ گویا مسافروں کو ٹھکانہ مہیا کر دیا۔ اور خود گھر کے کاموں میں جُت گئی۔

چلتے جھکڑوں اور بارش کے شدید امکانات میں ایک خیمہ بدوش عورت کیا کرے گی؟۔ وہ اپنی ساری ہمت اور طاقت مجتمع کر کے بارش سے بچاؤ کے لیے جنگی کارروائی کرے گی۔ سمو نامی اِس خاتونِ خانہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ غصیلے بادل غرّا رہے تھے، اُن کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ خیمہ کے ستون اکھڑ اکھڑ جاتے تھے اور خیمہ بار بار ڈگمگانے لگتا۔

بارش آلود ہوا میں گھر کی مالکن اپنے خیمے کو گرنے سے بچانے کی جدوجہد بھی کر رہی تھی

اور سامان بھیگنے سے بچاؤ کی تگ و دو بھی۔ ہلکی بارش اور ہواؤں کے تھپیڑوں سے دلہن کا چہرہ گل نار ہو رہا تھا اور اُس کے کپڑے بھیگ بھیگ رہے تھے۔

شام کا دھندلکا تھا، معطر جڑی بوٹیوں کی بھیگی خوشبوئیں تھیں، پُر کیف ہوا کے باغی جھونکے تھے۔ پھوار پڑ رہی تھی.....اچانک تیز ہوائیں سر سے پاک دوپٹہ اڑا لے گئیں اور حسن و جوانی کی ملکہ کی زلفیں ہوا میں لہرانے لگیں (اُسی دن اس نے بال کھول رکھے تھے)۔ لہراتے سیاہ بالوں پہ بارش کے ننھے قطرے تھے اور اوپر سے بجلی چمکی تھی۔ قطرے قوس قزح بن گئے تھے.....اور توکلی پہ انجماد طاری ہو چکا۔ آنکھیں، جھپکنے کا اپنا ازلی ابدی کام بھول گئیں۔ منہ نے بند ہونے سے انکار کر دیا، دل نے برق کی رفتار سے دھڑکنا شروع کیا.....توکلی ہپناٹائز ہو چکا تھا۔

باد برزلفِ تو آمد
شد جہاں برمن سیاہ

(ہوا، تمہاری زلفوں پہ آئی
جہاں، مجھ پہ سیاہ ہو گیا)

سیاہ بال بھی کیا نعمت ہوتے ہیں۔ ایشیا! تجھ میں فطرت نے کتنی نعمتیں رکھ دی ہیں۔

محبت کا بگ بینگ توکلی پہ بج چکا تھا۔

سوچتا ہوں کہ توکلی کو زندگی بھر کا روگی بنانے میں سمو کا حسن تنہا تو ذمہ دار نہ تھا۔ ہاں ہاں، ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ حسن کا پورا لاؤ لشکر، ایک ساتھ وارد ہوتا ہے۔ اُس گھڑی پرندوں کی چہکار، شاخوں کی سرسراہٹ، بارش کی جھنکار، اور سیلابی پانی کی چٹانی ڈھلوانوں سے گزرنے کی آب شاری آوازوں نے مل کر مست کے کانوں میں جلترنگ بھر دیے تھے۔ پوری کائنات ایک حسین پینٹنگ بن چکی تھی۔ صرف آنکھ اور کان کائناتی منظر نامے کا شکار نہ تھے، بارش کی اپنی بھینی خوشبو، جڑی بوٹیوں کی بھیگی خوشبوؤں سے مل کر ناک کے لیے حشر سامانیاں کر رہی تھی۔ الغرض، حُسن آج رستر انی کے ٹیلوں کے درمیان، ''ساتیں والی'' کی کھیتوں کے درمیان، اور خانہ بدوشوں کے خیموں کے بیچ سعادت کا سرچشمہ بن چکا تھا۔ جمال سے محبت کرنے والا جمیل آج سراپا حسن بن چکا تھا۔

اور پورے علاقے میں حسن کے لیے سب سے موزوں روح کو کٹھ پتلی بنا چکا تھا..... جمال اور جمیلہ کا نام آج سمو تھا۔ جو بے رحمی سے اپنے شکار پہ جھپٹ پڑی تھی۔ اور آن کی آن میں مست کو مفتوح و مغلوب و مجبور و معذور بنا چکی تھی۔ بجلی کی وہ ایک چمک جو ''آسمان پہ افق تا افق دکھائی دی'' تو کلی نامی ایک فرد کے لیے شعلہ بن گئی، شعلہ رستر انی کے پہاڑ پہ الاؤ بنا، الاؤ جہنم بن گیا اور اس کی پُر کیف گہرائیوں میں مست بھسم ہو چکا تھا۔ اُسے اب زندگی بھر جلنا تھا۔ ایک قافلے کی تشکیل کرنا تھی..... ''عشق کی آگ میں جلنے والوں کا قافلہ''، ''عشاق کا قافلہ''، ہمارا تمہارا قافلہ۔

چنانچہ، دیکھنے والا پگھل چکا تھا۔ کیوپڈ کا تیر کمان بے کار ہو چلا تھا اور وہ نہتی سائیکی کی حسین ترین نگاہوں کا تیر دل میں گہرا پیوست کرا چکا تھا۔ تو کلی کو سرکا ڈانگ لگ چکا تھا۔ محبت کا دیوتا مہربان ہو گیا تھا۔ آنند کے تار بجے، مست پہ آیاتِ حسن نازل کی گئیں۔ بلوچستان نے بلوچستان کو بلوچستان بنا ڈالا تھا۔

اس بے قصور انسان کی دنیا بدل گئی، اس کی ترجیحات اور مقصدِ حیات، سب کچھ بدل گیا۔ محبت آدمی کو انسان بنا دیتا ہے..... اور سمو نے تو کلی کو محض انسان نہیں، ''مست تو کلی'' بنا ڈالا۔ اور وہ بھی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں۔ (وقت بہت قیمتی ہوتا ہے مگر بے شمار دیگر مظاہر کو Synchronize کر کے ہی۔ اس لیے کہ ٹائم سپیس بنا کچھ نہیں۔..... اور آج وقت، دنیا بھر کی ترقی یافتہ ماڈرن سائنسی لیبارٹریوں کی بجائے بے آباد پہاڑوں میں گراں بہا بن چکا تھا)۔ اب نہ سمو عام عورت تھی، نہ تو کلی عام چرواہا رہا۔ لمحہ پہلے یہ دونوں گم نام شخصیتیں تھیں، مگر ایک ہی پل کے ہزارویں حصے میں یہ دونوں برگزیدہ بن چکیں، دو پاک روحیں بلوچ آسمان پہ عقیدت و محبت کی ولی ہو گئیں۔ بلوچستان میں محبت کا عالم گیر چاند آناً فاناً چودھویں کا ہو گیا۔

ہاں ایک خاتون نے تو کلی کو فرش سے عرش پہ پہنچایا۔ تو گویا، وہ خاتون ایک عام خاتون نہ تھی۔ مگر کیا وہ ایک عام تو کلی تھا؟ نہیں ناں۔ وہ بھی تو کچھ تھا۔ تو کلی بھی تو کچھ تھا۔ محبت گو کہ بہت قوت رکھتی ہے اور صلاحیتوں کو پروان بھی چڑھاتی ہے، مگر یہ بنیادی صلاحیتوں کی جگہ تو نہیں لے سکتی۔ ''محبت کی چمک اور حرارت اُسی شخص کے اندر داخل کی جا سکتی ہے جس کو فطرت نے یہ

صلاحیت عطا کر رکھی ہو'' (1)۔ سو، انسان سازی اور انسان ساز صلاحیتوں کا قالب پہلے ہی سے موجود تھے۔ بس، معروض کی مطابقت چاہیے تھی۔ وہ آج عطا ہو گئی۔

شام کو جب گھر والے لوٹ آئے تو مسافروں کے لیے کھانا لائے۔ مگر گم گشتہ روح اس قدر سیر شکم ہو چکی تھی کہ شکم تک کی بھوک مٹ گئی۔ سارے جذبے جبلتیں یک سُو ہو کر محبت کے جذبے میں جذب ہو چکی تھیں۔ مست نے کچھ نہ کھایا۔

بہار خان نے پوچھا، ''تمھیں کیا ہو گیا؟''۔ کہا، ''کچھ نہیں''۔ ''اچھا، تو کلی تم مجھے پوڑ (چلم) بنا کر پلا دو''۔ تو کلی نے گارے کا چلم بنا کر تمبا کو اس میں ڈالا مگر اس میں دھواں کھینچنے کے لیے سوراخ یا نالی نہیں بنائی۔ پوچھا، ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''۔ کہا، ''مجھے کوئی ہوش نہیں، کوئی سدھ نہیں ہے''۔ (2)

میزبان بستر اور سرہانے لائے مگر مست تو لیٹا ہی نہیں، بیٹھا رہا (محبت جان چکی تھی کہ نیند ہی نے تو سسی کی دنیا اجاڑی دی تھی!۔ اب اور سستی نہیں!!، نومور.....)۔

چنانچہ مست سویا نہیں، لیٹا نہیں بلکہ ساری رات بیٹھا رہا، آنکھیں وہیں ویٹیکن پہ ٹکی رہیں۔ صبح اُس کے یوحنا، بہار خان نے پوچھا، ''کیا تمھیں کسی سانپ وغیرہ نے ڈس لیا؟، یا کوئی اور بیماری ہے؟''۔ اس نے کہا، ''زالا دھلینتہ، مس نی ژہ کار اشتغاں'' (3) (دل لے گئی وہ عورت، میں اب کسی کام کا نہیں رہا)۔ کیا اس سے بڑھ کر نورانی الفاظ ممکن ہیں؟۔ مجھے مست کا یہ فقرہ بہت اچھا لگا۔ ایسا فی البدیہہ اور پُر معنی فقرہ جس میں کوئی توقعات، کوئی دنیاوی عزائم نہ تھے۔ دوسری پارٹی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بس اپنی کیفیت اُگل دی..... میں نے پھر کہیں ایسا فقرہ انھی معنوں میں کبھی نہیں سنا، کبھی نہیں پڑھا۔

جب ایک نکتے پر ساری توجہ کا ارتکاز ہو جائے، جب ساری قوتیں ساری توانائیاں ایک جگہ جمع ہو جائیں، جب سارے دوسرے مظاہر ماسوائے اُس ایک مرکزی نکتے کی مددگاری کے، بے جواز ہو جائیں، تو اُس گھڑی آپ کیا بن جاتے ہیں؟۔..... مست وہی کچھ بن چکا تھا۔

مگر، اس پوری انرجی کو سنبھالنے اور اس کی انتظام کاری کے لیے میں اور آپ موزوں

نہیں ہیں۔اُس کے لیے تو مست جیسا بڑا دل دماغ چاہیے، ہر عام وخاص سے یہ برداشت وکنٹرول نہیں ہوسکتی۔

مست پر آفاقی محبت کی بجلی گرنے کا واقعہ تقریباً 1858ء میں ہوا۔اچھا، جب مست کی اپنی شاعری میں اس واقعے کا ذکر بہت خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے تو ہم کیا وضاحت کر پائیں گے؟۔اِس ہیروشیما کو مست کی اپنی زبانی سنیے:

جی کریم سازیں مالکیں ستار
اژوثی ڈاتانی درا مہر بیار
کوڑ وئے اسراریں(1) ہمے سہدار
پاک اشنت ربئے سچوئیں دیذار
تنگویں تاج وبے گوریں ڈاتار
نشتع انت سرمئیں کا نھلو گنجیں
گنگلوغوغائی (2) لوائیاں
دور و باری آں عمراہیاں
گوئروثی میراں سیر طمائیناں(3)
چّرکاں ماوندہ دِہے دیثیں
تدڑی سیر گنجیں موادانی
منجھرا سرسیم ایں سوادھانی
گوئر بلوچانا دعائیں ملخانی
آسر و اومیثے گریوانی
سرجمیں شاذی ہاں کلاتانی
تامناں باثیل بور بناتانی

ھَیر گوئر بہار خانئے لڑیں تیغاں
سُورہا بر جاہ بی ہمو گیغاں
سنگتی گوں گیژاں بہار خانا
بیثغاں ربئے کار سّوبانی
جینہراں گوئرتہ کوہے دربھّانی
زڑتغہ گرندان و نوذ شلپاناں
نوذ شلپاناں مانہ جّکاناں
مادہ پہ اولوئے نہ چپّاناں
بولکے سہرابی ہواں بانا
بروں ہموذا کہ ہیمہ اے ہیری
ہتھیار ہوندی (4) بنت منی میری
کوکراں گاٹ و گھمرہ سیِری
واچڑاں کُلّہ بانزرے سستہ
دوست کڑی ئے ژہ بانزرا رپتہ
دست گوں پیژدارہ (5) بُنا گپتئی
شار(6)بڑتہ گواث ترمپاں شلوخیناں
ڈوبرئے گُل کہ روح بروخیناں
دیثہ مئیں دیر گنداں کھلوخیناں
ننگساں (7) پہم گپتہ رلوخیناں
دیم چوڈی او آں بلوخیناں
سغر چوشش پڑتیں دو سیاہ مارا
زلفاں چو سیاہ ماراں تلوخیناں

بِریں چو آہواں ترہوخیناں
زِوریں چوکُنڈہی آں بہو خیناں
لانٹہ کنت چماں پرخمارینا
عاشقاں شوشی بے قرار یناں
وہشیں چولیمو آں بہشت ایغاں
چارشہ شکرایاں شتاویناں
میل کشہ چوکی آں چیارینا
پکغہ باغ پہ طالح و بختاں
بادشاہ معلوم بیشہ ژہ تختاں
بیثغاں مجنامس ہماری روشی
بَر و بیزاراں مست و مد ہوشی
چلہ ای شف پہ نندغ و آزار
گوں حیالاں مس روش کشہ یکار
یاعلی و مس دیذ غاں دوست دار
گپتغاں گواث چنڈاں گنوخیناں
چلمو و شا ہی آں جنوخیناں
مس وتی سرینئے جابہاں بوژاں
بندان اِش سرلانباں کلیریغاں
بانگہا دوست و دژمنے گنداں
دوست پرے مونجھائیں دلے گنداں
دژمس پہ تیر دھورے جناں سنگاں
مس دہ تکائی گڑتغاں ہنداں

میگڑے رنگولی رواں داثیں
کاڑچ پہ ھیراتا نہ ہوشیں تَیں
گُل مس درگاہا قبول باثاں
مارا ماں دیمی مزّلاں پُجاں

[حاشیہ: 1 ۔ابدی چیز 2۔مستی 3۔آسودگی 4۔محفوظ 5۔خیمے کا اگلا ستون 6۔دوپٹہ 7۔آنکھیں]

ترجمہ:

جی خدا کو کہ کریم ہے مالک ہے ستار ہے
اپنی سخاوت کے در سے محبت میں آ ؤ
یہ جان دار، دنیا کے رازوں میں سے ہے
رب کے سچے دیدار پاک تھے
(ان کا) تاج طلائی ہے اور سخاوت بے انت
میرے سردار، امیر کا ہان میں رہتے ہیں
مستی اور خوش حالی میں
زمانوں سے چلی آئی امارت میں
اپنے سیر شکم سربراہوں کے پاس
گھومتے پھرتے میں نے ماوند کا علاقہ دیکھا
تڈی کا پہاڑ معدنیات سے مالا مال ہے
منجھر احسین مناظر کی انتہا ہے
بلوچان کو فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں
وہ غریبوں کا آسرا، اُن کی امید ہے
فصیلوں، قلعوں کا مالک شاذیھان مستحکم ہے

کہاں ہے باٹیل گھڑ سوار
بہار خان کی چلتی تلوار کے سائے میں امن ہے
وہ ہر طریقے سے محفوظ و محکم ہے
بہار خان کو وہاں سے ساتھ لیا
تب خدا کا کرنا یوں ہوا
کوہِ دربھانی پہ بارش ہوئی
بادل گرجنے لگے اور بارش برسنے لگی
بارش برستی رہی ہم بھی چلتے رہے
ہم بھی تیز بارش میں چلنے سے گریزاں نہ ہوئے
پہاڑ کے دامن میں ایک گھر دکھائی دیا
چلو وہاں، جہاں کسی حور کا خیمہ ہے
(تاکہ) میرے امیری ہتھیار (بھیگنے سے) محفوظ رہیں
بادل گرجے جیسے شادی پہ رقصاں و مستاں ہوں
طوفانی بارش نے خیمہ کی ایک طناب توڑ ڈالی
محبوبہ خیمہ کے پہلو سے نکلی
ہاتھ سے خیمے کی لکڑی کو مضبوطی سے تھاما
بارش آلود تیز ہوائیں اس کی چادر لے اڑیں
روح چھیننے والے اس کے سینے کے پھول
میری دوررس نگاہوں نے دیکھ لیے
محبت آشنا نگاہیں چار ہوئیں
اس کا چہرہ جیسے چراغوں کا چراغاں
سر (بال) جیسے چھ بار، بل کھائی ہوئی دونا گنیں

زلفیں جیسے لہراتے ہوئے سانپ ہوں
صحرائی ہواؤں کی طرح رمیدہ خو
تیز جیسے تیغ برّاں
پُرخمار آنکھیں شعاعیں برساتی ہیں
بے قرار عشاق کو جلا ڈالتی ہے
وہ ایسی پر ذائقہ ہے جیسے جنت کے لیموں
میری عقاب جیسی تیز نگاہوں نے ادراک کر لیا
چاروں مورچے یک جا ہوئے
میری خوش قسمتی کہ باغ پک گیا
تخت پہ بیٹھا بادشاہ باخبر ہوا
میں اسی دن مجنوں ہو گیا
میں دنیا سے بے گانہ اور مست و مدہوش ہو گیا
زمستاں کی تکلیف دہ رات آنکھوں میں کٹ گئی
تفکر میں پوری رات جاگ کر گزاری
حضرت علی کو آنکھوں سے لگا کر رکھا
مجھے وحشی، ہلا ڈالنے والی ہواؤں نے گھیر لیا
چابک مارنے والے احساسات نے
میں کمر میں بندھے اپنے کمر بند کھولتا ہوں
انھیں کلیر درخت کی اونچی شاخوں پہ باندھ لیتا ہوں
(تاکہ) کل صبح دوست دشمن انھیں دیکھ سکیں
دوست ملول دلوں سے دیکھ لیں
دشمن دُور سے سنگ باری کریں

میں وہاں سے جلد ہی گھر لوٹ آیا
میں نے رنگی ہوئی بھیڑوں کا ایک ریوڑ رواں کر دیا
خیرات اتنی کر دی کہ چھرا سوکھنے نہ دیا
(شالا) سارے درگاہ میں قبول ہو جائیں
اگلی منزلوں میں ہمارے کام آئیں

ایک بات اور ہے۔ اور وہ ہے بھی نہایت ضروری بات۔ حسن جب بھرپور توازن میں آ جاتا ہے، تب وہ عاشق کو مطیع محض بنا کر Cretin (بونا) بنا لیتا ہے جو یسوع کی طرح نہ گناہ سوچ سکتا ہے، نہ گناہ کر سکتا ہے۔ (گناہ خود ایک مطلق نہیں بلکہ اضافی تصور ہے۔ اس کے معانی ہر جگہ اور ہر دور میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ ہمہ وقت اپنا وجود، اپنے معانی، اپنی تجسیم، اور اپنی جون بدلتا جاتا ہے)۔ حسن کے توازن کی بشارت اپنے ساتھ ساری فطرت کو متوازن کر جاتی ہے۔ ہر پہاڑ نغمہ سرا ہوتا ہے، کائنات کی ہر حرکت Rhythmic بن جاتی ہے۔ ہر مظہر لطیف بن جاتا ہے، ہچکولے کھاتا ہوا، رقصاں.....خراماں۔

ہمیں معلوم ہے کہ مست کو' گھائل کر ڈالنے والی پہلی نظر کے بعد، پھر بہت کم بار سموکی عاشق کُش آنکھوں کا شکار ہونا نصیب ہوا۔ پھر شاید ہی اُسے اُس کے چہرے پر وہ مخصوص نرم روشنی دیکھنا نصیب ہوئی ہوگی جو اس کے بدن کی رنگت سے مل کر قہر بن جاتی۔ حسن کی کرشمہ کاری ہمیشہ تو نظر نہیں آتی۔ موت آگیں سکوت اور برباد کر ڈالنے والے سکتے کا لمحہ ایک بار طاری کر کے حسن اپنی تمام فریکوئنسیوں کو بہت مدت بعد ہی دوبارہ یک جا کر پاتا ہے۔ بہت عرصہ بعد جا کر وہ معجزہ دوبارہ رونما ہوتا ہے جب عاشق مکمل طور پر تحلیل ہو کر ریت، ہوا، پانی، درخت جیسے فطرت کے مظاہر میں ڈھل جاتا ہے۔ اور یہی لمحہ سچائی بھی ہوتا ہے، اور وابستگی، پاکیزگی اور لامکانی عمیق محبت بھی۔ باقی ماہ و سال تو اِسی ایک لمحے کے چاکر ہوتے ہیں۔

مگر اس ایک لمحے کے نزول کے لیے اپنی اپنی سمو کا چہرہ ہی چاہیے ہوتا ہے۔ ہر گوشت کا

لوتھڑا یہ تجلی خارج نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس تجلی کی ویولینتھ ماپنے، جذب کرنے کے لیے ہر آنکھ نہیں، مخصوص بصارت چاہیے ہوتی ہے..... ہر آنکھ مست تو کلی کی آنکھ نہیں ہو سکتی۔ ہر سمو کی تجلی کے لیے اُسی absorbance والا مست ہی ضروری ہوتا ہے..... اور ہر مست کو اسی تجلی کا پیالہ پوری زندگی میں دو چار بار ہی پینا نصیب ہوتا ہے۔ بعض تو پہلی جھلک ہی کو ذخیرہ بنا کر اپنی پوری زندگی انا الحق انا الحق جپتے جاتے ہیں۔

یہ جو زندگی بھر مست اپنی سمو کی تعریفیں گاتا رہا ہے، وہ اسی رستزانی والے بعث بعد الموت کے اولین واقعہ کی ثنا خوانی تھی۔ بعد میں تو وہ ''مین ٹے ننس ڈوز'' کے حصول کی خاطر اس روح القدس سے باریابی کا شرف لیتا رہا۔

حوالہ جات وتشریحات

1۔ گوئٹے/ریاض الحسن، نوجوان ورتھر کی داستانِ غم۔ جولائی 2000۔ الحمرا پبلشنگ۔

2- مست پوڑ (پائپ) پیتا تھا اور یہ پائپ کوئی دو چار ہزار روپے والا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اُسی وقت ڈسپوزیبل پائپ بنایا جاتا تھا اور ایک ہی دفعہ پی کر وہیں پھینک دیا جاتا تھا۔ آج بھی بلوچ یہی کرتے ہیں۔ پائپ گارے یعنی گیلی مٹی سے بنائی جاتی ہے۔ مُٹھی بھر مٹی لیں، اس پہ چلو جتنا پانی ڈالیں، پھر اسے دو تین تھپڑ ماریں تا کہ اس کی شکل گاجر کی سی بن جائے۔ اُس کے پتلے سرے پہ کوئی تنکا ڈالیں آخر تک، اور وہاں اوپر کی طرف تمبا کو بھرنے جتنا سوراخ ڈالیں۔ دونوں سوراخوں کو ملانے والا چینل جب بن جائے تو دو تین کنکر ڈال دیں تا کہ تمبا کو کش کے ذریعے منہ میں نہ جائے۔ پھر تمبا کو بھر کر آژگیژ (چاقماق) اور پتھر کو دو تین بار رگڑیں، نتیجے میں نکلنے والی چنگاریوں سے شورہ لگے پیش کے فائبر کو جلا لیں اور تمبا کو پر رکھ دیں۔ پی لیں اور مزے لیں۔

واضح رہے کہ ہمہ وقت سفر میں رہنے والا مست جب بھی تھک جاتا، تو کہتا ''بیائیں، پوڑے چکّوں''۔ (آؤ ذرا چلم پی لیں)۔

3۔ بختیار خان، وڈیرہ، انٹرویو

سمو کا حسن

زِ عشقِ آں رخِ خوبِ تو اے اصولِ مراد
ہر آں کہ تو بہ کند تو بہ اش قبول مباد

حُسن کیا ہے؟ میں نے کہاں کہاں نہیں کھوجا۔ کتابوں، لغاتوں، انسائیکلو پیڈیاؤں اور ویب سائٹوں میں۔ کوئی تشفی بھری تعریف مجھے کہیں سے نہیں مل سکی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا تصور، اپنا اپنا بیان۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ حسن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے جس بھی محبّ و عاشق کو سنا پڑھا، وہ حسن کی اپنی تعریف و وضاحت لیے نظر آیا۔ ہر qualitative مظہر کی طرح حسن کے بارے میں بھی کوئی مشترک و متفق فقرہ سامنے نہ آیا۔

حسن کیا ہے، کبھی آپ نے سوچا؟۔ مگر یہ شاید کوئی اکیڈمک معاملہ ہو ہی نہیں!۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ عاشق، حسن دیکھ کر ہی عاشق ہو جاتا ہو۔

حسن کے بارے میں تصور کبھی بھی یکساں نہ رہا۔ یہ بدلتا رہا ہے، تہذیبی اقدار کے ساتھ ساتھ۔ شاید ایک آدھ چیز جو مشترک رہی ہیں اُن میں جوانی، بے جھریوں والی جلد، متناسب و سڈول جسم شامل ہیں۔ ایک معاشرے میں دراصل ''جسمانی دل کشی'' ہی کو حسن کے مترادف لفظ کے بطور مانا جاتا ہے۔ اس جسمانی دل کشی میں شخصیت، عقل مندی، وقار، کرشمہ، سلیمت، متناسبیت اور لطافت اور خارجی حسن آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عمومی طور پر اوسط انسانوں ہی میں سے کوئی

حسین یا حسینہ ہوتی ہے۔

جن لوگوں کو محبت ہو جاتی ہے، ان کی بات البتہ دوسری ہے۔ زیادہ تر یوں ہوتا ہے کہ محبت پہلے ہو جاتی ہے، تاویلیں بعد کی ہوتی ہیں، حسن اور بے حُسنی کی کھوج بعد کی ہے، اُسے الفاظ وفن کے پوشاک پہنانا بعد کی بات ہے۔

مثلاً سمو مائی کے بارے میں روایت ہے کہ شاید وہ بہت زیادہ گوری نہیں تھی۔ بلکہ وہ سوزا رنگ اور سانولی تھی۔ اس کے باوجود سمو کے چہرے اور قد و قامت میں ایک ایسی کشش و جاذبیت تھی کہ اس نے پاکوں سے پاک روح کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا اور جسے دیکھتے ہی مست جیسے ''حسن جانچکار'' کی روح و جسم کلٹی ہو گئے۔ یہاں پر ہم محمد سراج مسوری بگٹی کا تحریر کردہ ایک قصہ نقل کرتے ہیں، جو اس نے اپنے قبیلے کے بزرگوں سے سنا ہوا ہے۔

ایک دفعہ وڈیرہ علی ہان مری اپنے قبائلیوں کے ایک گھڑ سوار دستے کے ساتھ مری کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ مسوری کا ایک مقدم میر ہیتان خان بگٹی بھی اُس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک بڑے تالاب کے قریب سے گزرے۔ تو انھوں نے مریوں کی کئی خواتین کو پانی بھرنے کے لیے تالاب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ علی ہان نے ہیتان سے کہا کہ مقدم! ان خواتین میں مست کی محبوبہ سمو بھی موجود ہے۔ ہیتان نے سمو کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ علی ہان نے کہا ہاں ہم اس کو بلاتے ہیں، وہ آئے گی۔ چنانچہ علی ہان نے ذرا آگے جا کر خواتین سے کہا، ''بہنو! مائی سمو کو کہو کہ وہ ذرا ٹھہرے، ہیتان مسوری اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔'' چنانچہ سمو عورتوں کے گروہ سے نکل کر علی ہان اور ہیتان کی جانب آ گئی۔ اس نے ادا (بھائی) کہہ کر مقدمین کو خوش آمدید کہا اور دُراہی (مصافحہ) کر لیا۔ پھر ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیر خیریت پوچھ لی۔ ہیتان نے جواباً سمو کی خیر خیریت پوچھ لی۔ اس کے بعد ہیتان نے کہا، ''گُہار (بہن) میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے اور تکلیف دی کہ مست آپ کے حسن کی بہت تعریفیں کرتا ہے۔ مجھے وڈیرہ نے بتایا کہ آپ ان خواتین میں موجود ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ کو ایک نظر دیکھ لوں''۔ سمو نے کہا، ادا! مست زورا خے مناں اِکھریں صورت تہ نیتیں، مس ہمشاں کہ تئی چمانی دیمایاں۔ (بھائی! مست زور آور ہے، میں

اس قدر خوب صورت تو نہیں، میں تو یہی ہوں جو آپ کے سامنے ہوں)۔

''بقول ہیپتان مسوری، سمو ایک درمیانے قد کی دلکش سوزارنگ خاتون تھی۔ زیادہ گوری اور سفید نہیں تھی''۔

سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے کہ مست کی سمو، اور مجنوں کی لیلیٰ گوری نہ تھیں۔ سوزارنگ کیوں تھیں؟۔ ہمارے مشرق کے عشاق لوگ سوزارنگ پسند کرتے رہے ہیں کیا؟۔

اور، کیا یہ مشہور فقرہ ہی درست ہے کہ ''حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے!''۔

حسن کیا ہے، شاید ہم نہ بتا سکیں۔ البتہ یہ تو یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا کیا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو فوراً ہی جذبے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حسن کی نشانی یہ ہے کہ یہ تلاش کرنے سے نہیں، بلکہ بس اچانک مل جاتا ہے، اور پھر راہنما بن جاتا ہے۔ ایک ایسا نور جو ہمیں باطل کی ظلمتوں میں بھٹکنے نہیں دیتا۔ کیف ہے پُرخمار۔ دل ہے سلگتا ہوا، روح ہے تڑپتی ہوئی..... نظر آتا ہے آنکھوں کے بغیر بھی، سنائی دیتا ہے کانوں کے بغیر بھی.....ابدی کھلا گلستان ہے، گاتے کلیلیں کرتے دائمی پرواز کرتے ''ہیروں'' کا ڈار ہے۔ حسن کی اپنی ایک نورانگی ہے۔ حسینہ کے چہرے پہ نقاب ہو نہ ہو مگر حسن کے چہرے پہ کوئی نقاب نہیں ہوتا۔ حسن ہدایت ہے، ہدایت نامہ اور ہدایت کار ہے۔ حسن کو بقا ہے دوام ہے، اسے کبھی موت نہیں آتی۔ حسن ابدی، حسن ابدیت۔ کبھی کبھی اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ منظر یعنی چہرہ، اوزار یعنی دیکھنے والے کی آنکھ اور میٹر یعنی دیکھنے والے کا دماغ، اِن تینوں میں فیصلہ کن کون سا ہے؟۔ شاید تینوں۔ ثبینہ رفعت کے بقول:

چہرہ کیسا بھی ہو
اس کو
گھنٹوں دیکھا جا سکتا ہے
سو، جاناں
شرطِ محبت ٹھہری
حسن نہیں!!

حسن کا بیانیہ بہت سی جہتیں، بہت سی صورتیں رکھتا ہے۔ اب تو لگتا ہے سب چیزیں بدل کر رہ گئی ہیں۔ اب حسن ایک کوالی ٹیٹو مظہر نہیں رہا بلکہ اِس کو کوانٹی ٹیٹو بنایا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں حسن ناپنے کے لیے کیا کیا اوزان و پیمائش وضع کیے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نام نہاد ماہرین، ٹخنوں کو تولتے ہیں، پنڈلیوں کی نظریاتی سرحدیں ناپتے ہیں، رانوں کا الٹرا ساؤنڈ کرتے ہیں، کولہوں کے بھنور دیکھتے ہیں، بانہوں کا درجہ حرارت ناپتے ہیں، ہونٹوں کی پٹوار گری کرتے ہیں، رخساروں کو اعشاری نظام میں دیکھتے ہیں.....اور اس طرح کسی کو ملکۂ حسن قرار دیتے ہیں۔ ارے گز تو کپڑا ناپنے کے لیے ہوتا ہے، لیٹر پیٹرول ناپنے کے لیے۔ مگر، حسن کو ناپنا؟.....لعنت ہے ناپ تول پہ۔ لعنت ہے سرمایہ داری نظام پہ۔ لعنت ہے ان پہ۔ حسن کی بے حرمتی ہے یہ، حسن ہی اُن سے نمٹ لے گا۔

حسن کیا ہے؟ یہ تو ایک ضرورت ہے، ایک مظہر ہے، ایک وصف ہے، ایک کیف ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ حسن وہی جسے محبوب چن لے۔ اب کیا کیا جائے۔ آپ کتابوں پہ کتابیں لکھ ماریے مگر ایک شخص یہ کہہ کر گویا آپ کی ساری علمیت کا نچوڑ نکال دے گا:

تو نڑیں کہ بنّیں تافغاں پشّاں
سمّلئے دستانی نغن وہشاں

ترجمہ:

خواہ پتھر کے بنے توے پر ہی کیوں نہ پکی ہوں
روٹیاں لذیذ تو سمو کے ہاتھوں کی پکی ہی ہوتی ہیں

دوسرے لفظوں میں مست ایک اور بات کر رہا ہے، کہ آپ ساری دنیا کے ڈگری یافتہ حسن دانوں کو ان کی عریاں مشینوں میٹروں کے ساتھ بٹھا لیں، مہینوں ان کے بے دماغ سر جوڑ لیں، ہزار بے معنی تشریحات اور لاکھ بے بنیاد وضاحتیں سن لیں مگر حسن سمو ہے، بس!۔ حسن عاشق کے دل میں ہوتا ہے۔ عاشق کی حسینہ کچھ بھی کہے اچھا لگتا ہے، وہ کچھ بھی پہن لے اس پر جچتا ہے۔ وگرنہ بلوچی فوک کے مطابق ہلمل اور جگمگ کرتا لباس تو ہر ایرے غیرے نے پہن رکھا ہوتا ہے۔

تو پھر، حسن کا سب سے بڑا ''جانچن ہار'' کون ہے۔ جنس زدہ ماہر؟، اُس کے بے مروت پلاسٹک کے آلات؟، زرخرید میڈیا؟، یا، بے شعور دانش ور؟ .....نہیں نہیں۔ حسن کا بیرومیٹر محض مخصوص آنکھ ہوتی ہے۔ وہ آنکھ جو بہہ بہہ کر حسن کے حسین ہونے کی گواہی دے۔ اور وہ آنکھ صرف عاشق کی ہوسکتی ہے۔ اُسی کی بات معتبر، اُسی کا معیار بلند اور اُسی کا فیصلہ حتمی۔ (یاد ہے ساری دنیا نے کہا تھا؛ سمو حسین نہیں ہے، ساری دنیا نے کہا تھا؛ لیلیٰ حسین نہیں ہے۔ .....مگر ہم آج تک سمو اور لیلیٰ کے گیت گاتے ہیں۔ دنیا نے اس سلسلے میں سارے عرضی نویسوں فلاسفروں، ایٹم فروش سائنس دانوں اور کور کمانڈروں کی صدارت میں مشاعرہ پڑھنے والے شاعروں کو مسترد کر دیا، اور صرف مست اور مجنوں کا فیصلہ مانا ہے)۔

مگر ہاں، یہ ضروری ہے کہ جانچنے والا عاشق ہی ہو، سودا گر نہ ہو۔ کیوں کہ اگر جانچنے والا سڑے ہوئے بدبودار دل والا ہو، اُس کی اپنی شخصیت اور رویہ گلا ہوا ہو تو پھر حسن تو ٹکے کی چیز بھی نہ ہوگی۔

حسن محبت، حسن کشش، حسن جاذبیت، حسن وابستگی، حسن نزاکت، حسن تکریم، حسن بقائے باہم کا مبلغ.....۔

اور پھر مست توکلی سے بڑا حسن شناس بھلا اور کون ہوسکتا ہے کہ حسن ہی تو مست جیسے حکیموں، داناؤں اور دانش وروں کا مذہب ہے۔ مست ہی حسن کی الوہیت پہ ایمان لاسکتا ہے۔ آیئے، اس کی شاعری میں سے (سمو کے) حسن کی توصیف میں کہے گئے الفاظ چُن لیں:

''سمو قوسِ قزح ہے جو خوب صورت بادلوں میں آن کھڑی ہوتی ہے۔ بجلی کی چمک ہے جیسے ساون کے پانی بھرے بادل ہوں۔ بارش کے بعد کے منظر کی ہم شکل ہے اور بادِ سحر کی طرح خوش کن مہ لقا ہے، سرحدوں کی مالکن، گھنی سنگین و ناگن جیسی زلفوں کی مالکن ہے۔ خوش قد ہے، آہو گردن ہے..... چہرہ روشن چراغوں جیسا، زلفیں بل کھاتے سانپوں کی طرح، جنگلی آہوؤں کی طرح نہ سدھائی ہوئی..... تیز جیسے تیغِ برّاں..... اس کے کاغذ جیسے باریک لب لُو کی طرح جلا ڈالتے ہیں .....اس کے سیپی جیسے دانت شورہ کی طرح پکا دیتے ہیں..... اس کی بڑی بڑی آنکھیں پہاڑوں پہ

ٹھوکریں کھلواتی ہیں..... وہ جاندران پہاڑ کی چوٹیوں پہ اگنے والی لیموں ہے جہاں وہ چٹانوں کے سائے میں اگ کر بڑی ہوگئی..... وہ تو آب دار بادلوں پہ شام کے وقت کی قوس قزح ہے..... چودھویں کا چاند ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر سے فروزاں ہوکر، اور آسمان پہ بلند ہوکر ہر سو چاندنی پھیلاتا ہے..... بارشوں کے بعد منظر اتنا حسین ہوجاتا ہے کہ اس سے سمو کی صورت یاد آجاتی ہے..... خوب صورت بدن پہ ریشمی لباس ہے۔۔۔۔ اس کی صورت دور دراز سے آنے والے بادلوں بارشوں کی ہے..... گہری زلفوں کے جاد (پراندے) ہیں پتلی کمر تک، سمو تو صحت بخش پہاڑی درختوں کا میوہ ہے.....

''سمو شراب بھرا جام ہے، سمو کوہِ زین پر پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے..... سمو انار کا احمریں پھول ہے، سمو پہاڑی ہرن ہے، سمو اندھیروں میں چراغ ہے یا گھر گھر کر آنے والے بادلوں کی ایک بدلی ہے..... اس کی آنکھیں لال، جیسے مہندی دی ہوئی ہوں اور جیسے رات کو ہلکے بادلوں میں بجلی چمکتی ہو..... پرخمار آنکھوں سے ایسی سرخی چھلکتی ہے کہ عاشق جل جاتے ہیں..... تمہاری چال میٹھی، ہنسی نقرئی، تمہاری آواز جیسے صبح سویرے بجتا ستار..... سینے پہ تاویت جیسے بجلی کی چمک تالیاں بجاتی ہو..... کونج جیسی گردن پہ خمیدہ طوق، میری دوست کے سینے کی اترائیوں پہ تین تہوں والے تاویت لٹکتے ہیں.....، اس کی ہنسی کتنی شیریں ہے، آنکھ ایسی دلکش جیسے ہزار نوع کے سرمے لگا رکھے ہوں..... وہ نکلتی ہے اپنی شادی والے خیمے سے اور لال تاخ کی خوشبوئیں اس کا پیچھا کرتی آتی ہیں..... وہ اتنی خوب صورت ہے جیسے لیموں کے میوے ہوں..... اس کے دانت اس قدر خوب صورت ہیں گویا قطار میں برسنے والے سفید بادل ہوں..... میٹھے ہیں لب جیسے بھیڑ کا لذیز دودھ.....، سینے کے دونوں پھول کاٹ ڈالتے ہیں..... سرخ خماری آنکھوں والی سمو حسین ترین سہیلیوں میں بھی لعل ہے.....، سونے جیسے چہرے پہ کیا سجی ہوئی آنکھیں ہیں.....، ذرا سمو کی سی صورت کی کوئی دوسری عورت تو تلاش کر کے دکھاؤ،..... وہ پیسوں میں چاندی ہے، اشرفیوں میں سونا ہے..... اس کی چال کبوتروں کی ہے، اس کی زلفوں سے لونگ اور عطر کی خوشبو آتی ہے، وہ بال پیچھے باندھتی ہے..... سمو، جیسے بارشوں کے موسم کی ہلکی ہوا میں پتے لرزتے ہوں۔ اس کی

شاخیں (زلفیں) زامر کے درخت کی شاخوں کی طرح لمبی لمبی زمین کی طرف لہراتی ہیں.....، میری محبوبہ تازہ ہے، تازہ ترینوں میں سے تازہ ترین سے بھی زیادہ تازہ.....

''وہ میدانی ہرن ہے.....میں نے اسے علاقوں میں جھومتے دیکھا ہے.....تمہارے گھنے پراندے کے اوپر لگے ہوئے (زیور) سونے کے ہیں.....سموتو ایک لعل ہے، اس کی ساخت میں کہیں کوئی عیب کوئی بے ترتیبی نہیں، سارا ٹیڑھا پن جیسے ماہر تیشہ گر نے نکال دیا ہو، جیسے سارے بل (ماہر صناع نے) نکال دیے ہوں.....اس کی نشانی یہ ہے کہ آنکھوں کے کنارے سرخ ہیں، ناک ستواں ہے، ابرو باہم ملے ہوئے ہیں.....قربان جاؤں تمہاری نرم رفتاری پہ، شیریں قہقہوں پہ، تمہاری خوشبوؤں پہ، انہیں میرے بدن سے جدا نہ کر..... دونوں ہاتھوں کی مُندریاں آگ کی طرح فروزاں رہتی ہیں.....کشیدہ کی ہوئی قمیص کو جڑواں پستانوں نے اوپر تھام رکھا ہے.....وہ بلند وکٹھن چٹانوں پہ اُگا لونگ کا نازک پودا ہے۔ ایسی خوشبوئیں جیسے ھُمب کا پودا خوشبو دیتا ہو۔ انھی خوشبوؤں نے تو میرے سینے کی قاتل چبھن کو ٹھنڈا کر دیا اور میری آنکھوں کی تہوں سے پردے ہٹا دیے.....وہ تو شہنشاہی باغوں میں لیموں کا درخت ہے جس کی شاخیں اچھی ہیں اور رنگ وصورت مصری کی طرح میٹھی ہے..... سینے کے پھول (پستان) روح چھیننے والے ہیں.....اس کی پرخمار آنکھوں سے بجلیاں کوندتی ہیں.....وہ بہشت کے لیموؤں کی طرح لذیذ ہے، وہ مکران کے آم اور انگوروں کی سی شیریں ہے.....وہ پری ہے یا عرشی فرشتہ.....تمہاری چال سلامت رہے، حدیث جیسی گفتار سلامت رہے، قہقہے سلامت رہیں۔ میں تمہاری چال کی خاطر کوہلو اور کاہان بخش دوں گا۔ میں تمہاری چال کی خاطر اپنی آنکھیں قربان کر دوں گا.....

''وہ جنگلی ہرن کی طرح دور بھاگتی ہے، نوخیز مہریوں کی طرح تیز ہے، مدھر دھن والی شہنائی جیسی آواز، چندھیا دینے والی مہندی لگاتی ہے.....قریب المرگ مریضوں کو تندرست کرتی ہے، اڑتے ہوئے پرندوں کو ہاتھ سے پکڑتی ہے، پاگلوں مجنونوں کو صحت مند بناتی ہے، ہوش مند کو پاگل بناتی ہے۔ وحشی ہرنوں کو نرم رفتار بنا دیتی ہے.....''۔

****

سردیوں کے موسم میں ہم چھ آٹھ دوست کوئٹہ سے ڈیرہ بگٹی جاتے ہوئے رات کو جیکب آباد ٹھہرے۔ اگلی صبح ڈیرہ بگٹی جاتے ہوئے ساڑھے دس بجے ہماری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ سورج کی حدت سے جلائے ہوئے پتھروں اور پہاڑوں کے بیچ اس سرد موسم میں بھی اچھی خاصی گرمی لگ رہی تھی. پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی، پروفیسر بہادر خان رودینی اور پروفیسر عبدالرحمٰن فکر گاڑی کے سائے میں دبکے پناہ لیے ہوئے تھے۔ سامنے زین کا رعب دار اور بڑا پہاڑ تھا۔ میں نے عبداللہ جان سے کہا، ''ماما یہ تو سردیوں کا موسم ہے اِتنی گرمی لگ رہی ہے، گرمیوں میں کیا حال ہوگا؟۔ اور اگر جون جولائی میں جیکب آباد اور سبی سے ملحقہ اس گرم ترین علاقے میں آپ کو زین پہاڑ پر چار گھنٹے تک کی چڑھائی چڑھنی پڑے تو اندازہ کریں کیا حال ہوگا۔ اوپر چوٹی پر پہنچ کر اچانک پیپل کے بڑے بڑے سایہ دار درخت مل جائیں تو راحت کا پیمان کیا ہوگا؟۔ اور اگر پیپل کے ان گھنے درختوں کے نیچے ٹھنڈے پانی کا چشمہ بہہ رہا ہو تو اس تھکے ہارے گرمی زدہ مسافر کی فرحت کا تصور کر سکتے ہیں آپ؟''۔ تو ماما نے کہا، ''یہ تو تم پریوں کے دیس کا سماں باندھ رہے ہو''۔ میں نے کہا کہ ''مست نے اسی آتشیں کٹھن زین پہ ٹھنڈی شیریں ندی کے کنارے اگا ٹھنڈا سایہ دار پیپل، سمو کو کہا ہے۔''

شیئر

سمو ژہ زینئے پلپلاں یکے
سمو ژہ درشکانی براں یکے
سمو یہ شیشہ اے شراوانی
سمو یہ سروانے تلارانی (1)
سمو یہ سُر پلّے انارانی
سمو یہ ڈیوائے تہارانی
یا جڑی بوٹی اے رغامانی (2)

ریٹویں چم گوں کاغذیں رکاں
تیزیں چو کنڈھی آں بہوخیناں
شریں چو قطار بستغیں نوذاں
وہشیں چوبیشی شکلیں شیراں
سمو یہ ، ہنجیرے مزں تاخیں
رُستہ مں ارگونیں گروگٹاں
جکشہ درنگی ساسرے ساڑتیں
کوہ سرو کمبانی تڑا(3)رُستہ
ہندے ماں جے ھین ایں (4)گراں بیشہ
سر تئ ہچ گواثانہ چنڈینتہ
بڑزہ کنت ہونی رتکغیں چماں
شف گروخی گوں لاغریں شینکاں(5)
چم چوڈی او آں بلوخیناں
زلفے چو سیاہ ماراں تلوخیناں
سمو گوں چماں سُرخمارینا
(کہ) لالیں ژہ جیڈیاں ملیناں
ہنیژی (6) چوواسنگاں چھلوخیناں
ٹیلی (7) چوسرواناں ترہوخیناں
زواریں چو مہری آں رووخیناں
و جی چو شہنایاں دھمو خیناں (8)
لانٹہ کنت پرّایاں گروخیناں
جنت ہنّی آں شہم گروخیناں

دراہ کنت مرکھی (9) او مروخیناں
دستہ گیڑت بالی آں گزوخیناں
ہوشہ کنت بے ہوشاں گنوخیناں
ترند ہ کنت ریلی آں پھر وخیناں
آسکاں نرمہ کنت ترہوخیناں
ملغی ڈیل گوں ریشمی جراں
دروشماں دا چوتانہی نوذاں
چمے شراں گوں تنگویں دیما
بمبویں (10) جادگوں بارغیں سرینا
ترنداں(11) چو آمڑداثغیں(12) تیغا
(نیں)لاشکیں سمو گوں بز گلی مڑداں
بیثیں ژہ درگوشیں مہیری آں
ہندے بیثیں مں کور دفی بیٹاں
بیگھاں ترہ پولی کشے ہراں
رونگشے زڑدوآں سھا گیناں
دنز کشے تیرغ چڑتغیں بوراں

حاشیہ

[1۔سل جیسی چٹان 2۔بادل 3۔کنارے 4۔بلند 5۔پتلی لکیر جیسا بادل 6۔آواز سے سانس لینا 7۔بدک کر بھاگ جانا 8۔روانی سے بجنے والا 9۔قریب المرگ 10۔موٹے موٹے 11۔تیز 12۔آبدار (آگ میں سرخ کر کے یکدم پانی میں ڈال دینا]

ترجمہ:

سمو کوہِ زین کے پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے
اک میوہ درختوں کا ہے سمو
شیشی شراب کی ہے سمو
ہرنی چٹان کی ہے سمو
سرخ پھول انار کا ہے سمو
ظلمتوں میں چراغ ہے سمو
یا بادلوں میں سے ہے ایک ممتاز ٹکڑی
بڑی بڑی آنکھیں، ہونٹ باریک کاغذی
تیز ہیں جیسے قاتل تلواریں
خوب صورت جیسے کہ قطار بندھی بارشیں
شیریں جیسے بھیڑوں کا لذیذ دودھ
سمو ہے انجیر کے بڑے پتوں والا شجر
اگا ہے جو نا قابلِ عبور بلند پہاڑوں پر
ہے جس پہ چٹان کی ابدی چھاؤں سایہ گُستر
ہے کوہساروں کے بیچ جھیلوں کے کنارے پھولی پلی
مسکن ہیں جس کا گھاٹیاں گہری
کوئی ہوا نہ جھنجھوڑ سکی شاخوں کی چوٹیاں تیری
اٹھاتی ہے (دعا کے لیے) خون میں رچی آنکھیں
تو جیسے ہلکے بادلوں سے رات کو بجلیاں جھانکیں
آنکھیں جلتی چراغ جیسی روشن
زلفیں لہراتے سانپ جیسی

سمو کی آنکھیں ہیں سرخ، ہوں جیسے خمار میں
ممتاز ہے وہ انمول سہیلیوں کی قطار میں
اڑتے اژدھوں کی سی اس کی پھنکار
بھرتی ہے چوکڑیاں جیسے بدکی ہوئی غزال
تیز رفتار مہریوں کی شتر سوار
آواز جیسے شہنائیوں کی جھنکار
چمکتی ہے لپکتی بجلیوں کی طرح
ہاتھوں میں جاذب حنا
قریب المرگ مریضوں کو بخشتی ہے شفا
پکڑتی ہے اڑتے پرندوں کو بڑھا کے ہاتھ
بخشتی ہے نادانوں کو ادراک
کرتی ہے آوارہ فقیروں کو تیز رفتار
بدکے ہوئے آہوؤں کو بناتی ہے نرم رفتار
ریشم میں ملبوس خوبصورت چال والا بدن
دور سے آئے ہوئے بادلوں سا حسن
سنہری آنکھیں چہرے پر ہیں سجتی
گھنے گیسو، کمر پتلی
آب دار تیغ کی سی چستی تیزی
نہیں جچتی سمو بکری والوں کے پاس
اُسے تو ہونا چاہیے تھا بالیاں پہنے مہریوں کے ساتھ
مسکن ہوتے ندیوں کے کنارے موجود میدان
سرِ شام شتر بچے چوکڑیاں بھرتے

دودھ پلاتی اونٹنیاں اپنے بچوں کے لیے بلبلانے کی آوازیں نکالتیں
اناج کھاتی پھرتیلی گھوڑیاں گردوغبار اڑاتیں

****

ماما کا حیرت سے چہرہ بدل گیا۔ وہ گم سم ہو گیا.....اور بالآخر اس نے صرف اتنا کہا کہ ''مست، زین کوہ سے بھی بلند مرتبہ شاعر ہے''۔

مست عظیم ہے کہ اُسے اس بات کا ادراک ہے کہ حسن تعریف کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔ بلا شبہ حسن مقدار نہیں، معیار ہوتا ہے۔ حسن وہ دوشیزہ دیوی ہے جس کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں۔

عشاق اپنی دوست کے حسن کی توصیف اپنے اپنے انداز میں کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں کئی لوگ یہ کام بہت ہی فطری انداز میں بلا تصنع اور بے ساختہ کرتے ہیں۔ اور، مست انھی عشاق وشعرا میں سے ایک ہے۔ بلا کی بے ساختگی ہے اُس کے ہاں۔ حسن کا اُس کا بیانیہ بہت ہی ڈائریکٹ، واضح اور حتمی ہوتا ہے۔ نقطہ نظر بہت سادہ۔ اُس کے تصورات فطری طور پر اس کے اردگرد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مست تو خانہ بدوش زمانے کا عاشق وشاعر ہے۔ فطرت اور فطری حسن، اور سادگی ہی اس کے سکون کو قتل کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

مست اپنے محبوب کے حسن کو مکمل پاتا ہے.....حسن تو مکمل ہی ہوتا ہے۔

اور محبوب کا حسن صرف محبّ ہی تلاش کر سکتا ہے۔ صرف وہی اس کی داد دے سکتا ہے، وہی اس کی بلائیں لے سکتا ہے اور وہی اس پہ جان دے سکتا ہے۔ دوسری ساری خلقت عامی بن جاتی ہے، اُمی بن جاتی ہے۔ دوسروں کی آنکھیں وہ ویوز پکڑ ہی نہیں سکتیں، رسیونگ سٹیشن جام ہو جاتا ہے سب کا۔ ایک ہی وجود، اور اس کا ایک ہی ثناخواں۔ دوسروں کو بے شک وہ کالی، بھینگی نظر آئے، توتلی، قبیح نظر آئے۔ مگر محبت کرنے والا اسے کامل ہی دیکھتا ہے۔ مست کی سمو تو ویسے ہی تقدیس بھری تھی۔ وہ تو خلیاتی سطح تک کامل تھی، وہ تو نئی سے بھی نئی تھی.....حتمی مکمل، مکمل مکمل۔ کہیں کوئی ٹیڑھ، کوئی جھول، کوئی نقص نہ تھا۔

دوازدہیں بنداں نیستنی عیوماں انگھاں

اس کے کسی بھی عضو میں کوئی عیب نہیں

المختصر، مست اپنی سمو کو لاثانی قرار دیتا ہے۔ سمو کی کوئی اور مثال نہیں، کوئی اور نظیر نہیں۔

سملئے لوڑاں تی جنے کاہانا نہ خاں

سمو کی مدھر چال والی کوئی دوسری عورت کاہان میں کبھی نہ ہوگی

اور.....

پولغا سموئے بدل پیداشہ نواں

ڈھونڈو بھی تو سمو کا ثانی نہیں ملے گا

مست بلوچی الفاظ استعمال کرتا ہے، اس کی امثال، ضرب الامثال، استعارے، تشبیہات، سب بلوچی زبان اور بلوچی سماج کے وسیع خزینے کے موتی ہیں.....حسن اور بلوچی ہم معنی، ہم جولی اور ہم سفر۔ بلوچی سادہ، بلوچی فطرت کے قریب، بلوچی سچی، بلوچی بھاری، بلوچی معزز، بلوچی شیریں، بلوچی موسیقیت، بلوچی شہد وشیر، بلوچی عمیق.....بلوچی بہت بڑی زبان ہے۔ اس بڑی زبان کے لیے شایانِ شان تھا مست، اور شایان شان تھی دوستِ مست۔ اور شایانِ شان تھا حسنِ دوستِ مست!!

****

سمو کی عمر

ایک طویل عرصہ تک چلنے والی اس محبت میں ظاہر ہے سمو کی عمر بڑھتی گئی۔ مگر مست نے ایک جگہ (غالباً بہکنے والی ساعت میں اس کے سولہ سالہ ہونے کا ذکر کیا ہے)۔ سولہ سال کی محنت کش جوانی، حشر سامان ہوتی ہے۔

قد

دنیا بھر میں محبوبہ کے حسن میں قد کاٹھ کی بڑی اہمیت رہی۔ مست کی محبوبہ تو کہیر کے درخت کی طرح لمبی ہے، ناگ کی سی شان میں چلتی ہے مون سونی ہواؤں میں۔ بس دیکھ کر لوگ پاگل و بے ہوش ہوں:

گندغاں بے ہوشہ پھرنت مستال
(اسے دیکھ کر دیوانے بے ہوش ہو جاتے ہیں)

مست، سمو کے قد و قامت کو عمومی طور پر ''ملّغی بالاذ'' کے نام سے بیان کرتا ہے، جس کے معنی ہیں؛ ''حسین چال والی قد و قامت''۔ وہ اوزان و پیمائش کی بجائے اِس کوالی ٹیٹو مظہر کو ایک لفظ عطا کرتا ہے جو شاید ہر عاشق اپنی محبوبہ کے لیے استعمال کرنا چاہے گا: ''وش قد'' (خوش قد)۔ ایسا قد جو آپ کو اچھا لگے۔

سیمیں بدن محبوبہ کے قد کی بات جام بھی کرتا ہے اور ''میری پری صورت، ہنج'' کی بات کس خوب صورتی سے کرتا ہے:

صنوبر کی کیا مجال کہ اس کے مقابل آئے
شمشاد کی کیا حقیقت کے اس کے آگے دَم مارے

بدن

اور پھر سمو کا بدن۔ مرمریں دمکتا سیمیں بدن، مملکت روم کی سائیکی، یونان کی وینس، کالی داس کی شکنتلا، لوک کہانیوں کی پری.....سب کچھ، ہیچ ہے سمو کے بدن کے آگے۔ سمو تو ایسی لعل ہے

جس کے جسم کے کسی عضو میں کوئی کمی کوئی عیب نہیں ہے۔ اسے تو کاریگروں نے بہت متناسب تراشا ہے، جیسے تیشہ لے کر ایک ایک ٹیڑھ نکال دیا ہو۔ اس کی اٹھلاتی چال مورنی کو شرماتی ہے۔ سندریوں کی سندری ہے سمو۔ بدن اور چال، بدن اور لوچ، بدن اور زاویے، بدن اور خم۔

ریشم میں ملبوس چال والا لچکیلا بدن
وہ تو ''مکنائیں'' لباس پہنتی ہے
ململ کی اوڑھنی میں چلی آتی ہے

لچکیلے بدن پہ لباس تو ریشمی ہی مناسب ہے۔ ملے نہ ملے۔ ململ کا لفظ مجھے محبوبہ کے ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔

سر اور گیسو

سمو سر گوں چُنڑی آں

چُنی (چنری) ایک زمانے میں بہت قیمتی سری (چادر) ہوتی تھی۔ مجھے اردو کا ''دوپٹہ'' کبھی بھی بلوچ روایتی ''سری'' کا ہم معانی نہیں لگا۔ دونوں کے طول و عرض، اور موٹائی اور پتلائی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوپٹہ کا سر پر ہونا بالکل ضروری نہیں ہوتا جب کہ بلوچ سری سر، گردن، شانوں سے لے کر گھٹنوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

اور پھر چُنی تو بہت رنگوں، ڈیزائنوں سے مسجّ و مرصع سر ہوتی ہے۔ چُنی کو مزید دلکش و خوب صورت بنانا ہو تو چُنڑی کہا جاتا ہے۔ اور مست کی سمو کے پاس ایک چُنڑی تھوڑی تھی!، اُس کے پاس تو چُنڑیاں تھیں۔

زلف کی بات چھڑے تو ہمیں مست سے قبل جام کا تذکرہ کرنا پڑتا ہے۔ اُس سے قبل بیورغ کا، اُس سے قبل شہ مرید کا۔ مگر موضوع مست ہے بس اُس کے مرشد جام کا ایک مصرعہ سن کر آگے بڑھتے ہیں؛

سنگین و سیاہ مار چوٹویں

(سنگین وسیاہ مارزلفوں والی)

حسن کافرساز ہوتا ہے۔ یہ وہ کافر ہے جو کافر کو ولی بناڈالے۔ ولایت اور حسن، حسن اور فلاسفر، حسن اور مجنون، حسن اور شاعری، حسن اور مست.....آپ جوڑیاں بناتے جایئے، حسن زندگی کے ہر انسانی روپ کا سبب ہوگا۔ مگر یہ چوں کہ ایک الگ موضوع ہے اور بہت ہی نازک و باریک موضوع ہے، اس لیے اس کی شان میں گستاخی کے ڈر سے یہاں سے فرار ہی بھلا۔ میں فی الحال آپ کو علم وحلم کے آسمان کے نجمِ اعظم شیخ سعدی کے دربار میں حاضر کرتا ہوں جو آپ کو اپنی محبوبہ کی زلفوں کی انجمن دکھائے گا:

ولولہ در شہر نیست ، جز شکنِ زلف یار

فتنہ در آفاق نیست، جز خمِ ابروئے دوست

نطق و بیان کی ایک اور پیغمبر بھی ہیں ہمارے پاس.....جی ہاں، قراۃ العین طاہرہ۔ اس کی محفل میں دوزانو ہوئے بغیر مست کا تذکرہ تشنہ سارہ جائے گا، زلفوں کی توصیف نامکمل رہ جائے گی:

اگر بباد دھم زلفِ عنبر آسا را

اسیرِ خویش کنم آھوانِ صحرا را

ترجمہ:

اگر میں اپنی زلفِ عنبرین کو ہوا میں جھٹک دوں

تو صحرا کے آہوؤں کو اپنا اسیر بناڈالوں

یہ جو ''سنگین و سیاہ مار'' زلفیں ہوتی ہیں، ناں، یہ بھلائے نہیں بھولتیں، یہ عاشق کو ''ول ول قتل'' کرتی جاتی ہیں۔ یار کوئی زلفیں ہیں؟۔ دیکھو تم نے سیدھی کھڑی دو چار سو گز کی چٹان اگر دیکھی ہو، اُس کی چوٹی پر ایک گھنی اور ڈارک گرین پودا اگتا ہے جو اوپر نہیں جاتا بلکہ چٹان کی ڈھلوان کے ساتھ نیچے کی طرف اڈتا بڑھتا رہتا ہے۔ وہ ہے: زامر۔ ایک پورا سلسلہِ کوہ ہے

بلوچستان میں ''زامران'' نام کا۔ کتنے لوگوں نے اپنی اولاد کا نام اِس ملکوتی پودے پر رکھا ہوتا ہے۔ اب مست کی محبوبہ کے بدن کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف آتی گھنی زلفوں کو آپ زامر نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے؟۔ آہ، توکلی کی کیفیت نگاری کسی قسمت والے ہی کو نصیب ہوسکتی ہے۔ حیات بعد الموت سلسلہ چلتا جائے، کوئی انت نہیں، کوئی انتہا نہیں۔ شاعر انھی مظاہر کو دیگر ارکانِ حسن کے ساتھ مترادفات بنا بنا کر، متضاد تلاش تلاش کر کے بیان کیے جاتا ہے۔ نئے نئے رنگ وضع کرتا جاتا ہے، نئے نئے شیڈز تخلیق کرتا جاتا ہے.....اور یہ زلفیں جب پتلی زنبور جیسی کمر پر گرتی ہوں اور پھر وہ ناز و ادا سے اٹھلا کر چلتی ہو تو پھر تو عاشق تو پانی بھی نہ مانگے!!

بمبویں جادگوں بارغیں سرینا

تُرنداں چو آمڑ داثغیں تیغاں

ترجمہ:

گہری گھنی زلفوں کے پراندے پتلی کمر

زہر میں بجھی بدکتی تلواروں کی مانند ''ترند'' (تیز دھار)

الفاظ کا دَھنی ہے مست، لغت کا غنی ہے مست، امثال کا پروپرائٹر ہے مست.....

مست خزانچی ہے بلوچی زبان کی ساری وسعتوں کا۔ ابھی آپ بلوچی لفظ ''تُرند'' کے مزے لے رہے تھے، ابھی میں آپ کو اس کے اگلے شعر میں زلفوں کے لیے ''زِور'' کی چاشنی چکھاتا ہوں۔ ابھی آپ ''آمڑ داثغیں'' تیغوں کی ہلاکت آمیزی میں گم سم تھے، اب آپ کو ''کُنڈھی آں بہوخیناں'' کا زخم لگواتا ہوں۔ صرف یہی نہیں میں تو آپ کو بدک کر بھاگتے ہوئے سانپ کے لہرانے کے منظر میں ہپناٹائز کرتا ہوں۔ آیئے، آیئے مست کی کیفیات کے زخمی بن کر سرور وانبساط میں کھو جایئے:

دیم چوڈی او آں بلوخیناں

زلفاں چو سیاہ ماراں تر ہوخیناں

بر یں چو آہو آں تشو خیناں

زِوریں چو کنڈھی آں بہوخیناں

ترجمہ:

چہرہ جیسے روشن چراغ
زلفیں جیسے بدکتے مار
بّر جیسے تیز رفتار آہو
تیز جیسے تیغِ براں

زلف کا ڈنگ کھانا اور کھاتے رہنا صرف مست کی تقدیر ہی نہیں ، اُس کا انتخاب بھی ہے۔ وہ اسی مشروب سے مسرور ہوتا ہے، ہونا چاہتا ہے۔ کچھ اور تو اُسے جچتا ہی نہیں، کچھ اور تو اُسے دِکھتا ہی نہیں، کچھ اور تو اسے بھاتا نہیں۔

اور کس قدر خطرناک ہوتی ہے محبوبہ، خطرناک ہوتا ہے اس کا حسن اور خطرناک ہوتی ہیں اس کی زلفیں۔ ہمارا سعدی رحمتہ اللہ علیہ تو یہاں تک جاتا ہے:

سلسلہِ زلفِ دوست حلقہِ دام بلا است
ھر کہ درایں حلقہ نیست فارغ از ایں ماجرا است

چہرہ

چہرہ ایسا ہے جیسے شاعر کی ''کلیات'' ہو۔ غزل، لیلیٰ مور، نظم، داستانغ، لیلڑی، ڈیھی، زہیرونک، لولی، چاربیتی، اور سانیٹ پر مشتمل کئی الگ الگ کتابوں کو یک جا کر کے کتابی شکل دینا۔ چہرہ اور وہ بھی خاتون کا چہرہ بہت سی گلستانوں، وادیوں، سمندروں، کوہستانوں، رنگوں، صوتوں، صداؤں، خوشبوؤں، اور شعاؤں روشنیوں کا وطن (کلیات) ہوتا ہے۔

مست جزئیات سے بہت کم باہر نکل سکا تھا۔ جزئیات سے باہر آپ نکل ہی اُس وقت سکتے ہیں جب آپ فاصلہ زیادہ رکھیں۔ دور ہوتے جائیں تو آپ جزئیات کی تجلی سے محروم ہوسکیں گے اور عمومی چاند چہرہ دیکھ پائیں گے۔ محبوبہ کا چہرہ دیکھنا، ایک طائرانہ دیکھنا ہوتا ہے۔ اور مست، سموکی محبت میں ڈوبا مست، جزئیات ہی میں بندھا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں چہرہ کا تذکرہ زیادہ

نہیں ملتا، چہرہ کے مندرجات کا بہت ملتا ہے۔ ''روشن چراغ'' ہی ممکنہ الفاظ ہیں جو وہ استعمال کرتا ہے۔

بروان (ابرو)

اب زیادتی تو کر رہا ہوں کہ ''ابرو'' کی سرخی لگا کر لکھنے بیٹھا ہوں۔ ہے ناں غیر جمالیاتی حرکت !!۔ میرے پاس لٹریچر میں ابرو کے بے شمار تذکرے موجود ہیں لیکن سوچتا ہوں کہ ابرو کو پیشانی، آنکھ اور ناک سے الگ کر کے دیکھنے سے زیادہ ناجائز بات نہیں ہوسکتی ہے۔ بس (''برونت اوار'' ابرو باہم آن ملتے ہیں) والا لفظ لکھ کر یہاں سے بھاگ جاتا ہوں۔ کچھ اٹوٹ و ہم بستہ و پیوستہ چیزوں کو جدا کرنے کا کفارہ ادا ہی نہیں ہوسکتا۔

آنکھیں

محبوبہ کے چہرے پہ سجی حسین آنکھیں، اُن کے بیچ ستواں ناک..... چھوڑیے بھئی۔ اپنی نااہلی کو تسلیم کرنے میں کیا شرم۔ میرے بیان سے باہر ہے۔ اور جب بیان کلام کے مالک مست کا ہو، اور موضوع ''سموکی آنکھیں اور ناک اور ابرو'' ہوں اور ناک میں ''سبز چادر کے قریب پلوہ رقصاں ہو'' تو کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، بہتا بیجی بھی تھم جائے۔ میرے دیس کے تمام شاعر مست کی روحانی آشیرباد لیے بغیر ایک مصرع تک کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ میں کیا میری اوقاتِ قلم کیا۔ سنیے، مست کو سنیے:

نشک و پار ایشنت سُہرنتی چمانی لوار
شیفغیں پونزے سملئے بروانت اوار

ترجمہ:

نشانیاں اس کی یہ ہیں کہ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہیں
ستواں ناک ہے سموکی اور ابرو باہم ملے ہوئے

آپ سمجھے ابرو کی اب کی اہمیت اور تب کا تذکرہ؟

یہ جو مست ہے ناں، یہ آپ کو لگ جائے تو پھر چھوٹتا نہیں۔ اس کے ہاں محبوبہ کی ''بڑی

بڑی آنکھیں تو کوہستانوں میں ٹھوکریں کھلواتی رہتی ہیں''۔اور یہ کیفیت کسی آرام دِہ کرسی اور میز پہ بیٹھ کر تصورات کے گھوڑے دوڑانے والے کی نہیں، ایک اَن پڑھ، نیم ہوش تڑپتے بھاگتے ٹھوکریں کھاتے رہنے والے مست کی ہے۔ اس لیے سائیں، آپ ایک ناول نہیں پڑھ رہے، ایک سرگزشت دیکھ رہے ہیں۔تبرک تقدس کا فرق دیکھو ایک ناول کی کیفیت نگاری اور ایک آپ بیتی کے بیانیہ میں!!۔

اور مسافت (نیز زمان) میں کہیں بہت دور قراۃ العین طاہرہ نے یوں کہا تھا:

وگر بہ نرگسِ شہلائے خویش سرمہ کشم
بروزِ تیرہ نشانم تمام دنیا را

ترجمہ:

اگر اپنی نرگسی آنکھوں میں سرمہ ڈالوں
تو دن کے وقت ہی تمام دنیا اندھیرے میں ڈوب جائے

مست کی محبوبہ کی آنکھیں اس کی ہم وار اور وسیع پیشانی پہ ہرن کی سی ہیں، قدح جیسی ہیں، اور کبوتر جیسی سرخ ہیں۔

ابرو.....چنچل ابرو۔کھنچی تنی ابرو، اور جام درک کے بقول ابرو سیستان کے کمان کی مانند مژگان ناوک کی طرح ہیں۔آنکھیں.....مست و مخمور آنکھیں، آہو چکور کی آنکھیں، بڑی بڑی آنکھیں، چمکتی آنکھیں.....سمو کی آنکھیں۔

ارے آپ نے مہندی لگی آنکھیں کبھی دیکھی ہیں، کبھی سوچی ہیں؟۔موٹی سفید آنکھوں پہ سرخ ڈورے؟ ارے ہیومن اناٹومی دوبارہ پڑھو.....اور سرخی بھی ایسی کہ ''عاشق جل کر بھسم ہو جائیں''۔اور پھر انھیں انواع واقسام کے ''سرموں سے سجایا جاتا ہو''۔

بریخہ کس چماں گوں ہزار لونیں سیر مغاں (ہزار قسم کے سرمے سے آنکھیں سجاتی ہے)

''ایسی سرخ خماری آنکھیں سمو کو حسین ترین سہیلیوں میں بھی'' ممتاز بناتی ہیں۔

سمو گوں چماں پرخمار یناں (سمو خمار بھری آنکھوں کی مالکن)

یہ ''چمکتی'' آنکھوں کا میں ضرور ذکر کروں گا۔مست کہتا ہے، ''سمو کی پرخمار آنکھوں سے بجلیاں کوندتی ہیں''۔

آنکھ بلور کی طرح چمکے نہیں تو ڈاکٹر اُس انسان کو مردہ قرار دیتے ہیں۔آنکھ کی چمک زندگی کی علامت ہوتی ہے۔آنکھ خواہ نوخیز ہو، جوان ہو یا بوڑھی، اس کا چمکتے رہنا ضروری ہوتا ہے؛ دید کے لیے بھی، دیدن کے لیے بھی۔

مست کی محبوبہ کی آنکھیں صرف موٹی، پرخمار، سرمہ آگیں ہی نہ تھیں تجلی بکھیرنے والی بھی تھیں۔بجلی بکھیرنے والی آنکھیں.....بجلی یہ ہماری والی نہیں جس کا ہر ماہ بل آتا ہے۔مست تو بادلوں والی بجلی کی بات کر رہا ہے۔بلوچی میں اس کے لیے ''گروخ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اردو میں شاید اس کا نعم البدل لفظ موجود نہ ہو۔آپ نے ''کم بارشوں والے'' بلوچستان کا بشام (ساون) دیکھا ہے۔اُس بادل کی بجلیاں دیکھیں جو تواتر کے ساتھ اپنے حسن کے ساتھ لولاک کو سحر انگیز بناتی جاتی ہیں۔دنیا کی ایک حسین ترین چیز۔

مگر ہم مست کی بات کر رہے ہیں۔آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ آنکھیں محض دلکشی کا اوزار تھیں؟۔نہیں نہیں، یہ تو اُس کے لیے گروخ نہیں ''نپت'' (آسمانی بجلی) تھی۔

ناک

میں ذرا بلوچی کی جوڑی بناتا ہوں، بلوچ مزے لیں، اردو ترجمہ بعد میں کروں گا: سمو پونز گوں پُلڑی آں (سمو کی ناک پہ پُلی نامی زیور)۔یہ تین لفظ ہیں: سمو، پونز اور پُلّی۔ہاں مجھ اور آپ جیسے عشق سے تقریباً تقریباً نابلد لوگوں کے لیے یہ تین لفظ ہیں۔مگر مست کے لیے؟۔بابا، اُس کے لیے تو یہ مسلسل بمبارٹمنٹ ہے ''ڈیزی کٹر'' بموں۔سنبھلو، گرو، سنبھلو گرو۔پھر سنبھلو، پھر گرو.....لامتناہی.....

شیریں دھن

سمو کی پیشانی ہو، ابرو اور آنکھیں ہوں، اور ان کا کمبی نیشن ہو ستواں ناک کے ساتھ،

سرخ گالوں کے ساتھ، پتلی صراحی دار گردن کے ساتھ، گھنی لمبی زلفوں کے ساتھ، کاغذ کی طرح باریک اور بیر کی طرح سرخ ہونٹوں کے ساتھ:

ریٹویں چم گوں کاغذیں رکاں (بڑی بڑی آنکھیں کاغذی باریک ہونٹوں کے ساتھ)

اور ہونٹ: وشّاں چومیشی شکلیں شیراں (میٹھے ہیں جیسے دنبی کا لذیذ دودھ)

مست اپنے کلام میں جنگل کے اندر منگل کر دیتا ہے۔ پشتو کا خوش حال خٹک بھی تو یہی کچھ کہہ گیا:

میں نے پوچھا کہ میٹھی قند کی کان ملے گی کہاں
محبوبہ نے اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں، یہاں

مست مگر، ایک دوسرا منظر نامہ بھی دیتا ہے، ذرا دیکھیے:

'سمو کے ہونٹ لُو کی طرح جلاتے ہیں!'

تفصیل مجھ سے بیان ہوتی نہیں، الغرض مست کے ہاں لب و رخسار کے حسن کی انتہا کے لیے اصطلاح ہے: سمو۔

بلوچ کے ہاں حسن کے تصور میں دانتوں کا جو مقام ہے، اسے بھی دیکھئے۔ موتیوں جیسے دانت، ''کُشک'' کی طرح سفید جیسے سمندر کے مروارید، جو ہونٹوں کے درمیان چمکتے ہیں، اس حسین چہرے پہ ہنسی کیسی ہوگی۔

جام:

کندیث ورشاں مروارد (ہنستی ہے تو موتی جھڑتے ہیں)

نقرئی ہنسی ہے سمو کی، کتنی شیریں ہے!۔ شیریں قہقہہ سمو کے چمکتے ہوئے دانتوں کی قطار مست جیسے ہمہ وقتی عاشق کے دل میں اجالے کے ایک ہار کی طرح دکھ کو درد کو، پیار کو اکساتی ہیں۔ ''اُس کے سیپی جیسے دانت شورہ کی طرح جلا ڈالتے ہیں۔ دانت جیسے قطار بنا کر برسنے والے سفید بادل ہوں۔ مست کی محبوبہ درگفتار ہے''۔

ھاتھ

''لیلویں دست'' کا ترجمہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ چاہے تو لیلیٰ سے منسوب کریں، یا چاہے تو سادہ انداز میں نزاکت وحسن کا اظہار یہ لفظ ہے۔ جزاک اللہ جام، جزاک اللہ مست۔ تم لوگوں پہ خدا مہربان ہوا۔ تم ہم پہ مہربان ہو جاؤ کہ ہم تمہاری محبوباؤں کے حسن کی توصیف کی کھلی کچہری لگائے بیٹھے ہیں۔ مست، تمھیں تو پتہ ہے ناں کہ تمہاری سمو ہی ہماری سفارش ہے۔ وہ جو انسانوں کی خیر مانگتی ہے، ہمہ وقت دست بہ دعا رہتی ہے:

بڑزہ کاں چماں پُر خمارینا
بڑزہ کاں ہنی رتکغیں دستاں

ترجمہ:

وہ دعا کے لیے اوپر اٹھاتی ہے پرخمار آنکھیں
کرتی ہے بلند مہندی رچے ہاتھ

مہندی رچے ہاتھوں کی بات ہو رہی ہے تو یہ بھی واضح ہو کہ سمو کے ہاتھ بن زیور کبھی نہ تھے۔ مست کی محبوبہ کی انگلیاں کیوں ننگی ہوں؟۔ ایک آدھ انگلی نہیں، دونوں ہاتھ زیوروں سے بھرے تھے۔ اور وہ ایسی ویسی انگوٹھیوں سے ڈھکی نہ تھیں، ارے بھئی وہاں تو:

دوئیں دستانی مندری چو آسی بلاں

(دونوں ہاتھوں میں مندریاں شعلوں کی طرح فروزاں رہتی ہیں)

گردن

عالمی ادب بھرا پڑا ہے محبوبہ کی گردن کی توصیف سے۔ آسمانوں میں بیٹھا دوست اگر ساٹھ سالہ شعور کے ساتھ ایک دو جنم اور عطا کرتا تو میں اپنے قاری کے لیے عالمی ادب کے یہ موتی یہاں جمع کر لیتا۔ مگر اِدھر تو بات ادھوری ہی کرنی پڑے گی۔ مست تو کلی نے اپنی سمو کو کہیں

آ ہوگردن کہا، کہیں کونج گردن:

کاٹکیں توخ مانیں ماں کونجیں گڑدنا

(اس کی کونج سی گردن میں گول توخ ہے)

سمو گٹ گوں بر گڑی آں

(سمو کے گلے میں برگڑی نامی بلوچی ہار ہے)

مَس گوئرئے کَنڈی آں ہزارانی

(اس کے گلے میں ہزاروں کلداروں کی کنڈی نامی بلوچی ہار ہے)

****

یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مست توکلی بلوچ ثقافت کی شیرین وشفاف جھیل میں کانوں تک غرق رہا۔ بلاشبہ وہ سندھ و ہند گھوما، بے شمار فقیروں، پیروں، فلسفیوں، مفکروں، منطق والوں سے مباحثے کیے، مگر اس نے اپنی شاعری کی بنیادیں اپنی بلوچی ثقافت کے تاروپود پہ ہی استوار رکھیں۔

بلوچی شاعری کے اندر نسوانی حسن کے حوالے سے پستان اور سینے کا بہت ہی اہم حصہ رہتا ہے۔ ہمارے میدانی پڑوسی بالخصوص اردو میں اس کا تذکرہ بہت پردے میں ہوتا ہے۔ اس لیے جن لوگوں کی پرورش بلوچ ماحول میں نہ ہوئی وہ اپنی پیشانی پہ پڑی شکنوں اور پسینے کے قطروں کے آشکار ہونے پر ہمیں درگزر کردیں۔ بلوچی شعر وادب میں حسن کے اس بڑے عنصر کا ذکر بہت ملتا ہے۔ ہمارا مست تو اپنی محبوبہ کے سینے کے روح کش پھولوں کا بہت بھاری اور گراں قدری سے تذکرہ کرتا ہے۔ کہتا ہے:

جیغ کڑوئیاداشتغا دکانیں گراں

سینغئے تاویت چوگروخ تاڑی آں جناں

یا.....

ترجمہ:

کشیدہ کی ہوئی گریبان کو جڑواں پستانوں نے اوپر اٹھا رکھا ہے

سینے کی تاویتیں باہم ٹکرا کر تالیاں بجاتی ہیں جیسے گروخ کرتے ہیں

اِسی طرح یہ دیکھیے:

سئے تلیں تاویت ژلّاں ماں دو ستئے ڈوبرا

(تین تہوں والے تاویت محبوبہ کے سینے پہ لٹکتے جھولتے ہیں)

یا.....

سینے کے دونوں پھول کاٹ ڈالتے ہیں۔!

تذکرہ کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ اس لیے کہ دیکھ رہا ہوں کہ اکیسویں صدی انیسویں صدی سے شرما رہی ہے، لہٰذا آگے بڑھتے ہیں۔

الحان

محبوبہ کی آواز کیسی ہوتی ہے؟ ہم عام اُمّی لوگ کیا جانیں خوش الحانی کیا ہوتی ہے؟۔ آواز کی مٹھاس کیا ہوتی ہے.....تو کیا کیا جائے؟۔ صوت کے سپیشلسٹ سے رجوع کیا جائے۔ سمو کے مست کے پاس جایا جائے جو قلندر وسرور کے درباروں میں موسیقار فقیروں کا روم میٹ رہ چکا تھا۔ جسے شعر وموسیقی، آہنگ وہم آہنگی کا زبردست شعور حاصل تھا۔ وہ خود شعر کی صورت گیت کہتا تھا، سرینڈا کی صورت نغمہ بجاتا تھا اور دل چیر کر رکھ ڈالنے والے سوز کے ساتھ گاتا تھا۔ مست، محبوبہ اور موسیقی، تین میموں کی Trinity کے مالک ہیں بلوچ لوگ۔ خود ترنم کا یہ دیوتا مست، سمو کی آواز کو اس طرح بیان کرتا ہے:

سمو تئ ٹوکاں چو ستار وجاں بانگھواں

(سمو، تمہاری باتیں ایسی میٹھی جیسے سحر گاہ میں بجتا ستار)

چال

محبوبہ کی مستانی چال کو ہر عاشق دیکھتا ہے، توصیف کرتا ہے مگر اُسے بیان تو صرف ابوالکلاموں کا ابوالکلام، مست ہی کرسکتا ہے۔آہ چال، یار کی چال، کبوتر کی چال۔اس چال پر مست کا وجود قربان، مست کا وطن قربان۔آیئے اپنی محبوبہ کی چال (بقول مست میٹھی چال) کی توصیف کے لیے الفاظ، مست کے بینک سے قرض لیتے ہیں:

جی پہ تئ نرمیں جزغو وہشیں کندغاں
جی پہ تئ لوڈان وحد یثان و کندغاں
جی پہ تئ لوڈاں کولواو کاہانہ دیاں
پہ تئ لوڈاں مس کناں قرباں دیذغاں

ترجمہ:

قربان تمہاری نرم خرامی کو اور میٹھے قہقہوں پہ
قربان تمہاری چال، تمہاری گفتار، تمہاری ہنسی پہ
قربان تمہاری چال، جس پر کوہلو اور کاہان قربان
تمہاری چال پہ میں کر دوں اپنی آنکھیں قربان

اور سمو کی چال کو کس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے..... کبوتر سے؟۔مگر مست ہم سب سے الٹا بیان کرتا ہے: سمو کبوتر چال نہیں، کبوتر سمو چال ہے۔

لوڈ تئ سمو گوناں گوں کہنی کونتراں
(سمو تیری چال کبوتروں نے اپنالی ہے)

خوشبو

اوپر کے چار مصرعوں کے جادو سے جاگ جایئے تو اگلی بات کروں۔

ان مصرعوں کو دوبارہ، سہ بارہ پڑھیے تو دوسرے دائرے میں آپ کو لے جاؤں، گہری متاثر سانسوں کا دورہ پڑنے والی آپ کی کیفیت دور ہو تو آپ کو خوشبو بھرے اس مصرعے کی طرف لے جاؤں۔معطر مصرع جو بلوچستان کے علاوہ روئے زمین پہ کہیں اور نہیں ملے گا۔مست کے علاوہ کہیں نہیں ملے گا۔وہ مصرع ہے:

بوئے وہشیں چو گوئرتغیں نوذانی پذاں

ترجمہ:

تمہاری خوشبو اس قدر میٹھی ہے جیسے بارش برسنے کے بعد
گل زمین کی خوشبو ہوتی ہے

بلوچستان .....کم یاب بارشوں کا بلوچستان، بوند بوند کو ترستا بلوچستان، اور پھر اس بلوچستان پہ برسے بارش، اور اس کے فوراً بعد شفاف بلوچستان، اس کی سرسبز دھرتی کے پس منظر میں ان خوشبودار جڑی بوٹیوں اور درختوں کی عطر آمیز خوشبو مٹی کی سوندھی خوشبو سے مل کر جو جادو جگاتی ہے، اس جادو سے مغلوب کون نہ ہوگا۔جو کوئی نہ ہو اُسے مست کی ''نیک'' دعا کے حوالے کرتا ہوں۔وہی ''نیک'' دعا جو سمو کے حسین ہونے سے اختلاف رکھنے والوں کو سمو کے حسن پہ مر مٹنے والا مست دیا کرتا تھا: ''تمہاری آنکھوں کے صدقے''۔

عاشق کے لیے، شاعر کے لیے بلکہ عام انسان کے لیے بھی وطن تو حوالہ ہوتا ہے مظاہر کا۔فلاں درخت، فلاں پہاڑ، باپ دادا کی سرزمین، آباؤ اجداد کا قبرستان۔یعنی وطن کی محبت دیگر مختلف مظاہر سے مل کر ہی ایک شکل اختیار کرتی ہے۔اور تم دس دعوے کرو، بیس نعرے لگاؤ، مگر سچ یہ ہے کہ سسی کے ہاں بھنبھور دو آنے کا بھی نہیں، اگر اس میں پنہوں نہ ہو:

صبا میں بوئے پنہوں جب نہیں ہے
تو پھر بھنبھور کے صبح و مسا کیا

وہ جو فیض زلف لہرانے کو ہی خوشبو کا نام دیتا ہے، مست ایسا ہی تو کہہ گیا تھا۔ہم کلام پہ قادر دانش ور قراۃ العین طاہرہ کی مثال بھی لاتے ہیں:

نـه چـو زلفِ غـالیـه بـارِ او، نه چو چشم فتنه شعارِاو
شـده نــافعــه ء بهمــه ختن، شده کـافری بهمـه ختـا

ترجمہ:

نہ اس کی معطر زلف کا سا کوئی نافہ سارے ختن میں ہوا ہے
نہ ہی اس کی فتنہ شعار آنکھوں کا سا کوئی کافر ملکِ ختن میں ہوگزرا ہے

سمو اور خوشبو بھلا کوئی الگ الگ صفات ہیں کیا؟ ۔آپ خوشبو کہیں سمو بن جائے گی، آپ سمو کہیں مطلب نکلے گا خوشبو، بھینی بھینی، معطر معطر، نرم نرم خوشبو۔خوشبو سمو کی صفت ہے اور سمو خوشبو کا عروج۔صفت مظہر میں ڈھل جاتی ہے اور مظہر صفت بن جاتا ہے۔ایسا ہے عشاق کا فلسفہ۔ تشبیہ دیکھیے:

لونگی ٹالی اے رستہ مس ارغونیں گراں
زڑ تغث بوآں، بوئے چو ہمبوئی زراں

ترجمہ:

فلک بوس چٹانوں پہ اگی لونگ کی ٹالی ہے وہ
خوشبوؤں میں پرواز کرتی ہے خوشبوئیں لنڈھاتی ہوئی سمو

خوشبو کے متعلق مست کے ہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی محبوبہ کی صرف زلفیں ہی معطر نہیں، محض جسم ہی معطر نہیں بلکہ:

لال تا خانی بوئے پہ رنداں رتکغاں
(اس کے قدموں کے نشانوں سے خوشبودار جڑی بوٹیوں کی خوشبو آتی ہے)

لیکن کیا اتنا کافی ہے؟۔کیا محبوبہ کی زلفوں کی یہی تعریف کافی ہے جو ہم پہلے کہیں لکھ چکے ہیں؟۔نہیں، بالکل نہیں۔بالخصوص مست جیسے ثنا خوانِ سمو کے لیے زلفوں کا بس اتنا سا تذکرہ کیا ہے، اونٹ کے منہ میں زیرہ!!۔بھئی پتلی کمر تک لمبا ہونا بھی زلف کی بابت برحق بات ہے،

بل کھاتے متناسب لفظوں سے یار کے زلفوں کو، کوہِ رستانی کے غاروں میں بل کھاتے سانپوں کے مترادف قرار دینا بھی درست بات ہے، چلتن و ماران کے کوہساروں پہ چوکڑیاں بھرنے والے آہو کی چستی چابکی بھی زلفوں پہ صادق.....مگر ایک وصف تو اور بھی ہے جسے، میں اور آپ بے شک بھول جائیں لیکن زلفوں کا تاحیات قیدی تو کلی تو نہیں بھولے گا، بھول جائے تو بھلکڑ پن کی سزا پائے اور بھلکڑ پن کہیں اور ہوسکتا ہے دانش ور اور شاعر کے ہاں یہ ایسا ممنوع جیسے ہندو کے معدے میں گائے کا گوشت.....اور وہ وصف ہے زلفوں کی خوشبو، معطر زلفیں ،مشک آلود زلفیں، لونگین زلفیں:

درشکاں لیموئے حاکمی باغانی تہا
پن جوانت و شکلیں رنگ گوں دروشماں
چیڑ گوں مسکان و لونگان و عطراں
لوڈ تئی سمو گونا گوں کہنی کونتراں

ترجمہ:

درختوں میں لیموں ہے سمو، لیموں بھی شاہی باغات کا
خوب ہیں اس کے پتے، اور شیریں ہے رنگ روپ اس کا
گیسو ہیں بھیگے مشک و لونگ و عطریات کے ساتھ
چال تیری سمو، فقط کبوتر کے ہے پاس

خوشبو کی یلغار کی بابت بھی سنیے:

زڑتغا بوآں، بوئے چوہمبوئی زراں
جان اوں ساڑ بیشہ اشتہ پہناذوسمبغاں

ترجمہ:

مجھے خوشبوؤں نے آن لیا، سرسبز خوشبوؤں نے
بدن کو ٹھنڈ پڑ گئی نمونیا اور پلورسی جیسے چبھتے ہوئے درد بھاگ گئے

اور آخر میں مست کی پیاسی بے چین روح سے نکلی دعا!!

جی پہ تئ بوآں اژ منی جانا دیرمہ واں

(خوشا! تیری خوشبوئیں، وہ میرے جسم سے دور نہ ہوں شالا)

مناظرِ فطرت سے تشبیہ

دنیا کی ساری زبانیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، محبت کے واحد شعبے میں ہمیشہ deficient ثابت ہوتی ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ انسان کہیں قدرت کے حسن کو محبوبہ سے تشبیہ دینے پہ مجبور ہوتا ہے، اور کہیں الٹا محبوبہ کو مناظرِ فطرت سے مشابہت دینے کو مجبور۔

دوست منی روژنائیں تہارانی

(میری محبوب تاریکیوں میں مشعل ہے)

مست کے نزدیک حسن کا اصل نام سمو ہے۔ ہم مست کے عام قاری کی حیثیت سے بھی گواہی دیں گے کہ وہ سمو کو ہر مخلوق سے زیادہ حسین، زیادہ اچھا اور زیادہ متوازن دیکھتا تھا۔ کوئی ثانی نہیں، کوئی نظیر نہیں، کوئی مقابل نہیں..... نہ عرش پہ نہ فرش پہ۔ نہ ہندوستان میں نہ خراسان میں۔ تو کیا مثال دی جائے۔ کیا انتہائی بات کی جائے۔ تنگ دامان انگریزی، عربی، اور چینی زبان کی طرح تنگ دامان بلوچی بھی پناہ لیتی ہے فرشتوں میں، پریوں میں، پھولوں میں، مناظر میں..... عشق کے آگے سب زبانیں گنگ، سب بولیاں اپاہج۔ سو ہمارا پیرِ عشق بھی زبان کی اس عمومی تنگ دستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور مجبوری سے اپنی محبوبہ کے حسن کو مافوق الفطری زبان کے ہاں رہن رکھ دیتا ہے۔ ارے سائیں محبوبہ بزرگی، کرامت سب سے بالاتر ہے۔ مست مجبور۔ چنانچہ سمو بلوچی زبان کی کم مائیگی کا شکار بن جاتی ہے۔ بہت لوکوالٹی تشبیہ دیتا ہے مست:

آں پری اے کہ پریشتغے عرشی

(وہ پری ہے یا کہ فرشتہ ہے عرشی)

یہ تو الفاظ کی حدود و قیود کا مسئلہ ہے یا امثال و استعاروں کی کم یابی ہے کہ آپ اپنی محبوبہ کے حسن کو کسی اور چیز سے تشبیہ دینے لگتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ بلوچی زبان میں حسن کا سرچشمہ فرشتوں کو گردانا جاتا رہا ہے۔ جن کے نہ تو پاؤں ہیں نہ کمر، نہ رخسار ہیں نہ آنکھیں..... زبان کا میدان کس قدر محدود ہے!!

دنیا کی ہر زبان کے ادب میں محبوبہ انمول رہی ہے، وہ نایاب نعمتوں ہی سے تشبیہ پاتی رہی ہے۔ نازک ترین مظہر ہوتا ہے حسن۔ نرم، لطیف اور روح کو بھا جانے والا۔ ع

دوست منی شریں چو سمینانی مچلاں

(میری دوست اچھی ہے بادل کی ٹکڑیوں کی طرح)

یہ جاننے کے لیے کہ برسنے والے بادلوں کی ٹکڑیاں کس قدر دلکش ہوتی ہیں؛ بلوچستان آیئے، اور ساون میں آیئے۔ ہمارا نیلگوں، شفاف آسمان دیکھیے اور اس پر بادل کا سب سے ممتاز، سب سے سفید، سب سے جاذبِ نظر ٹکڑا دیکھئے اور اس کے جمال کے سامنے سر جھکایئے کہ یہ ٹکڑی سمو کے علاوہ کون ہو سکتی ہے۔ شاہ لطیف کے پاس دریا ہے، پانی ہے اس لیے اس کی محبوبہ کے نقاب الٹنے کے نتیجے میں قمر اور کہکشاں نیلگوں دریا میں غوطہ زن ہو گئے تھے۔ ان کی اوقات ہی کیا رہ گئی تھی:

جب آدھی رات کو اس نے دکھایا

نقابِ رخ اٹھا کر اپنا چہرہ

قمر نے کہکشاں کو ساتھ لے کر

لگایا نیلگوں دریا میں غوطہ

پر، ذرا ادھر آیئے۔ ہم آپ کو دنیا کی لطیف ترین فلم دکھاتے ہیں۔ جسے ڈائریکٹ کیا مست نے، تحریر کیا توکلی نے اور عکاسی کی سمو بیلی نے:

چاردہی ماہے آسی ژہ کوہہ بارغاں

دوست منی در ینے کوشتی مس شریں کوکراں

کیث پہ آزمانا ہر گر ہ ڈیہہ ایں مائخاں
چیلکاں جنت چو ساونڑیں آبندیں جڑاں

ترجمہ:

چودھویں کا چاند ہے، وہ دمکتی ہوئی جھانکتی ہے کوہ کی باریک ترین بلندیوں پر سے،
محبوبہ میری قوسِ قزح ہے، کھڑی ہو جاتی ہے حسین بادلوں میں
فلک پہ آتی ہے، تو ہر طرف ہو جاتی ہے چاندنی
چمکتی ہے بجلی کی لکیر کی مانند، ساون کے آب بھرے بادلوں کی طرح

محبوب میں کیا کمی کمزوری ہو سکتی ہے، چاند میں خواہ لاکھ داغ ہوں۔ چاند تو چاند ہے، پر چاند اور حسن کا کیا تعلق۔ چاند حسن کے آگے ہیچ۔ البتہ حسن اور محبوب کا تعلق دلچسپ ہے۔ محبوب تو حسن جیسی چھوٹی چیز سے بہت بالا بہت بلند ہوتا ہے۔ محبت حسن کو جنم دیتی ہے نہ کہ حسن محبت کو۔ محبت اول حسن ثانی۔ محبت دائم، محبت قائم۔

''ماہ گونغیں (ماہ رنگ) تو گویا تکیہِ کلام رہا شاعری میں۔ جام سے لے کر آج کے شعرا تک۔

میں آپ ہوتے تو ہماری سمو تو بہت زیادہ محدود اور مجسم ہوتی۔ مگر یہاں سمو مست کی ہے۔ دانش ور، شاعر اور فلسفی کی سمو۔ چنانچہ وہ ایک مجسم وجود ضرور ہے، ایک گوشت پوست کی انسان۔ مگر وہ تو مجسم حسن ہے۔ بھنوروں کے جھرمٹ میں رہنے والا حسن.....حسن جو شکلیں بدل بدل کر حملہ کرتا ہے، ناز بدل بدل کر جادو کرتا جاتا ہے، بھیس بدل بدل کر گرفت میں لیتا جاتا ہے۔ حسن میں تنوع ہی کو تو ثبات ہے۔ یہ ایک روپ میں کب رہتا ہے۔ اور شاعر بھی اسے ہر روپ میں دیکھتا ہے، ہر روپ میں بیان کرتا ہے:

سمو یہ شیشائے شراوانی
سمو یہ سُر پلّے انارانی

سمو یہ سروانے تلارانی
سمو یہ ڈیوائے تہارانی
یا جُڑی بوٹی اے رغامانی

ترجمہ:

شیشی شراب کی ہے سمو
سرخ پھول انار کا ہے سمو
ہرنی چٹان کی ہے سمو
چراغ ظلمتوں میں ہے سمو
یا بادلوں میں سے ہے ایک ممتاز ٹکڑی

ایسا ہے مست۔ جام درک اجازت دو تو تمہارے اشعار مست پر منطبق کروں!!

میں نے لعل جڑے ہیں
میں نے اشعار کہے ہیں
میں نے موتی پروئے ہیں

مست بلوچ ہے۔ اور بلوچ پیاسا ہے بادلوں کا بارشوں کا، کہکشاں کا، چاندنی کا۔ ماہ اس کے ہاں حسن کا استعارہ ہے۔ اور سجنو! مست تو فلک کا لافانی دوست ہے۔ وہ آسمان والے کے لیے ہے، اور آسمان اُس پہ فریفتہ۔ مست فلک کے ایسے ایسے مناظر دیکھتا اور بیان کرتا ہے کہ حیرت طاری کروا دیتا ہے۔ ہم نے پچھلے صفحات پہ آپ کو بلند ترین پہاڑ کی باریک ترین چوٹی پر سے سمو کو طلوع ہوتے دکھایا تھا۔ ایسا منفرد اظہار آپ کو مست کے کلام میں جگہ جگہ ملے گا۔ میں نقل کرتا جاؤں گا آپ اپنی روح پر لطیف شبنمی بوندوں کو گرتا ہوا محسوس کرتے جایئے۔ مگر پہلے ذرا مرشدِ مست، و مرشدِ من و تو، شہ مرید کو سلام نہ کریں؟

آیئے:

دوشی کج و ماہ چاڑ دہی
ہم کو فغی اوشتا ثغاں
ژہ ماہا کجئے رنگ شر تریں
ماہا غبارے مس دفیں
حانی ژہ شیر ا شر تریں

ترجمہ:

کل رات محبوبہ اور چودھویں کا چاند
ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے
ماہ سے محبوبہ کا رنگ زیادہ خوب صورت نکلا
کیوں کہ چاند کے چہرے پر تو غبار چھایا رہتا ہے
حانی کا رنگ تو دودھ سے بھی خوب صورت ہے

اب جو چہرہ، خوب صورتی کی علامت، یعنی چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہو تو اس سے محبت ہی تو کی جاتی ہے۔ کون حسن کے دربار میں دوزانو نہ ہو جائے؟۔ خوش حال خٹک نے تو سیدھا فارمولا بنا ڈالا تھا:

جسے خوب صورت چہرے کی محبت کا غم نہ لگا ہو
وہ جیسے دنیا میں سویا ہوا آیا اور سویا ہوا رخصت ہوا

سچی بات یہ ہے کہ حسن پر آتما کا مظہر ہوتا ہے، خواہ یہ حسن جسمانی ہو، تخلیقی ہو یا روحانی۔ محبوبہ حسن کا مرکزہ ہوتی ہے، راحت ہوتی ہے، لطف، سکون، عافیت۔ اور ذرا سوچیے محبوبہ سمو ہو، ثنا خواں مست ہو، زبان بلوچی ہو، پس منظر بلوچستان ہو، تو پھر تو ورڈز ورتھ اور شیکسپیئر مل کر مست بن جائیں:

دروشماں داث چوتانہی نوذاں
کشی جو سرگواثاں سمین ایغاں

ترجمہ:

صورت ایسی جیسے دور دیس سے آنے والی گھٹا
بخشتی ہے راحت جیسے مشرق سے چلتی ہوئی بادِ نسیم

یہ سیمیں بلوچی زبان کے دونوں بڑے شاعروں، جام اور مست کا سب سے اہم دوست رہا ہے۔ سب سے من بھاتی تشبیہ۔ موجبِ راحت وسکون!!

جی سمیں بے پولا بہشتی ئے
اژ لطیفانی پلو ہ کایئے

جامؔ

ترجمہ:

جی ہو تم پہ بادِ سحر تم، بن پوچھے بہشتی ہو
کیوں کہ تم حسیناؤں کی طرف سے آرہی ہو

صرف بادل، چاند، بادِ نسیم ہی نہیں، مناظرِ فطرت کے ذاکر، مست کی سمو تو:

دوست منی درینے کوشتی ماں سوزیں کوکراں
(میری دوست قوسِ قزح ہے، کھڑی ہوتی ہے سفید بادلوں میں)

یا پھر.....

دیشہ مس سمو کرّ ہ کنت خاصائیں گذاں
تنگویں بچی رُستہ گوئر آریفیں پٹاں
سملئے لوڈ گوناں گوں کہنی کونتراں
رنگے شرنت او داث سمینانی دروشماں

ترجمہ:

میں نے دیکھا سمو کو جو نرم، اجلے سفید لباس پہنتی ہے
والد کے ہاں بیٹے جیسے ناز میں پلی بڑھی
کبوتروں نے سمو کی چال اپنا لی ہے
اس کی رنگت دلکش ہے اور نسیم سحر کی ہم شکل

شھدو شیر

دوست وَٹّی ئے شہذ و شیرانی
(محبوب شہد و دودھ کا کٹورا ہے)

بس اور کیا لکھوں، کیا کہوں؟!!

شیئر

دوست ژہ جاندرانڑہ لیمو آں یکے
رُستہ مں ارغونیں گری سایاں
دروشماں دا چو تانہی نوذاں
دَرَوشی چوسرگواثاں سمین ایغاں
ژل انتی شمب چوزا مری چیڑاں
پَنے شرنتی ماں تنگویں دیما
دار ہُمارنت مں بارغیں سرینا
ترند چو آمڑ (1) داثغیں تیغاں
بّریں چوسروانا گیافیناں
سُہریں چو سُر پلّاں اناریغاں
وہش چو سجی پکغیں ونگاں
ساڑتیں چوکانافاں سہیل ایغاں
جسکی چو پُڑزایاں گروخی آں
واژہ پہ توفیقیں دلے زیراں
پہ جزیدانی جنگہ سامانا
میکائل نوذانی مہا نڑائیں (2)
وث پڑیانی واغے مں دست اَیں
ہیئے تُراناں چوسانوڑی سیراں
مہر واں بیث و پتنڑاں گواری
وث مراذوندانی مراذ پچی
بوژوبل واغانہ دریائی آں

ترجمہ:

دوست کوہ جاندران کے لیموؤں کے پیڑوں میں سے ایک ہے
جو دشوار گزار گھاٹیوں کے سائے میں بڑا ہوا ہے
وہ دور دراز سے آئے بادلوں جیسی
خوش گوار ہوا کے جھونکوں کی طرح چلتی ہے
اس کی شاخیں زامر کے بیل کی مانند نیچے لہراتی ہیں
اس کے پتے اس کے سنہرے چہرے پر سجتے ہیں
ٹہنیاں (زلفیں) اس کی پتلی کمر پر گری ہوئی
تیز ہیں زہر میں بجھی تلواروں کی طرح
وہ دور دراز کی بدکی ہرنیوں کی طرح ہے
انار کے پھولوں کی طرح سرخ ہے
لذیذ ہے سجی کیے ہوئے پُٹھ کی طرح
یخ ہے موسمِ سہیل کے فرحت بخش پانی کی طرح
چمکتی ہے بادلوں میں بجلی کی چمک کی طرح
مالک باہمت دل سے اٹھالیں
یزیدوں کے ساتھ سامانِ جنگ کے بطور
میکائیل بادلوں کا کشتی بان ہے
اسی کے ہاتھ میں ہے بوندوں کی مہار
اس شان سے امڈ آئے جیسے ساون کی شادی ہو
مہربان ہو کر پتوں پہ برستا ہے
مرادیں مانگنے والوں کی مرادیں بر آئیں
دریاؤں کی باگیں کھول دے

[حاشیہ: 1۔ زہر میں بجھی تلوار 2۔ کشتی بان۔]

شیئر

سَوزیں چو طوطی آں لقائی آں
ٹلّی مں گُلّاں بادشاہی آں
دوست منی نوخیں نوخ سراں نوخیں
وزتاں مست ایغاں تل وتوخیں
نوخیں ماں شاھئے چادرہ نیاما
گنداں تئ لوڈاں مں بشان ئیغاں
تڑساں ژہ زورکاراں قہاریغاں
چی اے تئ قہرانی ازل گیراں
چی اے تئ مہرانی پھل گیراں
چی اے تئ مجنائی دلیل داراں
چلہ ای چیار پاسا قواض داراں
دوست مناں پڑدائے نقل داری
شربتاں پاک ئیغاں منہ لوٹاں
ہڑ دور نگانی شیشغاں لالیں
نوشِ اثنت شاھہ جنّگیں بچاں
چم ژہ مہرانی درہ گواری
پیالوئے نوش کاں گوں کاغذیں رکّاں
یکے پہ واسطا یا خدائیا
یکے پہ نیتا گنوخ ئیغا
بیایاں مئیں تُتّی ایں دلا پچاں
لہر ژہ ماندائیں دلا دیر باں

سملئے سالانی زہیر نوخ باں
قنبریں عہدانی حوالداراں
دوستہ پڑدائیے مں فکرداراں
روضوا لال ئیغا سلامیاں
منّہا دوست ئیغا گُمانیاں

ترجمہ:

کرامت بھری طوطیوں کی طرح سبز ہیں
بادشاہ کے گلستان میں سیر کرتی ہے
محبوبہ میری نئی ہے، نئی سے نئی ہے
مست کی یادوں میں لوٹ پوٹ ہوتی ہے
شاہ کے چادر کے اندر نئی ہے
میں تمہاری مستانی چال دیکھتا ہوں
قہار خدا کی طاقت سے ڈرتا ہوں
کچھ کچھ تو تمہارے (خدا کے) قہر کی زد میں ہوں
کچھ کچھ تمہاری (خدا کے) رحمتوں کا فیض یاب ہوں
کچھ کچھ تمہارے لیے جنون کا دعوے دار ہوں
سرما کے چار پہر عبادت کرتا ہوں
دوست مجھے پردہ دیتا ہے
پاک (خدا) کے شربت مانگتا ہوں
ہر دو رنگوں کے شیشے خوشنما ہیں
شاہ (علی؟) کے دونوں بیٹے نوش فرماویں
آنکھ محبت کے در سے برستی ہے

کاغذی پتلے ہونٹوں سے پیالہ نوش کرتی ہے
ایک پیالہ خدا کے واسطے
ایک اس دیوانے مست کی نیت سے
تا کہ ہمارے پیاسے دلوں تک پہنچیں
تا کہ یادوں بھرے دل سے موجیں دور ہو جائیں
تا کہ سمل کی برسوں کی یادیں تازہ ہو جائیں
میں اپنے عہد اور قول کا پاسدار ہوں
محبوب کے ناموس کے لیے سوچتا ہوں
لال (شہباز قلندر؟) کے روضے پہ حاضری دے رہا ہوں
دوست کے سائباں (روضہِ رسول؟) کا منتظر ہوں

****

شیئر

یاتیں مار اللہ مرشدہ کئے مئے واہرا (1)
شہہ مرید گوانکہ کیث مئے صحو و بیگہا
دیشہ ما سمّو کرہ (2) کنت مکنائیں (3) گذاں
در شکاں لیموئے حاکمی باغانی تہا
پَن اے جوانت وشکلیں رنگ گوں دروشماں
چیڑ گوں مسکان و لونگان و عطراں
لوڈ تئ سمو گوناں گوں کہنی کونتراں
توکلی مستئے شیراں گوں راجی و اژہاں
ہر کسے شیرانہ گشی مستئے قصو اں

کُل گناہ مافا بنت ژہ خاوند ہ درا
نیخ دعائیاں کنت مست ، آنہی ئے سرا
باغ سوز انت کہ مئے دعا آمیں بیثغاں
بیثغاں آمیں عالم وجگا (4) دیثغاں
بیثغاں آمیں گال گوئر شاہیں قادرا
کوکراں لاکڑ (5) بستہ چو بشامی جڑاں
گھمریں گرنداں ، ہینژغیں نوذی جینہراں
چھورے مَلکاں داثغنت عرشی پریشتغاں
سمو گوں حُوراں نشتہ ماں طوبائے بنا
کوثرہ آفاں نوشہ کاں نورئے پیالواں
پیالو ے نورئے ایریں پہ مستئے نیتا
کونجاں قطاریں سمو پہ نرمیں لڈغاں
کونج کراکنت و سئی کناں لڈوخیں جناں
مست مروشی کہ گھولغیں سندھئے اُلکہاں
گھولغیں سندھا پولغیں سمو دروشماں
پولغا سمو ئے بذل پیداشہ نواں
گڈ ہ کاں مست کہ تدڑی ڈیہادرکفاں
ہور گوارنت وآف پرے کورانہ بہاں
آتکغاں مں کہ سملئے احوالاں گراں
مں پہ سمو آ بیثغاں شیدا و زھیر
جنتی باغاں امتی کاروانی بہی
نیم گوں حوراں نشتہ او شربت اش ڈھی

نیم ملائیں حالوار گنگیں مں دفا
واناں فرقانا ، گڈ ہ دے دروہیں مں دلا
نیستن اش دگ مں حضور ئے مڑاگہا (6)
داثغیں دست شینہڑی (7) اسپاں زوارہ بنت
بورے دِر کّنت وبارغیں راہاں پار ہ باں
جنتئے باغاں نداں گوں حوراں نیاذ ہ باں
عیناں بُڑز ار ئے دیرہ بنت سالانی زہیر
زڑدہ (8) دیر دار ئے دیذغانی مہرامہ زیر
زیرے بمبالاں پٹنئے رولوئیں پخیر
جی پہ تئی نرمیں جزغ ووھشیں کندغاں
جی پہ تئی بوآں اژ منی جانا دیرمہ واں
یہ دغا مے آ سملئے لوغانشتغاں
دوست تئی مونجھاں چکّھرمں تنّی بیثغاں
گوراں جھاگیناں مَشکاں گوں بنداں ایربراں
سملئے د ستاں یہ چلوئے آفی وراں
سملا پرماں گُم گُم ایں انژزی رتکغاں
دوست منی گرے ئے وہش کنئے جوریں دژمناں
سمو مئیں لالے نیستنی عیومں انگہاں(9)
یَرّہا جوڑینتہ گشے کاریگراں
چوٹ گوں تنشاں کشتغاں ول گوں پرگفاں
بیگہا درینے جکی مں آبندیں جڑاں
چاڑ دہی ما ہے آسی ژہ کوھئے بارغاں

کئے پہ آزمانا ہر گرا ڈیھ بی مائخاں
سمو تئ ٹوکیں چوستار وجی بانگہاں
دوئیں دستانی مندری چو آسی بلاں
جیغ کڑوئیا داشتغا دکانیں گراں
سینغہ تاویت چو گروخ تاڑیاں جناں
لونگی ٹاری اے رستہ مں ارگونیں گراں
زڑتغہ بوآں، بوئے چو ہمبوئی زراں (10)
جان اوں ساڑ بیشہ اشتہ پہنا ذ وسُمبغاں (11)
دام منی چمانی تلاں ژادیرہ باں

[حاشیہ:1۔مدد 2۔پہنتی ہے 3۔کپڑے کی ایک قسم 4۔جہان 5۔قطار 6۔محفل
7۔شیر کی طرح 8۔دل 9۔اعضا 10۔خوشبو پھیلانا 11۔Pleuricy کا درد]

ترجمہ:

یاد ہے مجھے خدا، مرشد ہر دم مدد کو تیار
شہہ مرید صبح وشام میری صدا پہ آن موجود ہوتا ہے
سمو کو میں نے دیکھا شاندار لباس میں
وہ درختوں میں سے لیموں کا درخت ہے، شاہی باغوں کا
اس کے پتے حسین ہیں، رنگت شکر آمیز، خدوخال متناسب
اس کے پراندے، چوٹیاں مشک، لونگ اور عطر سے معطر
سمو تمہاری چال کبوتر نے اپنالی
تو کلی مست کے اشعار قبیلوں کے سربراہوں کے پاس محفوظ ہیں
جو بھی ان اشعار کو دہرائے گا، مست کے تذکرے کرے گا

اس کے سارے گناہ معاف ہوں گے خداوند کے دربار میں
مست اس کے لیے دعائے نیک کرے گا
باغ سرسبز کہ ہماری دعائیں قبول ہوگئیں
قبول ہوگئیں سارے جہاں نے دیکھا
بادشاہ اور قادر کے ہاں ہماری دعائیں قبول ہوگئیں
بادل ساون کی طرح قطار اندر قطار چلے آئے
بادل غٹرغوں میں گرجتے ہیں بارش کا شور ہے
ملائکوں نے، عرشی فرشتوں نے مفصل حال بیان کیے
(کہ) سموحوروں کے جھرمٹ میں طوبیٰ میں متمکن ہے
وہ آبِ کوثر نوش کرتی ہے نور کے پیالوں میں
نور کا ایک پیالہ اس نے مست کے لیے الگ رکھا ہے
کونج قطار اندر قطار اور سمو خراماں خراماں، حسین چال میں
کونج آوازیں نکال نکال کر خوش خرام حسیناؤں کو باخبر کر دیتے ہیں
مست ان دنوں سندھ کے چپے چپے میں تلاش کر رہا ہے
چھان مارتا ہے سندھ اور تلاشتا ہے سمو کی شکل وصورت
سمو کی ثانی تلاش کے باوجود کہیں نہیں ملے گی
دوڑ پڑتا ہے مست کہ تدڑی کا پہاڑ چڑھ جائے
بارشیں برستی ہیں ندیوں میں پانی آتا ہے
میں یہاں چلا آیا کہ اپنی سمل کی خبر پا سکوں
میں سمو کے لیے اداس اور زھیر ہو گیا ہوں
بہشتی باغوں میں امت کا کارواں رواں دواں ہے
کچھ حوروں میں بیٹھے ہیں انھیں شربت ملتی ہے

کچھ ملاّ ہیں، گنگ ہیں
پڑھتے قرآن ہیں، پھر بھی دل میں دھوکہ ہے
پابندی ہے ان پہ حضورؐ کی مجلس میں جانے پہ
سخی لوگوں کو تیز رفتار گھوڑے عطا ہوتے ہیں
یہ گھوڑے باریک و پرخطر راستوں کو کود کے پار کر جاتے ہیں
اور یہ سخی جنت کے باغوں میں رہ کر حوروں کے ہم نشیں ہوتے ہیں
تُو آنکھ اوپر اٹھاتی ہے تو برسوں کا ہجر غائب ہو جاتا ہے
دل دور رکھ کے آنکھوں کی، محبت کی بددعا نہ لو
دل کی آہیں نہ لے تمھیں جوگیوں کی بددعائیں لگ جائیں گی
جی ہو تیری نرم گامی، جی ہو تیری دلکش ہنسی
جی ہو تیری خوشبوئیں، انھیں میرے جسم سے لپٹا رہنے دے
ایک لمحے کے لیے سمو کے گھر بیٹھ گیا ہوں
محبوب تیری یادوں کا کس قدر پیاسا ہو گیا ہوں
ندیاں پی جاؤں، مشک کو بند سمیت نگل جاؤں
(مگر) سمو کے ہاتھوں کا محض ایک چلو پانی ملے تو یہ پیاس بجھ جائے
سمّو نے میرے لیے موٹے موٹے آنسو بہائے
میری محبوبہ! روتی ہو تو میرے زہریلے دشمن خوش ہوں گے
سمو تُو ایک لعل ہے تیرے جسم کے کسی عضو میں کوئی عیب نہیں
گویا کاریگروں نے اسے متناسب تراشا ہے
تیشہ سے ایک ایک ٹیڑھ نکال ڈالی
وہ شام کی قوس قزح ہے پانی بھرے بادلوں میں نکل آتی ہے
چودھویں کا چاند ہے پہاڑ کی باریک بلندیوں سے نکلتی ہے

آسمان میں ابھرتی ہے، چاروں اَور چاندنی ہو جاتی ہے
سمو تیری باتیں اتنی میٹھی جیسے صبح سویرے ستار بج رہا ہو
ہاتھوں کی انگوٹھیاں آگ کی طرح چمکتی ہیں
کشیدہ کیے ہوئے گریبان کو پستانوں نے اوپر اٹھا رکھا ہے
سینے پہ مچلتے تاویت بجلی کی طرح تالیاں بجاتے ہیں
تو لونگ کی ایک شاخ ہے جو گہری گھاٹیوں میں اگی ہے
اُس کی خوشبو عطر کی طرح چار سو پھیلتی ہے
اس کے وصل سے دل ٹھنڈا ہوا، جان لیوا درد دور ہوا
میری آنکھوں پہ پڑے جالے دور ہو گئے

****

شیئر

بیا ہمے سوزیں مرگ ترا ربالو (1) کناں
ایرکہ (کف) ژہ درنگا ، بل زہیرانی زارہاں
زیر سلامان و شَل (2) پئے پٹ و بیدہاں
نشک و پار ایشنت سہر نتی چمانی لوار (3)
شیفغیں (4) پونزے ، سملئے بروانا اوار
کاٹکیں طوخے مانیں ماں کونجیں گڑدنا
سے تلیں تاویت ژلاں ماں دوستئے ڈوبرا
سِک مناں دوستئے چابکی تاوانہ دیاں
برو ہمو ذا کہ نشتی ایں مہتاو (5) مس مژاں
بی خوڑ دار ژہ ٹھگ و دروہائیں مڑدماں

گِن (6) نواں باریں آں ترا گجاں (7) گوں جناں
مئیں سلاماں زیر ، بندوثی زریں بانزراں
برو ہموذا کہ نشتی ایں بانک میڑواں
تہ دہ ٹِلّہاناں نندی مں چَپیں کوفغا
چُمبھا چُہکیں تہ کُنل و گوشانی گورا
نرمیا گیڑت و کنتے مں شارہ (8) پلوا
تاں ڈیہی مرگئے گپتہ چے ویلے آترا
ویل مناں چی نے مں تہ ربّالو پیٹغاں
زڑتغو پیغام مں تئ دوستئے آتکغاں
(کہ) ہاکنئے سمو اے دنیا جوانیا گزی
ہاکنو سمو ، مئے دلئے بمبالاں مہ زیر

[**حاشیہ**:1۔رشتے کے لیے قاصد 2۔تیز رفتاری سے جا 3۔کنارا
4۔سرمہ کی سلائی 5۔مہتاب 6۔دیکھو 7۔کمان کا تیر 8۔چادر، دوپٹہ]

ترجمہ:

آ اے سبز پرندے، تجھے رشتہ کرنے والا قاصد بنا کے بھیج دوں
بلند چٹانوں سے اترتا جا، ہجر و فراق کی فریادیں کرتا جا
میرے سلام لے لے اور میدانوں صحراؤں پہ سبک رفتار پرواز کرتا جا
اس کا حلیہ یہ ہے کہ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں
ستواں ناک ہے، سمو کے ابرو باہم ملے ہوئے ہیں
اس کی کونج سی گردن میں گول طوق ہے

تین تہوں والے تاویت محبوبہ کے سینے سے جھولتے ہیں
محبوبہ کی اتاہ یادیں چابک سا درد دیتی ہیں
وہاں جا جہاں میری ماہتاب دھند میں بیٹھی ہے
ٹھگوں دھوکہ بازوں سے ہوشیار رہ
ایسا نہ ہو تمھیں تیر برسا کر شکار کر دیں
میرے سلام و پیام لے کر اپنے زرین پروں سے باندھ لے
وہیں جا جہاں مالکن ہمجولیوں میں بیٹھی ہے
لاابالی میں اس کے بائیں کندھے پہ جا بیٹھ
بالیوں بھرے کانوں کے قریب چونچ لے جا کر چہک
نرمی سے پکڑ کر وہ تمھیں اپنے دوپٹے میں چھپا لے گی
کس دیس کے پرندے ہو، تم پہ کیا آفت آن پڑی ہے
مجھے کوئی افتاد نہیں میں محض قاصد ہوں
لے کر آیا ہوں پیغام تیرے محبوب کا
''ہاں'' کہہ دے سمو یہ زندگی اچھی گزرے گی
''ہاں'' کہہ دے محبوب، ہمارے دل کی آہیں نہ لے

****

شیئر

دوست وَٹّی اے شہذ و شیرانی
ملّغی بالاذے سمارانی
مَں گوئرئے کَنڈی آں ہزارانی
پیہریں لوڑھوئے ڈغا رانی

دوست منی روژنائیں تہارانی
ساسراں نندا ں مس قُرانانی
پِیر ہمراہاں کل مقامانی
دعا ترا بازیناں پخیرانی
گیشترا اولیا اوولیانی
دل منی موژہ کنت رَلی آنی

ترجمہ:

محبوب شہد و دودھ کا کٹورا ہے
اس کے خوبصورت سراپا کی توصیف کرتا ہوں
اس کے گلے میں بہت قیمتی ہار ہیں
کھیتوں پہ موجود سایہ دار جھونپڑی ہے
میری محبوب تاریکیوں میں مشعل ہے
میں قرآن کے سائے میں رہتا ہوں
تمام مقامات کے اولیا میرے ساتھ ہیں
جوگی فقیروں کی ڈھیر ساری دعائیں ہیں تجھے
جملہ اولیا اور ولیوں کی دعائیں
میرا موجی دل موج میں آجاتا ہے

****

شیئر

رہ گوئزاں سمّو گوئستہ پہ ریما
دوست منی روث مس پنگھرے دیما

لہر منی جانا ریز گِرنت مارِی
موژہ کنت روح و دِل ہزارواری
شاہری نوخیں قصورے کاری
شوانزانِیں مئیں کیغذہ ڈولا
دوست منی بازیں خدمتاں لوٹی
چیٹہ لوٹی چو تنگویں بچی
چیٹہ لوٹی جو شِیرد فیں بہاناں
سانبہ لوٹیث و سانبغے جُواناں
(کہ) سُکّھ ژاُ ڈکانی پذا کایاں
نِیں کسانیں کہ نیستنی راپتار
بلّاں تہ واغاں سردینت سوار کار
ڈاکواں چاڑاناں برنت واندکار
(گڑا) بیث کہیوانی لُڈّغاں وستاذ
گندغاں بیہوشہ پھِرنت مستال
گِندے شوا بیلاں مئیں رُوحہ کڑ داراں
ہر دَم وپلکا دوستہ گیراراں
آں پری ئے کہ پریشتغے عرشی؟
روح پذا ماندائیں منی مرشی
ماجشہ شیرے اژدِلہ ساڑا
وَث خدا پتّی دژمنہ پاڑا
بُتکہ سموژا آسنیں واڑا
کئے رُذاناں گوں مملیں شارا

ترجمہ:

سموگھاس لانے چلی جارہی تھی
میری محبوبہ ایک دشوار گزار پہاڑ پر جاتی ہے
جذبات میرے بدن میں سانپ کی طرح بل کھاتے ہیں
روح اور دل ہزار ہا بار موج میں آتے ہیں
شاعری کا نیا عنوان لاتے ہیں
تم میری محبوبہ کا طرز نہیں جانتے
میری محبوبہ کو بہت خدمت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے
پیارے بیٹے جیسی دیکھ بھال
اسے گھوڑی کے ایک شیر خوار بچے کی سی دیکھ بھال چاہیے
اسے دیکھ بھال چاہیے، اس کی دیکھ بھال کرنا اچھا ہے
(کہ) سُکھ دکھوں کے بعد آتے ہیں
ابھی کم سن ہے اس کی رفتار زیادہ نہیں ہے
ماہر سواروں کے ہاتھ میں اُس کی باگیں دے دو
اس کے درجے بلند کرنے دو ماہروں کو
وہ ناز و خرام سے چلنا سیکھ لے گی
اسے دیکھ کر دیوانے بے ہوش ہوتے ہیں
دوستو، میری روح کی کارستانیاں دیکھو
ہر لمحہ ہر ساعت دوست کو یاد کرتا ہوں
وہ پری ہے یا عرشی فرشتہ ہے
آج پھر اس کے لیے روح بے قرار ہے
میں نے دل کے جلنے کے باعث ایک نظم کہی ہے

خدا خود دشمن کو برباد کرے
سمو آہنی قید سے رہا ہوگئی
ململ کی اوڑھنی میں چلی آتی ہے

****

شیئر

سمو گٹ گوں بر گڑی آں
سمو پونز گوں پُکڑی آں
سمو سر گوں چُنڑی آں
سمو پاذ گوں جُتڑی آں
سملیِ دوست گوں مری آں
سملیِ لوغ گوں کڑی آں

****

مگر میں تو اس باب کے آخر میں مست کے وہ پانچ مصرعے دوں گا جو حال ہی میں مجھے سراج بگٹی سے ملے ہیں۔ بس سمو کے حسن، اس کی شخصیت اور اس کی سلیت کا نچوڑ میری نظر میں یہی پانچ مصرعے ہیں۔

زینہ کوہا مں پلپلے دیشہ
دار چو ماراں ،چو سملہ سرینا
تاخے بلکاں چو سملہ دیما
ئیں دہنڑاراں من گڈغا دیشہ
ئیں لواراں مں شوشغا دیشہ

ترجمہ:

زین پہاڑ پہ میں نے ایک پیپل دیکھا
شاخیں جیسے سانپ جیسے سمل کی کمر
پتے چمکیں جیسے سمو کا چہرہ
نہ میں نے چرواہے سے اُسے کٹتے دیکھا
نہ لُوکو اُسے جھلساتے دیکھا

حوالہ

1۔ لچکی، یوسف عزیز، مست توکلی۔ ماہنامہ آساپ، جنوری 1993، صفحہ 16

مست توکلی ـــــ اَتاہ درد کا دوسرا نام

پوسٹ نائن الیون کے عہد کے سرمایہ داری نظام کو متشدد ''طالبان'' سے نمٹنے کے لیے یہاں ایک متبادل عقیدہ اور نظریہ کھڑا کرنے کی ضرورت پڑی۔ سرمایہ دارانہ نظام بڑا ڈرامہ باز نظام ہے۔ اُس کو معلوم ہے کہ اُس کا رچایا ہوا ہر ناٹک فلاپ ہوگا۔ اسی لیے وہ ہمہ وقت نیو ورلڈ آرڈر کی ڈرامہ سازی میں لگا رہتا ہے۔ ایک کے ناکام ہونے کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ تاکہ لوگوں کی توجہ اُس کے اندر موجود لوٹ مار والی فطرت سے دور رہے۔ عالمی تاریخ کیا ہے؟ عالمی تاریخ اقساط میں طبقاتی نظام کی ناکامی ہے۔

آپ کو تو معلوم ہے کہ دانش ور سرمایہ دار کا بہترین سماجی وکیل ہوتے ہیں۔ وہ اُسے معاشرے میں قبولیت کا درجہ دیے رکھتے ہیں۔ اُس کے لیے وہ نئی نئی دلیلیں اور منطق اور جواز گھڑتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بورژوا دانش ور القاعدہ کے توڑ کی تلاش میں ایک عرصے تک واسکوڈے گاما بنے رہے۔

بالآخر اُن کرایہ کے دانش وروں کی نظر ہمارے خطے کے بزرگوں ولیوں پر پڑی جو بہرحال ملائیت سے قبل کے لوگ تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ وہ یہ کہ ہمارے دانا، حکیم، عالم، خردمند، فہمیدہ اور غور و فکر کرنے والے اولیا کے فلسفہ کا مغز نکال دیا جائے اور اُن اولیا کے نام پہ ایک عمومی غیر فعال، سکوت دوست، اور جامد انسانوں کا گروپ قائم کیا جائے۔ اس پورے نظام کا نام انھوں نے ''صوفی'' رکھ دیا۔ گو کہ یہ لفظ یہاں بہت زمانے سے استعمال ہو رہا تھا۔

اوراس کی کوئی خاص تعریف یا معنیٰ نہ تھے۔طبقاتی نظام کو کچھ نہ کہنے والا ایک تصور۔اب اسی لفظ اور تصور کو گڑ مالہ لگا کر جدید سرمایہ داری ''دم مارو دما'' میں ڈبو کر اپنے مقصد میں ڈھال دیا گیا۔اُس کے بعد این جی اوز سے ہوتے ہوتے سرکاری سطح تک صوفی کے نام سے کانفرنسیں، رقصیں، اور موسیقی کی محفلیں بڑے پیمانے پر شروع کی گئیں۔(پاکستان میں سب سے بڑی ٹرانس نیشنل کمپنی کوکا کولا کے ذریعے)۔

ان کے ہاں القاعدہ کا متبادل کمیونزم نہیں ہوسکتا۔اُن کا درست طور پر یہ خیال ہے کہ سرمایہ داری نظام اپنی سرشت میں افراتفری اور انارکی کے جراثیم رکھتا ہے۔اِس نے بہر حال جنگ کی طرف ہی جانا ہوتا ہے(خواہ یہ خانہ جنگی ہو، یا، دو یا دو سے زائد ممالک کے مابین جنگ)۔اور یہ جنگ اپنی خطرناک صورتوں میں کمیونزم کے قیام کی طرف بھی جاسکتی ہے۔

کمیونزم تو سرمایہ داری کی موت ہوگی۔اس لیے وہ اپنے نظام کی سکڑتی ہوئی کشش کا نعم البدل ابھی سے مروج کرنا چاہتے ہیں۔چنانچہ اُس نظام کے فکری باڈی گارڈز ''صوفی ازم'' کی اصطلاح وضع اور مروج کر کے اسے فلسفہ اور سیاسی ادبی ثقافتی دنیا میں لا گھسیڑنا چاہتے ہیں۔

اسی لیے انھوں نے مست کو بھی ''صوفی'' بنا ڈالا۔یہ اُن کی مجبوری بھی تھی اس لیے کہ کافی عرصہ سے یہ ٹرینڈ چل پڑا ہے کہ باہر کی دنیا کو دکھانے اور فنڈ پکڑنے کے لیے کسی سمینار یا فنکشن کو پاکستان سطح تک کا دکھانا ہوتا ہے۔لہٰذا ہر صوبے میں اُس کی شاخیں ضروری ہوتی ہیں۔ تبت ٹالکم پاؤڈر ہو، یا انجمن ترقی پسند مصنفین، جماعت الدعوۃ ہو یا عورت فاؤنڈیشن، بلوچستان شاخ کھولنا بڑا ضروری ہوتا ہے۔لہٰذا حلال و جائز ثابت کرنے کے لیے ہر صوبے سے کم از کم ایک دانہ صوفی ہونا تو ضروری تھا۔چنانچہ بغیر کسی گناہ اور اشتعال کے ہمارے توکلی مست کو صوفی بنانے کی کوشش کی گئی۔

اِن یاروں نے چاہا کہ مست کا کوئی فرضی یوم پیدائش گھڑ لیا جائے اور کوئی مصنوعی وفات کا دن بھی مقرر کیا جائے۔تاکہ عرس، دھمال، خیرات، مزار کو غسل، چادر کی تبدیلی وغیرہ کی محفلیں جما سکیں اور ان محفلوں کے نام پہ وہ پیسہ کما سکیں اور عام لوگ ایک نئے طرز کے توہمات کا

شکار ہوں۔انھوں نے یہ بھی چاہا کہ مست کی کوئی من گھڑت تصویر بھی بنائی جائے۔

اُن کی بدقسمتی کہ اُس وقت بلوچستان میں ایک بہت بڑے بحث مباحثے کے بعد دانش وراس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بزرگوں کے نام پر ایک درگاہی نظام قائم کرنے کی جو یہ تیاریاں ہو رہی ہیں، اُس کی حمایت اور حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔اس لیے کہ درگاہی نظام کی اپنی ایک hierarchy ہوتی ہے۔اور یہ علیحدہ سے اپنی ایک پاور بیس بنا ڈالتا ہے جو پھر زبردست قبولیت پانے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے عوام کو بری طرح جکڑ لیتا ہے۔ہمیں اندازہ تھا کہ ''صوفی ازم'' کی اصطلاح گھڑ کر اُس پر بہت شور وغوغا کیا جائے گا۔تاکہ اُس عوام کو گم مراہ کیا جائے جس نے مارشل لاؤں اور فیوڈلوں کی مزاحمت میں کچھ جان پیدا کی ہے۔''صوفی صوفی'' پکار کر دراصل اُس عوام کو ایک بار پھر فرماں بردار بھیڑوں میں تبدیل کیا جائے گا تاکہ سٹیٹس کو کے مزے چلتے رہیں۔ ہم مست کو حکمرانوں کے استعمال کا رومال بنانے نہیں دینا چاہتے ہیں۔..... آج بھی اور مستقبل بعید میں بھی۔

چنانچہ جب مست کے بارے میں اسلام آباد کے اُن لوگوں نے پوچھا تو بلوچستان کو پتہ تھا کہ اُس نے کیا کرنا تھا۔مست کی کوئی تصویر موجود ہی نہیں ہے۔لہٰذا صاف بتا دیا۔مگر اِن بے ایمانوں کی فرمائش تھی کہ اُس کی کوئی فرضی یا خیالی تصویر بنوا دی جائے۔یہ بہت خطرناک ہوتا۔ لوگوں کو آج سے دو سو برس قبل کے بلوچ معاشرے کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔وہ اس کی اِسی طرح کی اجلی، خوش شکل، خوش پوش اور مرغن شہری تصویر بنا لیتے جس طرح مسیحی دنیا نے حضرت یسوع مسیح کی گھڑ رکھی ہے۔آج حضرت یسوع مسیح کی اجلی چمکتی اور دلکش تصویر دیکھیں تو وہ آپ کو سسٹم کا باغی ایک چرواہا نہیں، بلکہ رومن ایمپائر کا ایک بادشاہ نظر آتا ہے۔یسوع کی تصویر دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ بادشاہ کے خلاف لڑتا رہا، کاہنوں، فیوڈلوں کے خلاف جدوجہد کرتا رہا اور غریبوں سے بھی غریب بن چکا تھا۔اُس کی شہزادوں جیسی صورت اور لباس و وضع قطع قطعاً نہ ہوتی ہوگی۔مگر سرمایہ داری نظام کے استحکام کے لیے اُس کی مرغن و مرصع اور پرشکوہ تصویر اور تصور سے زبردست کام لیا جا رہا ہے۔اب تو چے گویرا کی تصویر کی کشش کو بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے منافعوں کا ذریعہ بنایا

جا رہا ہے۔.....ہمارا مست اور اُس کی فکر بڑے خطرے میں ہے۔

اس سے قبل ضیا الحق کے رجعتی دور میں بھی، ہمیں یاد ہے کہ خواہ مخواہ ہمارے مست کو، اُس آمر کے لوگوں نے رائے ونڈ کی مسجد کا ملا بنانا چاہا تھا۔انھوں نے ایسی کوششیں کیں بھی۔مگر باطل بات کہاں چل سکتی ہے۔

دراصل ہمارا توکلی ہماری معدنیات کی طرح ابھی اُن کے ہتھے چڑھا نہیں۔اسی لیے بازاری بننے سے بچ گیا ہے۔مگر اس میں بلوچوں کا کوئی کمال نہیں۔مست کا کلام اور اُس کی فکر خود بھی بڑی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔فکرِ مست نفع، سود، قدرِ زائد، ذخیرہ اندوزی، استحصال، اور قبضہ گیری کی عمومی روح کے خلاف ہے۔مست آج کے دور کی ''منافع بخش'' انسان دوستی کی تنظیموں اداروں سے بہت مختلف تھا۔اُس کی انسان دوستی تو معاشی برابری سے مشروط و مربوط ہے۔مست کے انسانی حقوق بھی معاشی آزادی سے منسلک ہیں اور عورت کے حقوق بھی۔ایک استحصالی معاشی سماجی نظام میں سرمایہ دار اور مزدور، یا مرد اور عورت کے حقوق ایک جیسے ہو ہی نہیں سکتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل میں مستیں توکلی ہے کون؟.....صرف ایک بات آپ کو نظر آئے گی۔وہ یہ کہ مست مہر کرتا ہے، محبت کرتا ہے۔ایسی کمیٹڈ مہر جو وجود کو بھسم کر دیتی ہے۔گرم کڑھائی میں گندم کا دانہ جس طرح تڑپتا ہے، ذبح کیا ہوا مرغ زمین پر جس طرح تڑپے کھاتا ہے۔یہی حال محبت کے مارے مست کا ہوتا ہے۔وہ کبھی ہوش میں فصیح و بلیغ ہوتا ہے اور کبھی بے خودی میں غرق۔محبت کے زخم کی سب سے بڑی علامت (sign) محبت کرنے والے کی بے قراری ہوتی ہے۔

مسلسل بے کلی فریادِ پیہم
بڑی سفاک ہے یہ یادِ خوباں
جلا کر راکھ کر دیتی ہے دل کو
یہ چنگاری ہے کتنی شعلہ ساماں

شاہ لطیف

اور اس چنگاری کو محسوس کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ آپ خود محبت کے جال میں پھنس جائیں۔درد، ایسا درد کہ الامان۔غم، ایسا غم کہ لولاک تاریک ہو جائے۔دکھ، ایسا دکھ کہ فطرت کا ہر ذرہ ماتم کناں رہے۔

که سوك وائی حال دے سه دے په هجران کشے
پـــه خـــاطـــر دے تـصـور کـڑی دوزخیـــان

رحمٰن

اگر کوئی تم سے ہجر و جدائی کا حال پوچھے
تو اُسے چاہیے دوزخیوں کا تصور کر لے

دوزخی کیسے ہوتے ہیں؟۔ان پہ کیا گزرتی ہے؟۔یہی رہتی ہے کیفیت اتاہ محبت کی، اور یہی تھی حالت مست کی۔

فراق، جیسے مست کو برہنہ ہجر کے 440 وولٹ کا سامنا تھا، سموّ کی دوری اور سموّ کی یادوں کی نوک دار چبھن تھری ناٹ تھری کی گولی سے بھی زیادہ تیز تھی۔دل پہ لگے گھاؤ انسانی توقع سے زیادہ بڑے ہوں، اور مہر کے کچوکے سنجاوی کی مرچوں سے زیادہ جلا ڈالنے والے ہوں، تو یہ درد عام درد تو نہ ہوا، یہ تو بقول بلھے شاہ ''اولڑے دی پیڑ'' ہو جاتا ہے۔درد بے قراری کا خالق ہوتا ہے، بے چینی کا رحمِ مادر۔

چنانچہ مست جیسے ولی اللہ کا سارا فلسفہ دو لفظوں سے ہی پھوٹتا ہے؛ ایک ''تلاش'' اور دوسرا ''جدائی''۔اور انھی دو لفظوں کے درمیان اس کی زندگی بیت جاتی ہے۔سر پہ ڈنڈا لگے زخمی کی طرح اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں آپ۔

محبت کی تاب کی گہرائی کا کسی کو کیا پتا۔یہ تو بقول سچل بے ابتدا ہے، بے انتہا ہے۔مست کہتا ہے۔

سملئے لہراں چوکرغی پیلوشتغاں

ترجمہ:

سمو کی یادوں نے زمستان کی سردی میں جلے اک
نامی پودے کی طرح مجھے جھلسا ڈالا

تو جس شخص پہ یہ عمل کیا جا رہا ہو، اُس پہ کیا گزرتی ہے۔ انسان نیم دیوانگی سے جا ٹکراتا ہے۔ نہ وقت کا ہوش، نہ آس پاس کی خبر۔ بس یادوں کے زہر۔ یادیں اور راتیں.....اور مہر کے ماروں کی راتیں تو سال برابر طویل ہوا کرتی ہیں۔ ننگی زمستان کی تلخ راتیں نہ تو ختم ہونا جانتی ہیں اور نہ مختصر ہونا۔ مست نے اس طرح کی کئی راتیں ہجر کی جگر سوز آزار اور شب بیداریوں میں گزار دیں۔

چلّوی شف پہ نندغ و آزار
گوں حیالاں مں روش کثاں یکّار

ترجمہ:

موسم سرما کی سرد ترین راتیں میں نے تکلیف
اور فکر میں ڈوبے جاگ کر گزاریں

شب بیداریاں محبت کرنے والوں کی قسمت کی فہرست میں سب سے اوپر والے عذابوں میں سے ایک ہیں۔ جن کی کتاب محبت سے لبریز ہو صرف وہی اِس عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں اور اُنھی کو یہ وحشت جھیلنا پڑتی ہے۔ شبِ غم بری بلا ہے۔

رت جگے اور وہ بھی محبت کے مرض میں مبتلا مریض کے رت جگے !۔ وہ جو بلوچی میں ضرب المثل کا درجہ پانے والا شعر ہے ناں:

شف پرے دوروخان مہ یایا شئے
روش پرے شہرئے گپتغیں دزاں

ترجمہ:

مریض کے لیے خدا کرے رات نہ آئے
اور دن، گرفتار شدہ چوروں کے لیے نہ آئے

مست کیا کہے۔ دردِ فراق کے کرب کی کیا صنف، کیا زبان!! مختصر ترین الفاظ یہ ہو سکتے ہیں:

مں پہ سموآ بیثغاں شیدا او زھیر

ترجمہ:

میں سمو کے لیے شیدا ہو چکا ہوں، زہیر ہو چکا ہوں

اور اگر آپ چاہیں کہ اپنے درد کی گہرائی ناپیں تو آ جایئے ہم اُسے مست کے درد سے ناپتے ہیں۔ ہم مست کے دردِ مہر کو پیمانہ بناتے ہیں۔ مست کی فغاں سینے:

موتی جیسی خاتون کی یادوں نے جھلسا کر مجھے جکڑ لیا
دل دیوانہ ہے نادانوں جیسی ضدیں کرتا ہے
ضد کرتا ہے اور مانگتا ہے کٹھن چٹان کے زامر کا درخت
لاڈلے بیٹے کی طرح ضد کرتا ہے کہ اُسے اسی پیڑ کی پھلیاں (زلفیں) چاہئیں
دل، جو منتوں سماجتوں سے زیادہ طاقت ور نکلا
آ، اے محبوبہ، میں اس افتاد کا کیا کروں
سانپ کی طرح لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں، پہاڑوں کا رخ کرتا ہوں
تیرے کاغذی ہونٹوں نے مجھے لُو کی طرح گرما ڈالا ہے
موتی جیسے دانتوں نے شورے کی طرح جلا ڈالا مجھے
دلکش موٹی اکھیوں نے کوہ نَوردی پہ مجبور کر دیا ہے
.....میں کرگسی پرواز کرتا ہوا سندھ سے بھی پرے چلا گیا

ارے ہونا بھی یہی چاہیے۔ جب اس پھلی میں ہی ساری حیات بند ہو تو آپ اور امرت دھارا کیا مانگیے گا۔ مگر زامر بھی کیا؟ اصل بات تو خود ''درد'' ہے۔ یہی حیات بخش درد ہی تو جوہر ہے زندگانی کا۔ فراق کا درد جسے تولنے کے لیے کوئی ترازو نہیں، جسے ناپنے کے لیے کوئی میٹر نہیں:

مائے نی میں کینوں دساں

درد وچھوڑے دا

گو کہ مہر محض بلوچ خصوصیت نہیں ہے مگر ''بلوچ محبت'' کا مطالعہ انسان کو تکمیل اور خوش بختی ضرور عطا کرتا ہے۔ اس کی پیدا کردہ بے قراری ذرا مٹھا رند کے ہاں ملاحظہ کیجیے:

اس کی یادیں مجھے گھر بیٹھنے نہیں دیتیں

ٹھنڈے سائے میں بیٹھنا تک مجھے برا لگتا ہے

اور یہ جو سانپ کی طرح بل کھا کھا کر حملہ آور یادِ یار ہے نا! یہ ہر بار پچھلے کی بہ نسبت زیادہ گاڑھی، زیادہ پیچیدہ اور زیادہ زہریلی ہوتی جاتی ہے اور بقول ملا داد رحمٰن ملیری:

برتیش منی امن و امان

ترجمہ:

وہ میرا امن وامان لے گئیں

وہ جو ہمارا دوسرا دوست کہتا ہے:

دل پرے آں دوستاز ہیر بیثہ

کیث پرآں سیاہ مار چوٹہ وئے عہداں

نیم شفی کندی او آہستغیں جیاں

ترجمہ:

میرا دل اس محبوبہ کی یاد میں زہیر ہو گیا

اُس ناگ نما سیاہ زلفوں والی کی یاد میں

جو آدھی رات کے وصال میں ہنستی ہے

اور مجھے آہستہ سے ''جی'' کہتی ہے

مست کی سوانح عمری اور اس کے کلام کا مطالعہ کریں تو وہ بلوچ شاعر ملا نو محمد بمپشتی کے عشق کا عملی نمونہ نظر آتا ہے جس نے کہا تھا:

اس کے عشق میں میری حالت یہ ہے کہ

قلندروں کی طرح ننگے سر کھڑا رہتا ہوں

کبھی رنجیدہ اور کبھی ہوش میں ہوتا ہوں

دم بہ دم پیالے نوش کرتا ہوں

اور دیگ کی طرح جوش کھاتا رہتا ہوں

بلوچی کا ایک اور شاعر یوں کہتا ہے:

میرے دل میں عجیب خیال آتے ہیں

یہ دل مجھے لے کر جا کر دور کہیں پھینکے گا

دل پرانی یادیں یاد کراتا ہے

تھان پہ بندھے گھوڑے کی طرح ٹاپیں مارتا ہے

چھوٹے بچوں جیسی ضد کرتا ہے

اور اپنے بچے کے لیے بلبلانے والی ڈاچی کی طرح بلبلاتا ہے

عشاق کے مرشد حضرت جام درک کے الفاظ میں:

ششی جان جامئے زواں نال بیث

گھڑی عاشقانی گوزغ سال بیث

ترجمہ:

جام کا تن بدن جل جاتا ہے،

زبان سوکھ کر اونٹ کے پیر کی طرح سخت بن جاتی ہے

عاشقوں کا ایک لمحہ سال ہو کر گزرتا ہے

بلوچی، بھرپور بیان کر سکنے والی زبان ہے۔ بالخصوص محبت، ہجر اور اس کے درد کی کیفیات یہاں بہت عمیق اور پراثر انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

کون بڑا کون چھوٹا کی درجہ بندی کو آگ لگا دو۔ عصری طور پر شہ مرید اور جام کے بعد مست محبت کا درد بیان کرنے والا ہمارا کلاسیکی ستارہ ہے۔ انسان ٹھنڈی گہری آہ نکالے بغیر رہ نہیں سکتا۔

سمو کی محبت میں کندھوں تک ڈوبا ہوا ہمارا مست اپنا تجربہ یوں بیان کرتا ہے:

دوست پہ تئی مونجھاں چکھرا تنی بیثغاں
کوراں جھاگیناں مشکاں گوں بنداں ایر براں
سملئے دستاں یہ چلوئے آفی وراں

ترجمہ:

دوست تیرے غموں کی وجہ سے میں کتنا پیاسا ہو چکا ہوں
دریا کے دریا پی جاؤں، مشک کا مشک پی جاؤں، کچھ نہیں ہوتا
مگر سمو کے ہاتھوں سے ایک چلو پی لیتا ہوں
تو ساری پیاس مٹ جاتی ہے

ایسا ہی ہے۔ دوست کی یاد کا عذاب زندگانی کا ایندھن بن جاتا ہے، وصلِ یار ہی سٹیر ائیڈ ہے، ملاقات ہی فرسٹ ایڈ ہے:

جانوں ساڑیثہ اِشتہ پہناذ و سمبغاں
دام منی چمانی تلاں ژہ دیر بیثغاں

ترجمہ:

میرا بدن تشنج کی کیفیت سے نکل آیا، مجھے پلورسی والے درد سے چھٹکارا مل گیا
میری آنکھوں کی تہوں میں پڑے جالے دور ہو گئے

شمس تبریز والے مولانا روم نے اسی کی تصدیق تو کی تھی کہ:

محبت، محبوبہ کے گال کو تو گلنار بنا دیتی ہے
مگر عاشق کی روح کو خرچ کر دیتی ہے

مست نے اپنے درد کے علاج کے لیے بہت بے سود کوششیں کیں۔ مگر، حکیموں طبیبوں کے پاس اُس کے دکھ کا علاج کہاں ملنا تھا۔ ملاّ کو تو وہ ویسے ہی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ کیا کرے، کچھ بھی کارگر نہیں، کچھ بھی موثر نہیں۔

ٹنگ کناں کوہاں میں دے چو اولی عاشقاں
گار کناں ڈولے سملئے لحمیں اندہاں

ترجمہ:

میں بھی پچھلے عشاق کی طرح پہاڑوں میں سرنگ بنالوں
(کہ) کسی نہ کسی طرح سمو کی جلا ڈالنے والی یادیں گم ہو جائیں

شریف آدمی! محبوبہ کی یادیں کم کرنے نکلا ہے۔ بھئی یہ تو تقدیر نے تمہارے ہارڈ ڈسک میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ سلور یلینز نگ درد ہے یہ۔ آسمان بڑے اہتمام کے ساتھ ان اندوہ نما یادوں کا مین ٹننس ڈوز دیتا رہتا ہے کہ کسک، تڑپ، درد قائم رہے۔ (''عشق کی موجیں ہمیشہ بے کنار'': سچل)۔ ہاں، یکسانیت کے خاتمے کے لیے البتہ کبھی کبھار ڈوز بڑھا دیا جاتا۔ اور آپ ناقابلِ برداشت دکھ سے اس قدر زیر ہو جاتے ہیں کہ فرہاد کی طرح جبل کو سوراخنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک شخص کو دیکھا جس نے ہاتھ کی اپنی ہتھیلی کو بلیڈ سے پچاس ساٹھ چیرے لگا رکھے تھے، تازہ تازہ۔ وہ شخص ہیروئن کا نشئی تھا۔ اس نے بتایا کہ بدن میں درد اتنا تھا کہ اُسے مارنے کے لیے اس نے اپنی ہتھیلی چیر کے رکھ دی تا کہ ہتھیلی کا درد ایک لمحہ کے لیے ہی سہی جسم کے درد پہ حاوی ہو جائے۔ مگر کہاں؟۔ کاش سارے ہیروئنچی محبت میں مبتلا ہو جائیں تا کہ ان کے ابلیسی درد پہ محبت کا پاک درد حاوی ہو جائے!!

یہ عجب عشق تھا، مست کے الفاظ میں:

ئیں گنوخان و ئیں کہ مس جرّاں شینگلاں
سملئے سالانی زہیراں شنگیں تغاں

ترجمہ:

میں پاگل نہیں ہوں کہ میرا لباس اس قدر خستہ حالت میں ہے
مجھے تو سمو کی برسہا برس والی یادوں نے اس طرح بکھیر کر رکھ دیا ہے

اور سجنو! یہ زہیر، یہ یاد واقعی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ آپ ہڑبڑا کر ہوش میں آتے رہتے ہیں۔

مناں گیرہ کئے سمو کلاں ژہ وہاوا دریہغاں

ترجمہ:

مجھے جب سمو یاد آتی ہے تو نیند سے ہڑبڑا کر جاگ جاتا ہوں

مست دنیا کو کھو دیتا ہے، عاقبت کو دھکیل دیتا ہے۔ وہ بے کراں درد میں ڈھل کر خود مجسم درد ہو جاتا ہے۔

اندھاں دوراں مس گوں سموئے لحمیں غماں
دیذغاں کوراں پہ شفا سرشونہ نواں

ترجمہ:

میں سمو کی جھلسا ڈالنے والی یادوں سے زخمی ہوں
آنکھوں سے اندھا ہوں، رات کو راستہ نہیں دیکھ پاتا

رات تو بس تکلف ہے ورنہ عشاق جلتی دوپہر میں ہی ''گم'' راہ ہو جاتے ہیں۔ تمام دنیاوی رسومات ترک کر دیتے ہیں۔ ایک ہی ذات میں یوں پیوست ہو جاتے ہیں کہ دوسرے سارے حقائق اسی راہ کے تابع بن جاتے ہیں۔ دردِ یار، یا کمٹ منٹ!!:

جانِ جاں کے قریب تر جانا
درد کی راہ سے گزر جانا

لطیفؔ

سچل سرمست کے بقول درد سے عاجز آ کر انسان ناتوان ہو جاتا ہے کہ یہ دوزخ یار سے دوری کا نام ہے۔ اس درد کا بیانیہ جس طرح مست کے یہاں ہے، شاید ہی کہیں ہو:

تئ زہیر سمو پہر مس پہری آ نوخہ باں
چوکہیر انی آڑویں آساں روخہ باں

ترجمہ:

سمو تمہاری یادیں لحہ بہ لحہ نئی ہوتی جاتی ہیں
کہیر نامی لکڑی کی تیز ترین آگ کی طرح شعلہ فشاں ہو جاتی ہیں

یہ عشق کی آگ جلا کر بھسم کر دیتی ہے، گھما دیتی ہے، لسی کی ماندھانڑیں میں بلو دیتی ہے۔ اندھا کر دیتی ہے:

عاشقی شوکاراں لواری پیلوشتغاں
سردہ پاذی آ ستگغ و سیاہیں کیلڑاں

ترجمہ:

عشق کی طوفانی ہواؤں نے مجھے لُو کی طرح جھلسا دیا ہے
میں سر سے پیر تک کیلڑ کی طرح جل کر سیاہ ہو چکا ہوں

عشق کے درد کا یہ عمیق بیانیہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جس پہ یہ درد گزرا ہو۔ کوئی بے درد شخص محض، زورِ بیاں سے ایسے اتھاہ مصرعے نہیں کہہ سکتا۔ ایسی شاعری تو ڈونگھے احساس ذمہ داری، اٹوٹ تعلق اور آسمان شَق کر ڈالنے والے درد کی جڑوں سے ہی پھوٹ سکتی ہے۔ ایسا درد جو

timeless ہو جو bottomless ہو، جو Borderless ہو۔ ایسا درد کہ انسان نیم دیوانگی سے جا ٹکرائے ۔ نہ وقت کا ہوش ، نہ آس پاس کی خبر۔ بس یادوں کے زہر آب ناوک ہوں اور آپ کا برہنہ سینہ۔ اور ننگی زمستان کی تلخ راتیں جو نہ تو ختم ہونا جانتی ہیں اور نہ مختصر ہونا۔ مست نے اس طرح کی کئی راتیں ہجر کی جگر سوز آزار اور شب بیداریوں میں گزار دیں۔

عشق، ہزاروں عناصر و وجوہات سے مجتمع ہو کر، سمو کے حسن کو سب سے بڑا بہانہ جتاتے ہوئے، صحرائی گدھ بن کر، بے آرامی کی آتشیں چٹان پہ بندھے ہمارے ''پرومیتھی اَس جونیئر'' کا جسم نوچتا رہا۔ مست توکلی اسی بڑے پرومیتھی اس کا تو مرید و جانشین تھا جو افلاک سے لولا کی آتش عشق چُرا کر اُس کے دل کے بازوؤں میں تھما گیا تھا۔

اور ہمارا مست، عشق کے اِس ''بلتے بھانبڑ'' والے ماورائے پیائش تپش آگ کے ہاتھوں عرش قامت فریادیں کُوکتا صحرا صحرا بھاگتا پھرتا ہے۔ مہر و کمٹ منٹ کے اس اولمپک مشعل بردار کا ریچ ایک طرف بلوچستان کے ریگستان سے لے کر عربستان تک پھیلا ہوا ہے، تو دوسری طرف یہ ڈیرہ غازیخان سے دہلی تک وسعت رکھتا ہے۔

مہر کا لانگ مارچ کرتا مست کبھی دہلی میں ہوتا، کبھی کعبہ کی جھالریں جُھلاتا، کبھی سہونڑ، کبھی سخی سرور میں۔ جلو میں سینکڑوں لوگ لیے ثقافتی انقلاب کے مظاہرے کرتے ہوئے چار دہائیوں تک وہ خود اس انقلابی لانگ مارچ کی قیادت کرتا رہا۔ ایک ایسا انقلاب جس میں خون کا ایک قطرہ نہ بہا۔ اس انقلاب میں کوئی پاسداران نہ تھے۔ ہر بشر کی شراکت کاری کا انقلاب تھا یہ جسے، تزکیہِ نفس کی لازوال مثالیں قائم کرتے ہوئے سینچا گیا تھا۔ یہاں پر ہر انقلابی آرڈیننس کسی فرمان کی صورت نہیں بلکہ شعر کی صورت نازل ہوا، برملا، برمحل، ببانگِ طنبورہ۔ مست تیرے مجسمے کو لتار کی سڑکوں کے چوکوں پہ نہیں، احساس بھرے دلوں کی غزالی دھڑکنوں کے بیچ ایستادہ ہیں۔

اور بلوچستان .....!! بلوچستان تو اس کے عشق کا ویٹیکن ہے، ہمارے عشق کا ویٹیکن ہے..... بار بار پلٹنا اسی کی جانب کہ یہیں راحت ہے، یہی راہبر ہے، اور اسی میں امان ہے۔ کیا انتخاب ہے، کیا چناؤ ہے !!۔ شیرانی قبیلے کا توکلی مست اور کلوانی قبیلے کی سمو، عشق کا بلوچستان اور

انسانیت کی سب سے بڑی نعمت وحیِ عشق۔ ہم مری لوگ کس قدر پیارے ہیں افلاک کو!!۔

عشاق کے بلوچستان چیپٹر کی تاریخ میں شہ مرید اور توکلی مست دو بڑے جہاں گشت عاشق رہے ہیں۔ ایک کی محبوبہ کو سردار کے ہاتھوں چھنوا کر اُسے فراق کے راکھشس کے کھچار میں پھینک دیا گیا جب کہ دوسرے کو ایک شادی شدہ ناقابلِ حصول خاتون سے محبت دے کر جدائی کی ایذا گاہ میں پٹخ دیا گیا۔ اور دونوں کو ساری زندگی بچاؤ کی تلاش، سائے کی کھوج، اطمینان گاہ کی تگ ودو میں گزارنی تھی۔ شہ مرید ''فقیروں'' کے ساتھ ہو لیا (جس کی پیروی میں ایک صدی بعد شاہ لطیف ''جوگیوں'' کے ساتھ ہو لیا) جب کہ مست کے سفر تعداد میں اتنے زیادہ اور دورانیوں میں اتنے طویل ہیں کہ اُن کا ثانی ابھی تک یوٹوپیائیوں کی دنیا میں نہیں ملتا۔ روح میں قرار ہو تو جسم کو قرار ہو۔ مگر عشق میں جو روح، مچلے نہیں تو تین حرف ہوں اُس روح پر، اُس عشق پر۔ عشق تو جس قدر اصلی اور خالص ہوگا، اتنی ہی زیادہ بے قراری، بے خوابی، بے چینی نازل کرے گا۔ عشق اور بے قراری ایسے ساتھی ہیں جیسے ناخن اور گوشت، جیسے آنسو اور جھولی۔ مست کے اندر شدید خوشی اور گہرا غم باہم بری طرح مدغم ہیں۔ خوشی بھی آگ بن کر لپکتی ہے اور غم بھی جلتا کوئلہ بن کر دبو چتا ہے۔ عشق تو بقول خوش حال یوں بھسم کر دیتا ہے:

جیسے خشک گھاس میں آگ لگ جاتی ہو

ریاستِ عشق کے اصولوں میں بے قراری نعمت ہوتی ہے اور قرار مطعون۔ مست تو پکار پکار کر اعتراف کرتا ہے:

روحہ رولوآں دل گنوخیں پہ سملا
(روح کا آوارہ ہوں دل پاگل ہے سمو کے لیے)

اب میں ''رولُو'' کا ترجمہ محض ''آوارہ'' کر دوں تو یہ میری کم زور اردو ہے۔ ورنہ ''رولو'' تو آوارہ سے ہزار گنا بڑا اور وسیع مظہر ہے۔ اور روح کی یہ آوارگی لمحاتی نہیں ہے۔ یہ تو دل و دماغ کے ایک ایک ریشے کے اندر، ایک ایک سیل کے جینز گاہ میں کندہ ہوتا ہے۔ ایک بے انت پاگل پن ہے جو بے شمار چھوٹے چھوٹے دوروں سے مل کر بنتا ہے:

لہر منی جانا ریز گرنت ماری
موژہ کنت روح دل ہزار واری

ترجمہ:

بل کھاتے ناگ کی طرح زہر کی موجیں میرے جسم میں کروٹیں بدلتی ہیں
روح ودل ہزار ہزار بار لہروں کی زد میں رہتے ہیں

عشق کے درد کے آگے عقل، تعویز، ملا، مرشد ڈاکٹر کسی کام کے نہیں ہوتے۔ لہٰذا متبادل تلاش کرنا ضروری تھا اور متبادل صرف ایک بات رہ جاتی ہے۔ ہمارا یہ عاشق اپنے درد کا علاج بھاگتے رہنے، آس پاس کا پینو راما بدل بدل کر ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیرپا عرصے تک رنج وغم سہتے رہنا انسانی بس سے باہر ہو چکا تھا۔ لہٰذا مست بے زار کن اور پرآزار مقام سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور کسی بے آزار ماحول میں چھپنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

مست علاقوں علاقوں تلاشتا ہے قرار کو، جگہ جگہ در بدر پھرتا رہتا ہے توجہ ہٹانے کے لیے۔ مگر یہ خالصتاً داؤ پیچ نہ تھا۔ یہ تو عشق کی نازل کردہ جبلت تھی۔ جبلت ہی مہر میں مبتلا نہیں کرتی، مہر کی اپنی جبلت بھی ہماری زندگیوں کو بدل ڈالتی ہے۔ مہر بے قرار کرتی ہے۔ تب مست بے قراری میں بھاگنے دوڑنے لگ جاتا ہے۔

تئ کاغذیں رکاں چولواری تاداثغاں
کشکیں دتاناں، شورغ و پڑزی پکغاں
ریٹویں چماں پہ پواداں رلیں تغاں

ترجمہ:

مجھے تمھارے کاغذی باریک لبوں نے لُو کی طرح گرما دیا ہے
موتی جیسے دانتوں سے شورہ کی طرح پک گیا ہوں
بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے پہاڑوں میں آوارہ گرد بنا دیا

مہر دوڑیں لگوا دیتی ہے۔ محبت نقل مکانیاں کروا دیتی ہے۔ مہر پریڈ کرواتی ہے۔ تخلیق بھگا دیتی ہے۔ سمو اور شاعری مست کو سلسلہ ہائے کوہ کا سسی بنوا دیتے ہیں:

صبا بہ لطف بگو آں غزلِ رعنارا
کہ سربہ کوہ و بیاباں تو دادہ ای مارا

حافظؔ

ترجمہ:

اے صبا نرمی سے اس نازنین سے کہہ دے
تیرے عشق نے ہی ہمیں کوہ و بیاباں میں مارے مارے پھرنے کے حوالے کر دیا

عشقے مارے ایویں پھردے
جیوں جنگل وچ ڈھور

بلّھے شاہؔ

اور مست؟۔ مست:

گڈہ کاں مست کہ تدڑی ڈیھا درکفاں

ترجمہ:

بھاگ کھڑا ہوتا ہے مست کہ تدڑی کے پہاڑ پہ چڑھے

اور صرف تدڑی کا بلند و بالا پہاڑ ہی کیوں؟۔ مست تو کبھی بیہو کے عرش پر، کبھی سبی کے پیندے میں، کبھی قلندر کے سائے میں اور کبھی سرور کے دربار میں نظر آتا ہے۔ صحرا، لق و دق پٹ فیڈر، کوہ سلیمان کی بلندیاں۔ گھسٹتے اونٹوں کے کارواں کے پیچھے، اڑتے کونجوں کی قطار کی معیت میں۔ ہر وقت متحرک، ہر سمے پاؤں پاپوش میں..... کھیر کے درخت میں سمو، پرپغ کے پھول میں یار کا چہرہ، تنڑا کی چوٹیوں پر محبوبہ، چودھویں کے چاند میں سمو کا درشن، چمرؔی کے چکور کی آنکھوں میں اس کا عکس، سندھ کے ٹرین پہ سمو کے گدھے کا گمان، تونسہ کے بڑے مرشد کی سمو کے منشی کے

بطور تعیناتی.....وہ اس روحانی سمو کو مجسم دیکھنے کی آس میں دکّی سے روجہان اور سہونڑ سے دہلی گھسٹتا رہتا ہے۔سمو کے لیے اس کا پاگل دل اس کی روح کو آوارہ بنا ڈالتا ہے۔اور وہ اپنی محبوبہ کے لیے:

بانکئے رندا رلّاں داں کیچ و مکراں
باورہ کاریں تتکغاں دیریں الکہاں
زغریں ہوں چماں مستغاں بازیں چرّ غاں

ترجمہ:

مالکن کے پیچھے کیچ ومکران تک گھسٹتا رہتا ہوں
یقین کرو بہت دور دراز علاقوں تک بھاگتا رہا ہوں
اس قدر چلنے سے میری آنکھوں میں خون جم چکا ہے

آپ اسے گھومنا پھرنا یا سیلانیت کہتے ہیں۔آپ عشق کے بے کراں تڑپاتے سمندر میں لکڑی کا ٹکڑا بن جاتے ہیں۔شرق وغرب،قطب وجنوب مست عشق کی ٹھوکروں کا فٹ بال بنتا ہے۔کہیں قرار نہیں کوئی راحت نہیں،کسی پل آرام نہیں۔بے چین روح پھرکی کی طرح گھما ڈالتی ہے۔عشق کا ایندھن ہے کہ اس کی سپلائی بند ہی نہیں ہو پاتی۔تیز گام بن جاتا ہے مست۔

پیاذغیں پاذاں ڈھاڈرو بیجی آ گزاں
کچڑو شاخا آتکغاں بانبورئے دہاں
چیارمی روشا کانہلو شہرا آتکغاں

ترجمہ:

میں پا پیادہ ڈھاڈر اور بیجی سے گزرتا ہوں
کچڑو شاخ پہ،آجاتا ہوں بانبور کے علاقے میں
چوتھے دن کاہان شہر پہنچ جاتا ہوں

جیسے پیچھے لشکر لگا ہوا ہو۔یا وہ کوئی تیز رفتار قاصد ہو،یا مالک ڈاکوؤں کے تعاقب میں جارہا ہو جو اس کا اونٹوں کا بگ بھگا کر لے جارہے ہوں.....کچھ نہیں،بظاہر کچھ نہیں۔یہ تو اب اس کے اندر کے انجن میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔سمو نے پورا سسٹم ہائی جیک کرلیا تھا۔عشق نے دنیاوی طور اطوار،رویوں رابطوں،ضرورتوں اور احتیاجوں سے مست کو بلند کر دیا تھا۔ٹرانسپورٹ، مکان حتیٰ کہ خورد ونوش بھی متاثر ہو گیا:

ترجمہ:

طعام نہیں میں جنگلی میوے کھا کر گزارہ کرتا ہوں

وہ جو ایک اور درویش نے کہا تھا:

دکھ میری روٹی اور کانٹے میرا سالن
ہجر کا چولا پہنے ہوئے ہوں

ریاست قلات کا ایک خان تھا،خان محبت خان۔اُسے عشق کے ناگ نے ڈسا تھا۔تو اس نے یوں کہا تھا:

عشق کی راہ پر دوڑنے والے
بمشکل ایک آدھ نوالہ طعام کا چکھتے ہیں
نہ زندوں میں شمار ہوتے ہیں نہ مردوں میں

چنانچہ مست کا بیمار دل اور عاشق روح اُسے بلوچستان بھر میں بھگانے پر مجبور کرتے ہیں:

روح مناں شیث کہ بیا تر اپئے کوہاں براں
مس تراشوں داراں املّانی دروشماں

عشق کی کارستانیوں کو اسی کارواں کے ایک اور امیر،شاہ حسین اس طرح بیان کرتا ہے:

اے فراق! تو نے کس کو سکھ سے سونے دیا ہے؟
یوسف کو کنویں میں گرا دیا
رانجھے کو مویشوں کا چاکر بنا دیا
زلیخا کا نصیب ہیر کو بھی ملا
صابر کے بدن میں تو نے کیڑے ڈالے
سلیمان نے بری حالت میں رحلت کی
سسی کو ریگستانوں میں رلایا
سوہنی کو دریا کی لہروں میں بہا دیا
مجنوں، لیلیٰ کے غم سے جنگل میں سوکھتا رہا

اِن سارے عاشقوں کے قافلے کا، میرا مست اپنا سفر نامہ یوں بیان کرتا ہے:

پاذاں نال بستہ پہ ڈغارانی جھاگغاں
چماں ہوں مستاں پہ شفانی گوئذ وہاویاں

ترجمہ:

مسلسل سفر کے باعث میرے پیر اونٹ کے پیروں کی طرح پتھر کے ہو گئے ہیں
رَت جگوں کے باعث میری آنکھوں میں خون جم کر رہ گیا ہے

محبت کے چابکوں سے دوڑتے دوڑتے، دوڑنا خود ہی وطیرہ بن گیا۔ کیوں؟، کس لیے ؟، کس کے لیے؟ پتہ نہیں کون کسے تلاش کر رہا ہے، کون کس کے غم Dilute کر رہا ہے۔ بقول حافظؔ:

من بہ تَلاشِ تو روم یا بہ تلاش خود روم
عقل و دل و نظر ہمہ گمشدگان کوئے تو

تو ذریعہ ہی مقصد بن جاتا ہے۔ دوڑتے رہنا ہی منزل مقصود ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا مست توکلی

بھاگتا ہے، تدڑی کے پہاڑ چڑھتا ہے، کیچ و مکران چلا جاتا ہے، ڈھاڈر، وبیجی.....حتیٰ کہ اسی سفر و حضر و کھوج و مشاہدہ نے اُسے دلّی کو بھی دھکیلا، وہاں اُسے ہتک آمیز سلوک کا سامنا ہوا۔ مگر ایسا تو پھر ہوگا۔ مست ہی کی تو چوائس تھی بلوچستان کی پیری مرشدی کو ٹھوکر پر رکھے رکھنا، اور ڈی کلاس بنے رہنے کو جاری و ساری رکھنا۔ جہاں جوار جیسے کالے منہ والے جمع تھے۔ دہلی کے یہ بزدل ڈانٹ ڈپٹ اور برا بھلا کہتے ہیں: ''(افسوس) میرے باپ کے بیٹے مری یہاں نہیں ہیں۔ نہ سردار مہر اللہ خان ہے نہ شہداد شیرانڑیں ہے۔ نہ حملہ کرنے والا وڈیرہ لاکھا موجود ہے۔ نہ میر حسن ہے نہ یار محمد نوشانڑیں، نہ شہباز خان ساتھ ہے جو حملہ آوری میں یکتا ہے، نہ ڈیرہ بگٹی کے معزز راہجہ ہیں، کچھی کا سہراب خان ڈومبکی بھی یہاں نہیں ہے، میران نہیں ہے، میوہ نوشانڑیں نہیں ہے، ہیتان اور باشیل مسوری بھی نہیں ہیں۔ بارکھان کا قادر خان مزارانی بھی یہاں نہیں ہے''۔

مگر، یہاں دہلی کا چین بھی دیر پا نہیں ہوتا تو سمو کا دیدار کرنے وہ حج چلا جاتا ہے، جی ہاں سمو کے دیدار کے لیے:

حاجی پہ حجا مس سملہ دیذارا رواں

اس مسافری، پردیسی اور وطن بدری میں بلوچستان کی محبت کس قدر بڑھتی ہوگی۔ اس کا حال تو مست کا ایک ایک مصرع بتاتا ہے۔ اُسے اپنی جنم بھومی کا ایک ایک شخص یاد آتا ہے۔ ایک ایک چشمہ، ایک ایک ہرن.....مست بلوچستان کا شاہ لطیف بن جاتا ہے۔ ایک ایک جام میں بیجی دریا دیکھنے والا مست جہاں بھی ہوتا اس کے تفکر کے پیر ماوند منجھرا میں گڑھے ہوتے۔ اس کی شاعری پڑھیں تو لگتا ہے وہ کھتونی اور خسرہ ناپنے والا پٹواری رہا ہے۔ مست بلوچستان کا پٹواری تھا۔ مگر یاد رہے، چار سو روپے کی تنخواہ کا پٹوار پن اَور ہوتا ہے، محبوب کو تلاش کرنے کا پٹوار پن اور۔

مست نے عشق کی بے چینی میں گھڑیال کی سوئیوں کی طرح اپنے وطن کا چپہ چپہ چوما۔ بے قرار مست نے واحد ٹھکانہ نہ رکھا، تیاگ دی اس نے دنیاداری کی اولین نشانی..... یعنی گھر داری۔ وہ جوگی بنا صحرا کا، سندھ کا، ڈیرہ غازی خان کا، پہاڑ کا.....بلوچستان کا۔ اور یوں وہ وطن کے چپے چپے سے واقف ہو گیا۔ سب سے بڑا جغرافیہ دان بن گیا بلوچستان کا۔ اُسے اس

علاقے کے ہر زاویے سے عشق تھا، ہر ڈھلان، ہر وادی، ہر نخلستان عزیز تھا۔ پچھلی بار فلاں درخت کتنا چھوٹا تھا اب کے کتنا بڑا ہو گیا۔ فلاں چشمے کا کڑوا پانی اس بار میٹھا ہو گیا۔ فلاں خشک پہاڑ میں بارشوں کے بعد چشمہ پھوٹا ہے۔

فطرت کا تغیر و تبدل اس کی سوچ کو بھی ساکت و جامد نہ رہنے دینے کا باعث بنا۔ ہر گھڑی تبدیلی، ہر ساعت ارتقا۔ بلوچی زبان میں بالخصوص، اور بین الاقوامی ادب میں بالعموم، مست جیسا کوئی شاعر نہیں جس نے اس نرالے اور تفصیلی انداز میں اپنے وطن کے علاقوں کا خوب صورت موسیقی بھرا تذکرہ کیا ہو۔ ہر بات کے پس منظر میں بلوچستان کے درخت و سبزہ و کوہ و دمن رہے۔

مست کی بے قراری کو دوام رہا۔ ایسی بے قراری تو واقعی جہاں گشتی عطا کرتی ہے اور مست واقعی بلوچوں میں سب سے بڑا جہاں گشت رہا ہے۔ وہ پوری عمر صحرا نورد رہا، بَن، کوہستان، بیابان.....سرگردان، پریشان۔

امبرا کولوالغی بیثا
مارا ماں سندھارلغی بیثا
لاری مں گز ّاں ٹنگغی بیثا
دیم پہ سند ھئے کچھاں بیثا

ترجمہ:

امسال ہمیں کولو چھوڑنا پڑا
ہمیں سندھ کی ٹھوکریں کھانا پڑیں
اپنی بندوق گز نامی درخت پر لٹکانی پڑی
ہماری منزل سندھ کی وسعتوں کی طرف ہوئی

بار بار سندھ، بار بار ہند۔ بار بار ماوند، بار بار تدڑی۔ بار بار سبی، بار بار ڈیرہ بگٹی،

بار بار چوٹی بار بار بیہو۔.....محبوب کی زہر میں بجھی تلوار کے گھاؤ مست کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے:

تئ زھیراں مں سندھہ چو بیٹاں گار کناں
مں شتو سندھا ژہ مژو جھنگاں گوئستغاں
پاذاں نال بستہ پہ ڈغار انی جھا گغا ں
چماں ہوں مستاں پہ شفانی گو ذوہا وہاں

ترجمہ:

تیری یادوں کو سندھ کے صحراؤں میں کھو دینا چاہتا ہوں
میں سندھ کے دھند آلود جنگلات سے آگے گیا ہوں
مسلسل چلتے رہنے سے پاؤں اونٹ کے پیروں کی طرح سخت ہو چکے ہیں
رت جگوں کے باعث آنکھوں میں خون جم کر رہ گیا ہے

وہ جو ''تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا'' والی کیفیت ہے ناں، وہی تو مست کو مست کیے رکھتی ہے، مستوں کو مست کیے رکھتی ہے۔ کوئی ناچ رہا ہے، کوئی سندھ و ہند بھاگ رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے۔ کوئی زمینیں کسانوں میں بانٹ رہا ہے، کوئی پیرس کمیون کر رہا ہے۔ کوئی ساگاں، کوئی کاسٹرو، کوئی ہاکنگ.....وابستگی اور کمٹ منٹ آپ کو یا'' بھاگیا'' بنا لیتی ہیں یا پھر ''سُنیا''۔.....اس ڈگر میں دنیاوی باتیں کہاں چلتی ہیں۔ جو چیز یہاں ہم ''زمانہ ساز'' لوگوں کے ہاں معیوب ہے، وہ وہاں سر کی بازی لگانے والوں میں مستحسن۔

محبوبہ کے فراق میں یہ ملامت کی بات نہیں
اگر تیری دونوں آنکھیں روتے روتے باہر نکل آئیں،
پھر بھی روتے رہو.....

خوشحالؔ

مست اسی عارضے میں مبتلا تھا۔ آنکھ روتی تھی، دل روتا تھا، روح روتی تھی۔

لیکن غور کریں کہ اگر مست کے پاس سمو کا غم اور عشق کی عطا کردہ تڑپ نہ ہوتی تو وہ کس قدر ایک بے نور شخص ہوتا۔ وہ ایک عام سا چرواہا ہوتا جس کی زندگی چار بھیڑوں کے گرد ہی رہن رہتی اور بالآخر ایک بے مقصد موت کے حوالے ہو جاتی۔ موت، بیماری، اور جنگ اسی طرح اُس کی مقسوم ہوتیں جس طرح یہ دیگر بلوچوں کی قسمت میں ہیں۔ مست کو تو محبت کے اعتراف نے بڑا بنا دیا، دل گداز اور درد آلود بنا دیا۔ اور دل کے انھی درد بھرے زخموں کو پنکھا جھلنے وہ کبھی اِدھر بھاگتا کبھی وہاں پناہ تلاش کر رہا ہوتا۔ اور دل کو تسلی دینے گویا سمو کی ہم شکل ڈھونڈتا پھر رہا ہوتا تھا۔ (خدا خبر اصل میں کیا شکل کیا صورت تلاش کرتا ہوگا وہ!!)

عشق کی بے قراری عاشق کے لیے تحقیق و ریاضت کی ایک قوتِ متحرکہ کام کرتی ہے .....اور کُل سیر و فی الارض سے بڑا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر، یہ ساری تباہ کن نعمت مست کو کیسے ملی تھی اس کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ایک مصرعے سے گزارہ ہو سکتا ہے تو میں یہاں نقل کر دیتا ہوں:

مہرباں بیثو بہانغے سموئے کثئی

ترجمہ:

مہربان تو خود ہوا (رب)، بہانہ سمو کو بنا دیا

بکتاش کو بھی محبوبہ نے یہی کہا تھا:

تورا این بس نباشد در زمانه
که تو این کار را باشی بهانه

سمو اور اس کی یادوں نے مست کے من میں وہ آگ لگا دی جس سے اس کا تن تڑپا، اس کا من مچلا، اس کے گناہ بھسم ہوئے اور وہ خود پارے کی طرح کسی ایک جگہ کا نہ رہا۔ اُس کا من ہمیشہ سفر کو مائل رہا۔ تیز بارشوں آندھیوں طوفانوں بیماریوں میں سفر ہی سفر۔ کچھ دیر سمو کے فرضی یا حقیقی خیمے میں گزارتا، پھر چلتا۔ وہ بھاگتا اور ستا تا سمو ہی کی توصیف کرتا۔ سمو جو لیموں بھرے درخت کی

طرح تھی، اُس موتی جیسی محبوبہ کی یادیں اسے تڑپاتی رہتی تھیں۔ اُس کا دیوانہ دل نادانوں جیسی ضدیں کرتا ہے۔ اُس کا دل لاڈلا بیٹا بن کر کٹھن و بلند چٹانوں پہ اگلے زامر درخت کی پھلی لا دینے کی ضد کرتا ہے۔ وہ اس ضدی دل کا کیا کرے جو نہ بہلائے بہلتا ہے، نہ منتوں سماجتوں سے لُبھتا ہے۔ وہ زہر بھرے سانپ کی طرح لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے، زہر اُسے تھمنے رکنے نہیں دیتا۔ وہ کوہستانی کٹھنائیوں پہ چڑھنے لگتا ہے۔ سمو کی یادیں، اس کے کاغذی ہونٹوں کی یادیں اُسے بھسم کرتی جاتی ہیں، اس کے موتی جیسے دانت اُسے شورہ کی طرح آتشیں کر دیتی ہیں، اُس کی موٹی اکھیاں اسے چٹانوں میں رول دیتی ہیں.....تیز رفتاری سے، نیم بھاگ رفتار سے، حد و حساب سے بھی دور بھگاتی رہتی ہیں اُسے۔

مگر شاید اِس بیانیے سے مست کی تسکین نہ ہوئی۔ وہ اِس درد کی حدت و شدت کو مزید وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوگا۔ درد جو دوا مانگے۔ بس ایک اصل (مگر وہ بھی بعد میں بے کار ثابت ہوا) دوا تو سمو کی نقرئی ہنسی ہے۔ مگر وہ درد ہی کیا ہے جسے حاجت ہو دوا کی۔ یہ دوا اگر نا قابلِ رسائی ہو تو؟۔ درد کچھ اور بڑھے اور بڑھے۔ تو مست بھاگا، دوڑا، تریاق کی تلاش میں.....اتر۔ دکن۔ پورب۔ پچھّم۔

بلوچی میں مستعمل ''زھیر'' کا لفظ ''یاد'' سے کئی گنا زیادہ گہرا اور نازک ہوتا ہے۔ یہ روہانسی بنا ڈالنے والی ایسی یاد ہوتی ہے جس میں دوبارہ ملنے کی بے انت تڑپ موجود ہو۔ یہ تو لفظ ''باڑ'' سے بھی زیادہ لطیف اور پُر معنی ہوتا ہے۔ اور لحہ بہ لحہ نیا بن کے اُمڈ امڈ آنا کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے اس عذاب کی نمائندگی کرتا ہے جو مست کی روح پہ درے برسا رہا تھا۔ اور یہ عام آگ نہ تھی جو مست کو جلا رہی تھی۔ یہ دم بہ دم تازہ ہوتی یاد تھی۔ یہ تو کہیر نامی درخت کی آگ تھی جس کی آگ دیگر تمام لکڑیوں کی آگ سے زیادہ گرم ہوتی ہے۔ شعلہ بار آگ، زیادہ ہوتی حدت والی آگ۔ پھر مست نے ''شُوکار'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ یک طرفہ اور نشانہ لی ہوئی طوفانی ہوا ہے۔ جس کی رفتار نا قابلِ پیمائش ہو۔ اس عشق کے شوکار نے سبی جیکب آباد کی لُو کی طرح ہمارے اس بزرگ کو بھسم کر دیا اور وہ پورے کا پورا، جسمانی روحانی ہر طرح سے اس طرح جل چکا ہے جس

طرح ہم کوہستانی لوگ کیلڑ نامی ایک پودے کی ڈنٹھل کو آگ پہ پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ سخت ڈنٹھل ایسے نرم ہو جاتی ہے جیسے سجی کی ہوئی ران ہو۔ یہ آگ کس قدر سخت ہوتی ہے، رحمٰن بابا بتاتے ہیں:

لکہ اور دہ بیلتا نہ چہ پہ ما اوری
چالید لے گنڑہ اوردے پہ داشاں

بھئی محبت کے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ دردِ عشق درمانے نہ دارد۔ تو وہاں بھلا دو نمبر دوا، اِس درد کو مارنے کے قابل تھی؟۔ ہرگز نہیں۔ تو دوا کیا ہو؟۔ بھئی وہاں تو درد سے بھی کوئی بڑی تکلیف ہو جو اِس پہ عارضی عبور پا سکتا تھا۔ بھاگنا، بھاگتے رہنا۔ خود کو ہلکان کر دینے کی حد تک بھاگنا۔ چنانچہ عشق کی بے کلی مست کو نگر نگر بھگاتی رہتی ہے:

پڑتو مس میناں چو کہ پہ ہانی آ مرید
چوکہ پہ ٹّر اں اخترہ پولی گلّڑی

ترجمہ:

تم پہ عاشق ہوں جیسے کہ مرید ہانی کے لیے تھا
جیسے کہ گلّڑی صحرا صحرا اختر کو ڈھونڈتی رہتی ہے

اور یادیں تو ٹائی فائڈ بخار کی طرح ہوتی ہیں۔ آپ کبھی بھی Base line پہ نہیں آتے۔ موج کی حالت میں لہر آتی ہے، وہ ابھی جاری ہے کہ ایک اور بڑی لہر آتی ہے۔ وہ گزرنے نہیں پاتی کہ پھر دوسری چڑھ آئی ہے۔

مئے دلا لہرہ کایاں چوبشامی جڑاں
چوسمند ران و سانو نڑیں کور گوں اچّلاں

ترجمہ:

ہمارے دل پہ موجیں ایسی آتی ہیں جیسی ساون کی برساتیں
سمندروں کی طرح، ساون کے سیلابی دریاؤں کے چھالوں کی طرح

جب کسی انسان کا دل ایسے سیلابوں کی زد میں آئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ پل پل مرنا، پل پل جینا۔ ابھی سامنے سے آنے والی لہر سے نمٹے نہیں کہ دوسری طرف سے چابکیں مارتی ایک اور لہر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور اِن ہٹلری حملوں کے دفاع میں آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ محبوبہ کی جھلسا دینے والی یادوں کا دفاع آپ کریں بھی تو کس چیز سے کریں گے۔ ننگ دھڑنگ دل ہی تو ان زہریلی موجوں کا شکار ہے۔ سو اُسی نہتے دل کو ہی سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ تو:

گڈہ کاں مست کہ تدڑی ڈیھا در کفاں

ترجمہ:

بھاگ پڑتا ہے مست کہ تدڑی کوہ کی بلندیوں پر نکل جائے

اور یہ دوڑ، یہ فرار، یہ کوششیں ایک ایسے دشمن سے بچنے کے لیے کی جاتی ہیں جو ہر جگہ موجود ہے۔ بھلا عشق کی تڑپ سے لولاک کا کوئی مکاں مبرّا ہے؟ کوئی گوشہ کوئی درز، کوئی وادی ایسی ہے جہاں یادِ یار کی آمد ممنوع ہو؟۔ آیئے جلنے والے کے ساتھ ذرا دیر کو ہم بھی جلیں، شاید شفا ہو، شاید شفاعت ہو:

پیر ی با غار ئے تڑ و گھیرا ں سمبراں
منجھر کورا گوں گزاری آں گوئستغاں
حا جی پہ حجامس سملئے دیذارا رواں
پر تئ عیناں با ز ز ہیر مجنا بیثغاں
بیے ہواں روش کہ موسے واذگڑد ا (1) کناں
ربہ سنجھا لاں بیث منی گوانکادرمیاں
میری ہتھیا راں بندان ا و شاہایات کنا ں
پیلو یں سالے باغچیں سند ھا گار کنا ں
کو نج ژہ سند ھا بیا یاں ولدائیں مو سماں
کو نج کرا نکنت ومئے دلئے درمانہ نہ واں

مئے دلئے درماں سملئے و ہشیں کند غاں
گڑتغاں کونج کہ مس دِہ نیں واذگڑ دے کناں
آتکو کو نجی ولہر ے سنگت بیثغا ں
کونجا ں قطاریں مس دِہ گوں قطارا روا ں
کونج پرے سیلامس پرے سمو گندغا
کو نج پرے بالامس پرے پاذوگام اثا ں
سندھڑی اشتو کونج حرا سانا گوئستغاں
کونج گزنت دیما مس دِہ پہ سیوی تاہراں
دل منی ما ند ا ئیں پرے سمو مجلساں
بیگھ اے پہر ا ڈکنڑئے گوا ثا نا ئثہ (2)
روشہ آسا نا ژہ جہا زاں اُ ر گو کثہ (3)

ترجمہ:

پرسوں میں باغار کے ڈھلوانوں سے روانہ ہوا
منجھر اندی کو پیادہ پار کیا
حاجی جائیں حج کو، اور میں سمو کے دیدار کو جاتا ہوں
میں تمھاری آنکھوں کے لیے مجنوں کی طرح اداس ہو گیا ہوں
کاش وہ دن آئے کہ موسم لوٹ آئیں
خدا کو پکارتا ہوں کہ میری مدد کو آئے
امیرانہ ہتھیار سجا کر شاہ (حضرت علی) کو یاد کرتا ہوں
پورا ایک سال سرسبز سندھ میں گم کر دوں
کونج اگلے موسم میں سندھ سے لوٹ آئیں
کونج آوازیں نکالتی ہیں جو میرے دل کی دوا نہیں ہیں
میرے دل کا درماں تو سمو کے میٹھے قہقہے ہیں

کونج لوٹ رہی ہیں، میں بھی اب لوٹ چلتا ہوں
میں بھی آن کر کونجوں کی ایک ڈار کے ساتھ ہو لیا
کونج قطار میں، اور میں بھی اس قطار میں شامل ہو گیا
کونج سیاحت کو جب کہ میں سمو سے ملنے
کونج پرواز میں جب کہ میں پیدل چل رہا ہوں
سندھ سے کونج خراسان روانہ ہوئیں
کونج آگے بڑھتی ہیں، میں سبی میں رک جاتا ہوں
میرا دل سمو کے وصل کے لیے اداس ہے
شام کے وقت دَکھن کی طرف سے ہوا چلتی ہے
مشرق کی طرف سے جہازوں کا شور ہوا

سفر، مسافرت۔ ازل سے سفر، ابد تک سفر۔ سفر کو ثبات ہے، سکوت کا کوئی وجود نہیں۔ ستانا تو سفر کے راستے کی لزومیت ہے۔ بدرقعہ، ہم سفر، ہمراہ، راہنما سب سفر کے کل پرزے ہیں۔ سفر حق ہے، سفر برحق ہے:

سر اشی آ نی و ا غ مہا نڑ ا یا ں چکّثہ
ما وثی د ستئے بیر ک گوں پلّاں شپتغہ
لنگواں نو ر ا یا مِنہ با زیں د ا ثغاں
مست نواں شَلّ ئے (4) بلّڑ و (5) سیسا راِت (6) وراں
مس نہ بھلاّ ں کہ عاشقا ں رہ پیش د اشتغاں
سجّلا مس گو ں سنگتی آں گو ں کپتغاں
درّک وکر مو او مریذ ا سجینتغا ں (7)
پیر سُہر ی آ داثغا ں شہبا ز القا (8)
پیر ملتا نئے کل مذت آں گو ں بھاولا
شمس تبر یز واژ ھیں کئے مئے واہرا (9)

[**حاشیہ**:1۔واپسی۔2۔ہواچلی۔3۔شور۔4۔گرجانا۔5۔سمندری آدم خور جانور۔
6۔مگرمچھ۔7۔کرامت بخشا۔8۔بزرگی،کرامت۔9۔کمک،مدد]

ترجمہ:

بلند چٹانوں کی باگیں ناخداؤں نے کھینچ لی ہیں
ہم نے اپنے ہاتھ کا پرچم پھولوں سے سجالیا
نورا نے مجھے بہت منع کیا
''(کہ) مست پھسلنا نہیں کہیں سمندری جانور اور مگرمچھ تجھے نگل نہ جائیں''
''میں گم راہ نہ ہوں گا کہ عشاق کی راہنمائی مجھے حاصل ہے
ابھی حال ہی میں مجھے رفقا کا ساتھ نصیب ہوا ہے
درّک وکرمو اور شہ مرید نے مجھے کرامت بخشی ہے
پیر سہری اور شہباز قلندر نے مجھے ولایت عطا کی ہے
ملتان کے سارے اولیا بہاول کے ساتھ میرے مددگار ہیں
شمس تبریز آقا ہے میرا، آئے گا میری مدد کو۔''

مگر کیا یہ سفر محض سفر برائے سفر ہے؟۔کیا یہ کافی ہے؟۔سمونا می درد کا تریاق محض سادہ سا سفر ہو سکے گا؟۔فراق نامی چہل پا کا زہریلا درد محض مسافتوں سیاحتوں سے مدہم پڑ سکے گا؟۔ہم ''آئی لو یو'' کے ٹیکسٹ کرنے والے عام دنیا دار نوجوان کا ذکر نہیں کر رہے۔یہاں ہمارا واسطہ محض محبوبہ ہی سے کمٹڈ مست سے نہیں، بلکہ محبت سے بھی کمیٹڈ مست سے ہے۔بلکہ محبت اور فراق کے پیدا شدہ درد سے کمٹڈ مست سے ہے۔تو ذرا بھاری پن دکھاؤ نا!!:

دل حیا لانی بند غیں باز یں نہمتا ں (1)
ٹنگ کناں کوہاں مس دے چواولی(2) عاشقا ں
گار کناں ڈولے سملئے لحمیں (3) اندہاں

بانکئے رندا رُلاّں (4) داں کیچ ومکراں
باورا کاریں تنگغاں دیریں الکہاں
زغریں حوں چماں مستغاں باز یں چرّغاں
پر منا کایاں میرژہ اسُور (5) پتنڑاں
بنداں ہتھیاراں گیشترا پرتئ نہمتاں
نیم شفی پاساں کاتکاں پب ئے سرشماں
تام (6) مناں نیستیں مس وراں درشکانی براں
پلیں ہنجیران وپتر یکانی سُر براں
واڑتاں تئ دوستا سملئے جیڈی امسراں
پر یشتغاں پیغام زڑ تغا ں گوں زریں بانزراں
روحا پیغام سملئے زی سربیثغاں
روح گنوخیناں نشتغوشیرانہ جناں
دوستہ سینگھاراں پہ وثی محتاجیں دلاں
دوستہ ساران و ساراں (7) مولا ئے قدرتاں
یانوی آ گوں چیاریں یاران وپر یشتغاں
روضوا سونہہ ئے ما لکہ (8) تعریفا کناں
روشغاں داراں فرضاں اللہ ئے یات کناں
کلموا کاراں سورتِ یاسینا پڑ ھاں

[**حاشیہ**:1۔نیت ۔ارادہ ۔2۔ محبوبہ ۔3۔جلا ڈالنے والے ۔4۔تباہ حالی میں پیچھا کرنا۔5۔سندھ میں ایک جگہ کا نام۔6۔خوراک۔7۔تعریف کرنا۔8۔حسین دوست]

ترجمہ:

خیالات بھرا دل بہت سے ارادے باندھے
دل کرتا ہے ماضی کے عشاق کی طرح پہاڑوں میں سرنگ بنا دوں
تا کہ کسی طرح سمل کی جلا ڈالنے والی یادوں پہ قابو پا لوں
محبوبہ کے عشق میں کیچ و مکران تک خستہ حال چلتا رہتا ہوں
یقین کر لو کہ دور دراز علاقوں تک بھاگتا پھرا ہوں
اس بسیار گردی سے میری آنکھوں میں خون جم گیا ہے
میرے لیے نامی گرامی علاقوں کے میر چلے آتے ہیں
سفر پہ میری ہر تیاری تمھارے ہی خیال سے ہوتی ہے
آدھی راتوں کو پب کی وادیوں میں پہنچتا ہوں
میرے پاس طعام نہیں ہے، جنگلی درختوں کے پھلوں پر گزارہ کرتا ہوں
انجیر اور لال لال پتریک میری خوراک ہیں
تمھارا محبوب یہی کچھ کھاتا ہے، سمو کی سہیلیاں بھی یہی کھاتی ہیں
فرشتوں نے اپنے زرّین پروں کی تیز رفتاری سے میرے پیغام لیے
سمل کی روح کے سلام و پیام کل ہی موصول ہوئے
روح پاگل ہے جس کی بدولت شاعری کرتا رہتا ہوں
میں اپنے عاجز محتاج دل کی گہرائی سے محبوبہ کی تعریف کرتا ہوں
محبوبہ کی تعریف کرتا ہوں اور تعریف کرتا ہوں مولا کی قدرتوں کی
پیغمبر کی تعریف کرتا ہوں مع اُس کے چہار یاروں اور ملائکہ کے
روضۂ رسول اور مالک کی تعریفیں کرتا ہوں
روزے رکھتا ہوں اللہ کے فرائض ادا کرتا ہوں
کلمہ بھرتا رہتا ہوں سورۂ یاسین پڑھتا رہتا ہوں

لیکن کتنا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کہ جب آپ کا محبوب آپ کی دسترس سے دور، بہت دور ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ مست کے لیے طبعی طور پر سمو کا حصول اب مشکل تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مست محبت نام کی اپنی ریاضت، عبادت اور حتمی سپردگی سے عوام الناس سے لے کر بااثر ترین افراد پر اپنے لیے مکمل احترام حاصل کر چکا تھا۔ اب اُس کا ایک ایک فقرہ سماج میں حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اُس کی فرمائش ہی کافی تھی سمو کو حاصل کرنے میں۔ زندہ سماج اُس کے لیے حتماً کوئی قانونی اور انتظامی راہ نکال لیتا۔.....مگر مست تو خود کو اپنی ہی بلند درجگی کی رسی سے جکڑ جا چکا تھا۔ اب سمو کا حصول ناممکن اس لیے تھا کہ مست جسمانی تمناؤں کو روح کی بلند پروازیوں کے نیچے کچل چکا تھا۔ روح کی سربلندی سمو سے محبت کو اپنا زینہ بنا چکا تھا۔ مست اب سمو کے ساتھ ساتھ سمو کی چاہتوں کی پناہ میں بھی تھا۔ چاہت ہی منزل اور چاہت ہی راستہ بن چکی تھی۔ اور یہ دونوں قابلِ احترام تھے۔ .....منزل ناتمام تھی اور راستہ بے پایاں۔

اب کچھ واضح ہوگئی بات؟۔ جی ہاں، ہم عام دنیاوی محبت اور وصل کے سٹیج سے بہت بالاتر پہنچ چکے ہیں۔ ماورا۔ بہت بلند۔

اسی لیے ہم مارکیٹ اور منافع کے متعین کردہ ناپ تول سے اپنے اِس ساتھی کو نہیں ناپیں گے۔ ہم اب فہم و تفہیم کے بلند تر اور ارفع تر اوزاروں سے لیس ہیں۔ ہم اصطلاحات، اور درجہ بندیوں، کی دنیا سے باہر نکل چکے ہیں۔ ہم اب کارپوریٹ دنیا کے برانڈ ڈپن کی سفاکیوں سے نکل کر لولاکیت کی طرف آ چکے ہیں۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عاشق مست، جب سمو کی اندوہ ناک کرب بھری یادوں سے بے دم ہو جاتا ہے تو صحرا صحرا بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ درد بے دوا۔ کچھ بھی کارگر نہیں۔ اس کا سکھ چین چھن چکا، اس کے من میں کہرام اسی طرح مچا ہوا تھا۔ اسی لیے ہمارا شاعر لاچاری اور بے بسی کے آخری سیم اور سرحدوں تک جا پہنچا۔ وہ بنجارہ ملنگوں کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ پیروں، فقیروں کی درگاہوں میں پناہ لیتا ہے جہاں سب سے ''دردکُش'' گاڑھی سبز دوا عام مشروب کے بطور استعمال ہوتی ہے.....پُرخمار بھنگ۔ مست کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں چرس بھی

دانش وروں کی ان محفلوں میں استعمال ہوتی تھی۔ چرس جس نے حال ہی میں ایک ماہرِ فزکس کو نوبل انعام دلوایا۔ چنانچہ مست بھی وہاں دانش وروں کی صورت میں موجود فقیروں ملنگوں اور سجادہ نشینوں کے سرکل میں شامل ہوجاتا ہے۔ یادِ یار کی آفت انسانی برداشت سے سوا ہوجاتی ہے تو پکار اٹھتا ہے۔

بیاریں مئیں پوڑ اکہ اند وہاں دیپانے کناں
چرس اوار بنت و چا بکے بھنگانہ جناں

ترجمہ:

میری چلم لاؤ کہ اُسے اندوہوں کی اوٹ بنالوں
اس میں چرس ڈالتا ہوں، بھنگ چڑھاتا ہوں

تو راستے ہی جدا ہوگئے۔ اُن سارے لوگوں نے گناہ کمایا جنھوں نے مست کو ضیا الحق کے دور میں ملاّ بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ سب دوزخ کمائیں گے جو کارپوریٹ دنیا کی تعمیل میں مست کو صوفی بنانے کی کوشش کریں گے۔

چرس، بھنگ اور ملّ .....توبہ استغفر اللہ،
تو کلی مست اور ملاّ .....توبہ استغفر اللہ۔

مگر نہ چرس نہ بھنگ۔ بھلا فراق کی آگ اس طرح بھی کبھی بجھ سکی ہے کہیں؟

مست کو مولوی گیری سے چڑ تھی۔ وہ اپنے دوسرے سینئر، ہم عصر یا بعد میں آنے والے فلاسفروں کی طرح ملاّ کو بلا جواز مظہر سمجھتا تھا۔ وہ اُسے عام آدمی کی زندگی میں دخل در معقولات کا درجہ دیتا تھا۔ بہت ہی رجعتی، قدامت پرست اور ناسماجی۔ طوطے کی طرح رٹنے والا پیشہ ور!۔ اِس دور اندیش نے اُس وقت ملا پر لب کشائی کی تھی جب ہمارے قبائلی معاشرے میں اُس کا وجود بھی برائے نام تھا۔ اس نے ڈیڑھ سو برس قبل کے معاشرے میں ملاّ کے اس منفی رول کو دیکھ لیا تھا، جسے فتوے بیچنے اور بقول اقبالؔ ''فی سبیل اللہ فساد'' برپا کرنے پہ منتج ہونا تھا۔ حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ مست نے ملاّ کے مقابلے میں عوام کو زیادہ معتبر و متبرک قرار دیا تھا:

جنتی باغاں امتی کاروانی بہی
نیم گوں حُوراں نشتغو شربت اِش ڈھی
نیم ملاّئیں حالوار کنگیں مس دفا
واناں فرقانا ،گڈہ دِہ دروہیں مس دلا
نیستنش دگ مس نوی ئے مڑاگہا

ترجمہ:

امت کارواں کی طرح جنت کے باغوں میں رواں دواں ہے
ان میں کچھ حوروں کے ساتھ بیٹھے مشروب پی رہے ہیں
کچھ ملاّ ہیں گونگے، جن کی زبان سے بات نہیں نکلتی
قرآن پڑھتے رہتے ہیں پھر بھی دل میں دھوکہ ہے
انھیں پیغمبرؐ کی محفل میں جانے کی اجازت نہیں ہے

صرف یہ نہیں، بلھے شاہ کے اس ہم فکر کا عشق تو ایسا عشق ہے جو بہت افضل ہے، برتر واعلیٰ ہے۔ جس میں ڈوب ڈوب کر وہ یہ اعلان تک کر جاتا ہے کہ:

حاجی پہ حجا مس سمّلہ دیذارا رواں

ترجمہ:

حاجی حج کرنے جاتے ہیں اور میں سمو کے دیدار کو

مست کے ہم مکتب، بلھے شاہ کی وہ بات بھی یاد ہے ناں؟:

حاجی لوک مکے نوں جاندے
میرا رانجھا ماہی مکہ

اب؟۔ کیا کہو گے نکتہ ورو! دانش ورو!۔ مست تو ملاّ نہیں بنا۔ ہماری آپ کی بنائی ہوئی فیوڈل اخلاقیات تو بھاڑ میں پھینک دی گئی۔ مست آپ کی روزمرہ کی طبقاتی دنیا کے جھمیلوں میں پڑا

ہی نہیں تو اب آپ اُسے کیا پاک اور پاک باز قرار دیں گے؟۔ اسے ملاّ مولوی، صوفی سنت کیا بنا پاؤ گے؟:

چہ نسبت ست بہ رندی صلاح و تقویٰ را
سماعِ وعظ کجا نغمہِ رباب کجا

حافظؔ

ترجمہ:

نیکی اور تقویٰ کو رندی سے کیا نسبت
کجا وعظ کا سننا، کجا ستار کا نغمہ

سو، مست توکلی عام عاشق نہ تھا، عام ماوشما میں سے نہ تھا۔ جھلساتے عشق میں اُسے اضافی ساز وسامان کی ضرورت اس لیے بھی شدت سے تھی کہ وہ تو مجنوں، سسی اور فرہاد کا پیروکار تھا۔ اور سمو کی یادیں کسی بھی ممکنہ عذاب کے گمان سے بھی زیادہ اذیت ناک تھیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس نے اپنے درد کے علاج کے لیے بہت بے سود کوششیں کیں۔ حکیموں طبیبوں کے پاس اس کے دکھ کا علاج نہ ملا۔ ملا کو وہ ویسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ تو کیا کرتا کہ کچھ بھی کارگر نہیں رہا تھا، کچھ بھی موثر نہیں رہا تھا۔ سلور یلیزنگ درد ہے یہ۔ آسمان بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو اندوہ نما یادوں کا ''مین ٹےننس ڈوز'' دیتا رہتا ہے کہ تڑپ، کسک، اور درد قائم رہے۔ میں بتاتا ہوں:

اگر آپ کسی بلوچ قوم پرست کے ہاتھوں شہید یا مردار ہونا چاہتے ہیں تو اس کے کسی بلوچ ہیرو کو بزدل قرار دیں۔ آپ کی زندگی تو جائے گی ہی، آپ غداری، ایجنٹی کا داغ بھی اپنے ماتھے پر لگوا بیٹھیں گے۔ مگر عشق وہ واحد بشری نعمت ہے جس میں بلوچ بھی ''نالاں چو بلبل نیم شفاں'' والی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بزدلی کی حد تک بزدل اور نرم دل ہو جاتا ہے وہ۔ بلوچی زبان میں ''بَوَ'' کا لفظ عمیق خواہش کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ماتم، درد، آہ اور، فریاد کی اتاہ گہرائی کا اظہار یہ ہوتا ہے۔ اور جام درک کہتا ہے ''بَوَ ئے بَوَ ئے کہ بومنی دوستئے'' (ہائے ہائے میری محبوبہ کے بدن کی خوشبو!!!!)۔

بلوچ بہادری مثالی ہے تو عشق میں اس کی آہ وفریاد بھی درد بھری ہوتی ہے، دیگر دنیا سے زیادہ بلند اور زیادہ گہری۔ میں آپ کی یادداشت کو گدگدانے کے لیے آپ کو سولہوی صدی لیے چلتا ہوں۔ جی ہاں، شمشیر زن بیورغ کی طرف۔ جس کا قبلہ درست کرنے کے لیے بلوچ حاکم چاکر خان سازش کر کے اُسے قندھار کے حاکم کے پاس بھجوا دیتا ہے اور وہاں جیل میں ڈلوا دیتا ہے۔ اور یہ جیل خانہ قندھار کے حاکم کے محل کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہم تفصیل سے بچنے کی خاطر محض حاکمِ قندھار کی بیٹی کا باپ سے مکالمہ دہراتے ہیں:

بوژ ہے باندی آ بلوچ ایغا
نیم شفاں چوشیں زار ہاں کلی
مارژہ وہاوئے شاذھاں کشّی

ترجمہ:

اس بلوچ قیدی کو رہا کر دیجیے
یہ نیم شب اس قدر دل خراش فریادیں گاتا ہے کہ
میں نیند کی شادمانیوں سے جاگ پڑتی ہوں

بلوچی کا لفظ ''زارِہ'' زاری سے تین گنا بری حالت ہے جو فریاد سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بیورغ جیسا بہادر آہ وزاری کرتا ہے۔ میں جام درک کی بابت کچھ کہنے کا اہل ہی نہیں کہ وہ تو مست کا بھی مرشد ہے۔ عاشقی میں بھی اور شاعری میں بھی۔ اس کا تو بس ایک ہی مصرع یہاں بیان کروں گا جو وہ عشقیہ شاعری میں درد کی کہانی کے اندر بار بار دہراتا ہے کہ:

ایش و ہمیش ایں مس تی اے گشاں

ترجمہ:

عشق کے درد کی ایک تفصیل تو یہ ہے، اب میں ایک اور سناتا ہوں
آپ سناتے رہیے، عشق کے درد کی تفصیل ناتمام ہے، ناتمام ہی رہے گی!!۔

''اندوہ'' کا لفظ جام اور مست میں مشترک ہے۔ وہ عشق کے درد کے لیے غم اور دکھ وغیرہ جیسے الفاظ کو غیر نمائندہ قرار دیتے ہیں اور ''اندوہ'' استعمال کرتے ہیں۔ اور اے میرے اچھے قاری' آپ ہی ذرا ہمت کرلیں اور ''اندوہ'' کی سرحدیں بیان کرنے کی کوشش کریں۔..... ناممکن ہے ناں؟ جی ہاں قطعاً ناممکن۔

چاہے تو بدی کے آستانے (سول سیکرٹریٹ کوئٹہ) کے مجاور بلوچ ادیب، اُسے استعارہ قرار دیں یا ضیا دور کے اکیڈمی ادبیات کے گارے سے بنے ادبی گھوڑے خوردبینیں لے کر ''حقیقی مجازی'' تلاش کریں، سچی بات یہ ہے کہ سمو کے ودیعت کردہ درد کو گھٹانے کے لیے مست والمست نے ہر انـلـجیزك(Analgesic) استعمال کی، ہر دوا آزمالی، ہر ڈاکٹر، حکیم، ہر ساتھی، ہر درویش اور ہر ملنگ سے مدد مانگی۔ جستجو اور تحقیق، مشاہدے اور مطالعے کے ہر مکتب میں شاگردی کی۔ ہم اس کی کچھ مثالیں، کچھ واقعات اور کچھ روایات یہاں بیان کرتے جائیں گے تاکہ پھر کوئی دنیاوی دانش ور مست کو کوئی ملاّئی قبا، کوئی عارفی اور تصوفی اگر بتیاں نہ اوڑھا سکے۔ اور مست کی اپنی شاعری سے بڑا گواہ، اور حوالہ ہوسکتا ہے؟۔

ترجمہ:

بالآخر کبھی نہ کبھی ہماری آہیں ان پر گریں گی
میں ولیوں کے ہمراہ سو بار سندھ جاؤں گا
حج کے ساتوں روضوں کی زیارت کروں گا

آیئے مائتھالوجی میں لپٹے ایک واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ سائنسی توضیح کی کوشش نہ کریں کہ مائتھالوجی کا بیڑہ غرق ہوجائے گا۔

ایک بار مست سنسان اور دشوار چٹانی علاقوں میں جوگ بھوگتے ہوئے ایک گہری کھائی میں اترا تو اس نے بھنگ گھوٹتے، ایک جوگی کو دیکھا۔ مست نے کبر اور ترنگ میں اُسے مخاطب کیا:

گھوٹغئے بھنگاں تہ اووہر گوشیں پخیر
پیالوے ماردئے کہ ایرکفاں سموئے زہیر

ترجمہ:

بھنگ گھوٹنے والے شتر بچے جیسے کانوں والے فقیر
ایک پیالہ مجھے بھی پلا دے تاکہ سمو کی یادیں اتر سکیں

کہتے ہیں کہ اُس دانا درویش کو اپنے لیے ''ہر گوش'' والے حقارت کے القاب پسند نہ آئے اور ایک طلب گار کی طرف سے ایک حاجت روا سے تخاطب کا یہ انداز، گستاخانہ لگا۔ اس نے خفگی سے مست کی طرف گھورا، نظریں اُس پر ٹکائے رکھیں اور آہستہ آہستہ نظریں آسمان کی طرف کرتا گیا۔ اس کی نظروں کی بلندی کے ساتھ ساتھ مست کے قدم زمین سے اکھڑتے گئے اور وہ ہوا میں معلق ہوگیا۔ مست کی فقیری درویشی سب سلب کہ عشق کی راہوں میں غرور تو فالج کا مرض ٹھہرا۔ مہرِ معلیٰ کے اس شاگردِ رشید کو فوراً اندازہ ہوا کہ عشق محض شدت، سوز اور تڑپ کا نام نہیں بلکہ اس میں تو صدق، وارفتگی اور انکساری بھی کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں تو گستاخی ہوچکی، شاہراہِ محبت کے اپنے سینئر ساتھی کا حدِ ادب مجروح ہوا۔ وہ کفّارے میں یک دم اُسی جوگی سے اپنی جوگ واپس بھیک مانگنے کو پکار اٹھا:

دے مناں بھنگاں او منی بیڑائیں پخیر
من وراں بھنگان و دیر باں سموئے زہیر

ترجمہ:

مجھے بھنگ دے دے، اے بیڑا جیسے بلند پایہ فقیر
تاکہ بھنگ پی کر سمو کی یادیں دور ہوں (1)

بڑے عاشق نے بڑے عاشق کی بڑائی تسلیم کی۔ عشق نے عشق کو گلے لگایا۔ معافی ملی، مست دھرتی پہ آیا۔ اُسے سلب شدہ متاع دوبارہ مل گئی۔ اس نصیحت کے ساتھ کہ راہِ طلب میں درجہ بدرجہ عشاق موجود ہوتے ہیں۔ اپنی عاشقی کے گھمنڈ میں دوسرے عاشق کے سر پہ پاؤں نہ رکھنا۔

جوگی نے بھنگ پی، بچی کھچی تلچھٹ مست کو دے دی۔ مست درویش کے قدموں میں بیٹھ کر اس کا جھوٹا پینے کا حقدار ٹھہرا۔ آگہی سے لبالب جام میں جو ذرا سی کمی تھی، اُس تلچھٹ سے بھر گئی۔ مست بغیر کسی ہاورڈ کے تکمیلِ علم کر چکا۔

اگلے مصرعے بھی ملاحظہ ہوں:

پیالوے نوشان و سجیث باں مس خاطرا
مئے دلالیٹ انت میذوئیں بھنگانی ملا ر
ہر کسی تنی ایں دلا میلی سید جلال

ترجمہ:

ایک پیالہ پی لوں گا اور میرا دل جاگ جائے گا

(گہرائی دیکھیے ''بھنگ اور جاگرت'')

گاڑھے بھنگ کا کیف دل پر چڑھ جاتا ہے
(یا) سید جلال سب پیاسے دلوں کو ملاپ نصیب کر

سندھ سے محبت بھٹائی صاحب کا معاملہ تھا یا پھر آج کے سندھی قوم پرستوں کا۔ ہم بلوچ تو اس لیے سندھ کو اچھا سمجھتے ہیں کہ ہمارا مرشد اُسے اچھا سمجھتا تھا۔ مست اُسے اچھا سمجھتا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

سندھڑی جوانیں پہ موالی ایں مڑدماں
بھنگ اڑزان و آف پریوانیں

ترجمہ:

سندھڑی اچھی ہے غریب انسانوں کے لیے
جہاں بھنگ سستا ملتا ہے اور پانی کی فراوانی ہے

لہٰذا مست سے کسی صوم کسی صلوٰۃ کی پابندی کی توقع نہ تھی۔ نہ ہی وہ کوئی تسبیح خواں ملا

ہوسکتا تھا۔ مگر، ضیاالحق کے زمانے میں، ریاست کو ادب میں صالحین کی بڑی ضرورت پڑی تھی۔ ریاست نے سکے پھینکے اس کام کے لیے۔ عہدے، مراعات کی پیشکش کر دی۔ جنگلوں پہاڑوں تک سے ملا مولوی جمع کرنے پر۔ چنانچہ رال ٹپکا دینے والے معاوضے کی زد میں لا کر سرکاری سرداری دانش وروں نے ہر عاشق کو کھینچ تان کر ایک مجسم ملاّ بنا دیا تھا۔ مست کو بھی ملاّ بنا ڈالا تھا۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ فیوڈل اخلاقیات کی تھالی چاٹنے والے دانش وروں نے توکلی کی بجائے اُسے ''طوق علی'' بنا ڈالا تھا۔ اُس وقت کے نظریاتی، اور زرخرید دونوں دانش وروں نے اُس پیر و مرشد مست کو بھی مولوی ثابت کر دیا جس نے کہ اپنی شاعری میں بغیر کسی JIT (جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم) کی تفتیش کے اپنے بھنگ پینے کا تذکرہ کیا تھا۔ ملاّ سازی کے جذبے سے سرشار دانش وروں نے مست کی وہ شاعری ہی حذف کر دی جو اُسے زکوٰۃ و عشر کی وصولی کا حق دار بنانے میں مانع ہوتی۔

چنانچہ مست کے جوا کھیلنے کی عادت کا تذکرہ ہی گول کر دیا گیا۔ حالاں کہ ہمارا مست دوستوئفسکی اور اس کے ''گیمبلر'' سے کئی گنا بڑی بازی لگاتا تھا۔ دوستوئفسکی کو تو اُس کی محبوبہ بیوی کی قربانیوں نے جوئے سے توبہ کروائی تھی مگر مست کے پاس کون تھی جو اپنے کپڑے اور زیورات ہر وا کر اُسے جوئے سے باز رکھتی۔

جب مست جوا کھیلتا تھا تو جسم کا لباس تک ہار جاتا تھا اور جیتتا تھا تو 60 بھیڑوں پہ مشتمل پورا ریوڑ عملاً خیرات کرنے کو جیتتا تھا۔ ایک بار وہ جوئے میں ایک پورا ریوڑ جیت آیا تھا۔ اور پھر سارے کا سارا ریوڑ خیرات کر ڈالا۔ مست ملاّ نہ تھا وہ تو بس مست تھا، میرا آپ کا، کامن مین کا مست۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں، آیئے ایک پورا قبیلہ اس کے ملاّ مولوی ہونے کے برعکس ہونے کی گواہی دے گا:

ماوند کے قریب زرگر نامی علاقہ ہے اور وہاں مریوں کا ایک ذیلی قبیلہ للوانڑیں رہائش پذیر ہے۔ اُن میں سے ابھی حال کے برسوں تک میرا جاننے والا ایک سفید ریش شخص زندہ تھا جس کا نام حاجی نصیو ہان للوانڑیں تھا۔ اس حاجی کے دادا کا نام تھا خدا بخش، مگر لوگ اسے ''سُر گڑدن'' کہتے تھے۔ ہمارا مست اسی سُر گڑن کے ہاتھ زرگر نامی مقام پر جوا کھیلتے ہوئے اپنا سارا مال و متاع

ہار گیا۔ تب، سوختہ مست نے پانسہ پلٹنے کی آس میں اپنے پاؤں کے جوتے داؤ پر لگا دیے۔ ہار دیے، اپنی پگڑی ہار دی، قمیص بھی ہار گیا۔ پھر بھی بات بنی نہیں تو ہمارا یہ ولی اپنی شلوار بھی ہار بیٹھا۔ جب پاس کچھ بھی نہ رہا تو بازی ختم ہوئی۔ مست جیتے ہوئے جواری کی جیتی ملکیت اس کے حوالے کرنے کو ساتھ کے پہاڑی نالے میں اتر گیا اور کپڑے اتار کر فتح یاب حریف کی طرف پھینک دیے اور اپنا جسم زامر کے پتوں سے لگا ڈھانپنے۔

سُر گڑ دن نے جواری کی سی شان کے ساتھ مست کی پگڑی، چادر اور قمیص تو رکھ لی مگر ستر ڈھانپنے کے لیے کم سے کم ضروری چیز، یعنی شلوار اُسے واپس کر دی۔ سمو بیلی نے خوش ہو کر اُسے دعا دی: ''تم نے میری شلوار مجھے لوٹا دی، میری دعا ہے کہ اب کوئی بھی جواری تم سے جوا نہ جیت سکے''۔

اُسی دن سے للوانڑیں کا یہ گھرانہ ''شرطی زئی'' (جواریوں کا قبیلہ) کہلایا۔ شرطی زئی آج بھی ہمارا ایک جانا پہچانا قبیلہ ہے۔ اور خود کو اپنے بڑے قبیلے للوانڑیں کی بجائے شرطی زئی کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اس قبیلے کے ساتھ آج بھی دوسرے سارے جواری جوا کھیلنے سے کتراتے ہیں۔ کسی بھی مری سے پوچھو۔

مگر آج تو بالخصوص صوفیوں کی شامت آئی ہے۔ اب صوفی کو بین الاقوامی استحصالی سامراجی نظام کے اندر رہ کر امن کا صوبیدار میجر بنا دیا جا رہا ہے۔ جالب ہوتا تو چیخ پڑتا: ''ظلم رہے اور امن بھی ہو؟''۔

بہت سے دانش وروں کے ہاں، صوفی گویا زرعی جاگیرداری معاشرے کی گلی سڑی اخلاقیات کا علم بردار ٹھہرا۔ عموماً اسی زرعی میدانی علاقے کی اخلاقیات کا پوستین ہمارے مست توکلی پر بھی ڈال دیا جاتا ہے جو زرعی نہیں، خانہ بدوش قبائلی دور کا دانش ور تھا۔ قبائلی دور کا ویلیو سسٹم جاگیرداری کے ویلیو سسٹم سے اتنا دور ہوتا ہے جتنی کہ ہماری زمین اور مریخ کے بیچ فاصلہ ہوتا ہے۔ چوں کہ دونوں سماجوں کی جڑیں اور بنیادیں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے پورے کا پورا اوپری ڈھانچہ الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ اعتقادات، اٹھک بیٹھک، اخلاقیات سب کچھ جدا ہوتے ہیں۔ جب تک

بلوچ سماج پر قبائلی نظام حاوی رہے گا، صوفی گیری، ملا گیری یہاں سے دور رہیں گے۔

بلوچستان میں ہمارے پاس یہ اکلوتا ولی ہے، اُسے بھی سرکار کے حوالے کرنا خود کو دیوالیہ بنانا ہے۔ اُسے اپنے عوام کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔ اُسے درباروں کی راہداریوں میں نہ گھسیٹا جائے کہ وہاں بہت تذلیل ہوتی ہے۔ ہمارے مست کو بس مست رہنے دیا جائے۔ ہم اُسے ملا یا صوفی بنانے کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔

آپ لاکھ صوفی کانفرنسیں کریں، صوفی موسیقی کی بین الاقوامی مجلسیں منعقد کریں، ہم اپنے مست کو آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ آپ مست کو کُل کے بطور کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اور اپنے مست کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے ہم نہ دیں گے۔

مست کا تو ایک سماجی پیغام ہے جو سرمایہ دارانہ طبقاتی لوٹ کھسوٹی نظام کے لیے موت ہے۔ آپ مست کے سماجی پیغام کو پرے پھینک کر ایک خول کو مست بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ کیسے قابلِ قبول ہوگا۔ انسانی نجات قافلے کے اِس سربراہ کو ''سٹیٹس کو'' کے ہتھیار کے بطور کون استعمال کرنے دے گا؟!!

توضیحات

1۔ بیڑا، مری کے علاقے میں ایک بزرگ گزرا ہے۔ اس کے متعلق لوگوں میں دلچسپ روایتیں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی کلّوئی بلوچ ایک چٹان کی دراڑ میں سات سال تک عبادت کرتا رہا۔ اسے کرامت مل گئی اور وہ مری علاقے آیا۔ جہاں ایک شادی ہو رہی تھی مگر وہ تو سوکھا کانٹا تھا، کچھ نہ کھا سکا۔ تب لوگوں نے پتلا ڈلغ (بلوچی ڈش جو گندم کے آٹے کے پتلے دلیے سے ملتی جلتی ہے) پکا کر اسے کھلایا (پلایا)۔ پھر شادی میں گھڑ دوڑ کے مقابلے کا اعلان ہوا۔ اُس بلوچ نے بھی خواہش کی کہ مجھے بھی گھوڑا دیا جائے میں اُسے دوڑاؤں گا۔ مگر جواب ملا کہ ہم نے اپنے گھوڑوں کو گندم کے توبرے اس لیے نہیں کھلائے کہ کوئی مخبوط الحواس شخص انھیں دوڑائے۔ وہاں کہیر نامی درخت کا ایک پرانا تنا پڑا ہوا تھا۔ وہ اُس پہ سوار ہوا۔ کہیر کا وہ تنا دوڑتے دوڑتے سب سے بازی لے گیا۔ لوگ اس بلوچ کے پاؤں پڑے اور اس کا نام پوچھا۔ اس نے اسی کھیر کے درخت کی نسبت سے کہا ''کہیری''۔ انھوں نے

اس کی شادی کرادی۔ اس کے دو بچے پیدا ہوئے۔ بیٹے کا نام بیڑہ رکھا گیا اور بچی کا نام صذو تھا۔ وہی بیڑہ تو وہ بزرگ بنا جو مست توکلی کا ضامن بنا۔

ع:

دئے مناں بیڑائیں پخیر بھنگاں
مں وراں بھنگان و دیر باں سموئے زہیر

مائی صذو نے کہہ رکھا تھا کہ میرے خواب میں جو شخص آئے گا، اسی سے شادی کروں گی۔ وہ جب بالغ ہوگئی تو کہا، میرا خاوند ''مُھمد انڑیں'' قبیلے سے ہوگا۔ جس کی ذیلی شاخ کھمبیرانڑیں ہوگی، اور اس شخص کا نام فلاں ہوگا۔ اُسی سے میری شادی کرادو۔ کہیری اسے اسی شخص کے گھر لے گیا اور اس کے والد سے کہا کہ میں اپنی بیٹی تمھارے بیٹے سے بیاہنے لایا ہوں۔ اس نے کہا کہ ''کیا پتہ ہے تم لوگ کون ہو، مراثی ہو، جت ہو، کون ہو؟''۔ مائی صذو نے والد سے کہا، ''ابا، پریشان نہ ہو۔ یہ حتمی طور پر مجھے قبول کریں گے''۔ صبح ہوئی تو لڑکے کے باپ نے کہا، ''آ جاؤ فقیر، خیر کی دعا مانگو، میں اپنے بیٹے سے تمھاری بیٹی بیاہ دوں گا''۔ بس وہیں شادی ہوگئی۔

اس خاتون کی ولایت یہ تھی کہ اس نے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی مُھمد انڑیں قبیلہ کسی اور قبیلے سے جنگ کے لیے روانہ ہو، تو مجھے پکار کر مال مویشی خیرات کر کے روانہ ہو۔ میں ان کا حق لے دوں گی۔

مائی صذو کی قبر نیساؤ کے علاقے میں ہے۔ اس کی زیارت گاہ کو ''مائی در'' (مائی کا دربار) کہتے ہیں۔ وہاں میلہ منعقد ہوتا ہے، خیراتیں ہوتی ہیں۔ مھمد انڑیں اور لوہارانڑیں کے علاوہ دوسرے سارے مری بھی اسے بزرگ اور ولی مانتے ہیں۔ ملاؤں نے ایک بار اس کا دربار جلا ڈالا تھا لیکن عوام نے پھر وہاں جھونپڑیاں بنادی ہیں۔ وہ وہاں جمع ہوتے ہیں، محفل میلہ مناتے ہیں، منتیں مانگتے ہیں، منتیں پوری ہونے پر خیراتیں کرتے ہیں۔

(حوالہ، محمد خان پیڑ دادانڑیں مرحوم، انٹرویو)۔

اور ایسے ویسے نہیں۔ مقابلہ تیز چلنے والے کسی انسان سے نہیں، سبک گام گھوڑے سے نہیں بلکہ وہ تو اس زمانے کے تیز رفتار ترین ہوائی مسافر و ہم سفر کے ساتھ پیدل چلتے تھے:

کونج پرے بالامں پرے پاذ وگام اثاں

ترجمہ:

کونج پرواز میں اور میں ان کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا رہا

****

مئیں دلاوہمیں گیشتر گوں بازیں چرغّاں
مں کہ روشے پہ جزغا و ہمی بیثغاں
مں ہواں روشا دیشہ ژہ گنجیں کوہ بناں
(گوں) مرمریں ترنپان اوپُڑی آنی جینہراں
یہ دغامے ماں سملئے گُلا نشتغاں
چارثوں عیناں لالیں چولیموئی براں
شو کثو درچیین ایں جنہ لہراں گپتغاں
دل گنوخے ناں کاری ناذانی انگلاں
انگلہ کنت ونامہ گیڑ درنگئے زامراں
گرّہ کنت بچیّ تہ بیار ہواں درشکہ براں
(نیں) ظالم وزوراخ بیشہ ژہ میڑ و منتاں
بیا اوو مہلینج مں گونے ڈایاں چوں کناں
ریز گراں ماری ، پہ پواداں دیمہ دیاں
تئ کاغذیں رکا ں ، چو لواری تاد اثغاں
کشکیں دتاناں شورغ وپڑزی پکغاں
ریٹوئیں چماں پہ پواداں رلّیتغاں
کرگزی بالاں مں شتو سندھا گوئستغاں

ترجمہ:

میرا من اکثر سفر و سیاحت چاہے
ایک دن جب دل بہت چاہا سیر کو
اسی دن میں نے کوہستانی دامنوں میں دیکھا

موسیقی بھری بوندا باندی میں، تیز بارش میں
کچھ دیر میں سمو کے خیمے میں بیٹھ گیا
وہ تو لیموں کے میوؤں جیسی خوب صورت ہے
موتی جیسی خاتون کی یادوں نے جھلسا کر مجھے جکڑ لیا۔
دل دیوانہ ہے نادانوں جیسی ضدیں کرتا ہے
ضد کرتا ہے اور مانگتا ہے کٹھن چٹان کے زامر کا درخت
لاڈلے بیٹے کی طرح ضد کرتا ہے کہ اسی پیڑ کی پھلیاں (زلفیں) چاہیے ہیں
منتوں سماجتوں سے زیادہ طاقت ور نکلا
آ، اے محبوبہ، میں اس افتاد کا کیا کروں
سانپ کی طرح لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں، پہاڑوں کا رخ کرتا ہوں
تیرے کاغذی ہونٹوں نے مجھے لُو کی طرح گرما ڈالا ہے
موتی جیسے دانتوں نے شورے کی طرح جلا ڈالا مجھے
دلکش موٹی اکھیوں نے کوہ نوردی پہ مجبور کر دیا ہے
میں کرگسی پرواز کرتا ہوا سندھ سے بھی پرے چلا گیا

****

تئ زہیر سمو ، پہر پہ پہری آ نوخہ باں
چو کہیرانی آڑ ویں (1) آساں روخہ باں
عاشقی شو کا راں لواری (2) پیلو شتغاں (3)
سردہ پاذی آ ستکغ وسیا ہیں کیلڑاں (4)
عاجزا نداں چو گنہگاریں مڑدماں
تئ زہیراں مں سندھہ چو بیٹاں (5) گارکناں
مں شتو سندھا ژہ مژ و جھنگاں گو ئستغاں

پاذاں نال بستاں پہ ڈغارانی جھاگغاں
چماں ہوں مستاں پہ شفانی گوئذو ہاویاں (6)

[حاشیہ: 1۔ جلا ڈالنے والی آگ، 2۔ لُو کی طرح، 3۔ جلا ڈالنا،
4۔ مضری کی جلی ہوئی جڑ، 5۔ بے انت صحرا، 6۔ بے خوابیاں]

ترجمہ:

سمو، تمھاری یادیں دم بہ دم تازہ ہوتی جاتی ہیں
کہیر کی لکڑی سی گرم آگ کی طرح جلتی ہیں
عشق کے شعلوں نے لُو کی طرح مجھے جھلسا ڈالا ہے
سر سے لے کر پاؤں تک جل چکا ہوں جیسے جلا ہوا کیلڑ ہو
اتنا بے بس اتنا عاجز جیسے گنہ گار لوگ ہوتے ہیں
تمھاری یادوں کو میں سندھ کی ریتلی صحراؤں میں جا کر گم کروں گا
میں سندھ کے دھند اور جنگلات سے بھی آگے چلا گیا
چلتے چلتے میرے ننگے پیر، اونٹ کے پیر جیسے بن گئے
رت جگوں کے باعث آنکھوں میں خون جم گیا ہے

****

شہر یں دلّی ئے چَسّ (1) و واسانی (2)
مچ اشت سندھہ کانڑیں سیاہ پُغیں
ہکّل و ھوڑایاں جزیدانی
دِھکّہ وو دھوڑایاں لغورانی
گوں نہ ینت اباّچ مری آنی
مہراللہ خان و شہذاذ شیرانڑیں

لاکھا وڈیرہ سر جُلو ؔانی
میر حسن خان ویارحمد نوثانڑیں
گوں نہ یث شہبازخان جُلوّانی
دیروہ راہیجو منڑایانی
کوچوآ سہراب ڈومبکی آنی
کوہلی میراں میوہ نوثانڑیں
ہیو تاں با ثیل خاں مسورانڑیں
برکھمہ قادرخاں مزارانڑیں

[حاشیہ:1۔لطف،2۔سیروتفریح]

ترجمہ:

(افسوس) میرے باپ جائے مری، یہاں موجودنہیں ہیں
مہراللہ خان اورشہدادشیرانی
یلغارکرنے والوں کے صف اول والا وڈیرہ لاکھا موجودنہیں ہے
میرحسن بھی نہیں ہےاور یارمحمد نوتانی بھی
حملہ آورشہباز خان بھی میرے ساتھ نہیں ہے
ڈیرہ بگٹی کے معزز راہیجہ بھی نہیں ہیں
کچھی کا سہراب خان ڈومبکی بھی موجودنہیں ہے
کوہلی میرساتھ ہے نہ میوہ نوتانی
نہ مسوری کے ہیوتان اور باثیل خان ہیں
نہ ہی بارکھان کا قادرخان مزارانی موجود ہے

****

مناظر کا ڈائریکٹر

سیلانی مست اپنی سرزمین کا ہر پہاڑ، ہر وادی اور ہرنخلستان دیکھ چکا تھا، پھر چکا تھا۔ اُسے اس کا ایک ایک مظہر ومنظرعزیز تھا۔اُسے ہر پتھر پہاڑ کے جذبات کا پتہ تھا،اسے درخت کا دکھ معلوم تھا۔ وہ گھاس کی صحت کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔وہ ریت،مٹی،صحرا کی زبان جانتا تھا۔وہ ہواؤں کی بات سمجھتا تھا، وہ پہاڑی ہرنوں کی آنکھوں کی چمک کوڈی کوڈ کرسکتا تھا۔ہم بہت انکساری کے ساتھ کہتے ہیں کہ عالمی ادب میں بالعموم اور بلوچی زبان میں بالخصوص ایسا کوئی شاعر نہ ہوگا جس نے مست کی طرح اپنے وطن کے ہرجغرافیائی گوشے اور مظاہراتی ہستی کا اس قدر خوب صورت، باریک اور موسیقی بھرا تذکرہ کیا ہو۔

ہر اچھے اور خیر پسند انسان کی طرح مست اپنے وطن کو آباد اور آزاد دیکھنا چاہتا ہے، وہ اس کے باسیوں (خواہ وہ آدم ہوں یا چرند پرند یا شجر وکوہ ہوں) کو خوش وخوش حال رہنے کی آرزو کرتا ہے۔فطرت کی یہ مسرت وانبساط اُس زمانے میں بھی، اور آج بھی رحمت بھری بارشیں ہی رہی ہیں۔زندگی کا جوہر ہیں بارشیں۔وصالِ باران سے کائنات کھل اٹھتی ہے۔کیا کاشت کار، کیا بھیڑ پال، کیا عام آدمی! بارش ہستی کا جوہر ہے۔اور مست اپنے محبوب وطن، اور اپنی محبوبہ کے وطن کو یہ آفاقی سوغات ہر وقت دینا چاہتا ہے۔ اُسے پہاڑ کی خاک آلود گال کا غم ہے، پرندوں کے کڑوے گندے جوہڑ کی محتاجی کا دکھ ہے،کوہی جانوروں کی پیاسی ارواح کا احساس ہے،قحط زدہ کھیتوں کی دراڑوں کی گہرائی وطوالت پہ تکلیف ہے، چراگاہوں کی نایابی کی بے چینی ہے، چرواہے

کی مقدس روزی کی کم یابی ناتوانی کی پریشانی ہے۔

.....مست بارش کے پورے پراسیس کا نگران بن جاتا ہے۔ بادلوں کے پاس راضی نامہ کرنے کا وفد لے کر نسیم سحری کا روانہ ہونا، بادلوں کا مان جانا اور اُمڈ اُمڈ کر نکلنا، بننا.....مست ماہرِ موسمیات بن جاتا ہے۔ وہ اپنی بھرپور شمولیت کے ساتھ مہار پکڑ پکڑ کر بادلوں کو کھینچ لاتا ہے، انھیں واسطے دے دے کر برسنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ بجلی کی چمک کا ذکر کرنے، بادل کی گرج بتانے، اس گرج سے سُر تال اخذ کرنے، بارش کی انواع گنوانے، پھر اس بارش کی نغمگی کو بھی ڈال کر ان سب پہ مشتمل فطرت کی سب سے مدھر موسیقی اور لطیف فلم کے رواں تبصرے کا ایسا سماں باندھتا ہے کہ روح یرغمال ہوجاتی ہے۔ پھر ان سب مناظر کے بیک گراؤنڈ میں سے سمو کا جھانکنا.....ارے نیچرلسٹوں کا امام ہے توکلی۔ مست انوائرنمنٹ کے، وائلڈ لائف کے سارے این جی اوز کا بانی چیئرمین ہے، بغیر معاوضہ لیے، بغیر جہازوں میں آنے جانے کے، بغیر فائیو سٹار ہوٹلوں میں رہنے کے، بغیر منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی کے دو رچار مخصوص الفاظ بولنے کے۔.....
اور ایسا بھی سماجی سطح پر بغیر سٹیٹس کو کا ذریعہ بنے۔

بارش کیوں؟۔ اس لیے کہ:

سمو گوں ما لارستانی ئے کوہ سراں
مالہ چارینی آفہ کاری سوریں زہاں
پاذشفا ذیا ٹھغیں مالانی پذاں

چنانچہ.....

عرضیں مئیں گوشوابدروی بے ہُوشیں جڑاں
ساکنیں سیماں گواریں سموئے بوذناں

اس لیے کہ،

لوغی لیموئے زامرہ چیڑا آف دیاں

مست کی حیرت کدہ شاعری میں دو مقامات ایسے آئے جہاں میں بالخصوص بہت بہت حیران ہوا۔ ایک: بھلا یہ بادل بنتے کیسے ہیں؟ مست کہتا ہے:

تاں زِرے کیث کہ مستہ کاں نیل بندیں جڑاں
(کون سا سمندر ابھر کر بادلوں کو بناتا/ مست کرتا ہے)

دو: پھر سمندر ہے کہاں۔ دو سو سال قبل کوہستانی مری قبائلی علاقہ میں جغرافیہ کا کیا پتہ ہوگا؟۔ مگر مست دلچسپ بات کہہ کر ہمیں حیرت زدہ کرتا ہے:

منّاں مئیں عرضا بنداں ژہ کیچ و مکران
(میری عرض مان کر کیچ مکران میں بادل بننے لگتے ہیں)

اگلی دلچسپ بات صرف مست تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ پوری لسانی تاریخ میں بلوچ شعرا کا وطیرہ رہا ہے؛ وہ یہ کہ وہ سیدھا بادلوں سے مخاطب ہوتے رہے ہیں۔ ایسے جیسے وہ آدمی ہوں، سن رہے ہوں۔ بلوچی زبان میں کمال بے تکلفی ہے۔ خواہ جان دار ہو یا بے جان۔

مست زندگی کا امیں بنتا ہے، زمین کا رکھوالا بن جاتا ہے، بارش کا منادی گر، شاعری کا کمانڈر اور بلوچی زبان کا بلیغ وارث۔ اُس کے بادلوں میں شادی والی ''گاٹ وگھمر'' ہے۔ ایسی تیز بارش برسائیں کہ محبوبہ کے خیمے اکھاڑ ڈالیں۔

ہم یہاں اس کی وطن دوستی، فطرت سے گہری یاری اور منظر نگاری کی استادی.....تینوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنے پہ مجبور ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اگر بارش سے قبل کی ویرانی کو دردناک انداز میں بیان کرتا ہے، اور پھر بارش کی اپنی کیفیات کا جادو جگا سکتا ہے تو بارش کے فوراً بعد کی خوب صورتی، اور پورے منظر نامے کے پرمسرت شانت ہوجانے کی خاکہ نگاری میں بھی کمال دسترس رکھتا ہے۔

وہ اپنے کلام میں لہلاتے کھیتوں، سرسبز و شاداب چراگاہوں، جنگلوں، رواں دواں دریاؤں، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشموں، خوبصورت جھیلوں تالابوں، بھانت بھانت کے

چرند پرند، پھلوں پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی جھنکار جگاتا ہے۔ ہنستے کھیلتے اور گنگناتے چرواہوں اور کسانوں کے خانوادوں پہ مسرت کی کیفیت کے بیانیہ میں، فطرت کی شکرگزاری کرتا جارہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محبت خود ہی سب سے بڑا سماجی پیغام ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے متعلقہ دیگر سماجی معاشی عناصر بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہم مست کے سماجی پیغامِ عشق کی بابت بات کر چکے ہیں اور ''مستیات'' کے دو اہم اور سماجی پیغامات یعنی عورت کی برابری اور امن کے پیام کا ذکر بھی کر چکے۔

کلام مست کے سماجی پیغام میں چوتھا اہم ستون وطن دوستی ہے۔ اس کے فکر اور اس کی تعلیمات میں وطن دوستی کو بہت اہمیت حاصل ہے..... وطن جو حاجی کا بھی ہے، سالک کا بھی۔ سردار کا بھی ہے، خرکار کا بھی۔ گوری کا بھی ہے کالی کا بھی۔ وطن جو پردہ ہے، پردہ پوش ہے۔ چرند کا بھی، شجر کا بھی..... اور جب وطن بلوچستان ہو اور اس کا قومی شاعر مستیں توکلی، تو پھر بلوچستان کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر، بلوچ قوم، اس قوم کی حرکت وسکنات، اس قوم کی تحریکوں اور اس قوم کی زبان کا بھرپور تذکرہ کیسے نہ ہوگا.....!

اور پھر، بلوچستان محض اس کا وطن تو نہ تھا۔ یہ وطن تو سمو کا وطن بھی ہے..... اور سمو مست کی محبوبہ تھی۔ تو پھر محبوبہ سے وابستہ کہسار، ندی دریا، شجر و پتھر، ہرن و پیپل، موسم و ماحول سے محبت تو دوچند ہوتی ہے۔ لہٰذا مست نے سمو کے دیس کی اس شان سے توصیف کی کہ یہی وطن، خود سمو میں ڈھلا۔ سمو بلوچستان بنی اور بلوچستان سمو بنا۔ کس پیاس سے، کس آس سے، کس تڑپ سے، کس چاہت سے وہ اس کا بیانیہ پرو دیتا ہے!۔ ہم اس کی وطن دوستی کے پس منظر پہ ضرور کچھ کہیں گے۔ اس لیے کہ ہماری نظر میں اس کی وطن دوستی اور سمو سے اس کی محبت دونوں میں گہرا باہمی تعلق ہے۔ اس کی سمو سے محبت جس قدر اذیتیں دیتی ہے وہ ان کے لیے جو جو تریاق ڈھونڈتا ہے، وطن دوستی ان میں سے ایک ہے۔

وہ ایک ایک علاقے، ایک ایک پہاڑ اور ایک ایک ذی روح کا نام لے کر اس کی پیاس کا مداوا مانگتا ہے۔ علاقوں میں ملاحظہ کریں:

کڑمی گورغیں درنگ، بیہوتربت، سیمرہ کنڈھائیں گرانڈ، تورخان، دکی، تکڑی ڈور، کپڑی، ڈنئ کور، بیجی، بُھڑ، کیچ ومکران، کانہلو شہر، ہُراسان، سارہ وسانگان، بُنڑیں، بدّھڑا، بورو، شمسہ روضو، گر بند، سنڑیں، سملہ کوہ، دائنڑہ کوہ، رستانی ئے دامن وکوڑ، تنڑا، مستہ اوٹغ، کانہلو شہر، کوہِ بانبور، سنّی، سیوی، اسپلنجی، ڈھاڈر، مانڑکی دامان، بولان، مشکاف، بَشک، شاہرغ، گوڈنگ، ونڑیخ، برگ، کوہِ سلیمان، سندھڑی دیر پاندیں مڑو جھنگاں.....

ذرا اس کے کلام میں فطرت کے ذی روح عناصر بھی دیکھیں:

تنسویں وشکی، کونتر، میذ، گورغیں کاڈ، بوریں کرگز، ملخ، تیرغ چڑتغیں بور، شیرواریں لکو ری، سہاگیں زڑدو، وہڑگوانک، نوذگوار، ترچھولی ایں ہر، شلوخیں کنڈھی.....

اور بے جان چیزوں کے نام بھی:

سملہ گُل، ششکانیں رُذ، ہمبوئیں شم، مہ لنجے رُذیں کل، برھنغیں پٹی، بگی ایں جڑ۔ دیر بنیں ریج، پڑی آنی جیہنر، جُوسر، کمب، سوریں چلھر، بوذن، نوذ، تانہی ہمبوئیں جڑ، پنگھر، کانہل و کنگال، بے سیثیں سلام، شکہ شینگل، موشریں سیم، کڑی، آسنیں واڑ، برگڑی، پلڑی، جتڑی، چنڑی، بچی دُر، بے دوشیں گنز.....

ذرا بارش اور اس کی موسیقیت کا تذکرہ بھی پڑھ لیں:

سرگواثاں سیمنیغاں، عرشی کوکر، آف کڑیانی بانزراں ژغروءَ کناں، جی پڑیانی نیم شفی و ہشیں ترھکغاں، رَند سمینانی شراں چو سمو دروشماں، شف گروخ دُکّاں دیم کناں تانہہ آفیں دہاں، گوں مڑو دنزاں ہونگ وہا گہ مس کوکراں، آف دیاں چیٹا لئے کڑو شاہیں پاشناں، جاداں پاریزیں گندنواں بوآں نمب جناں.....

آیئے ہم خود کو، آس پاس کو، وقت و زمان کو، اور علاقہ مکان کو بھی کلامِ مست کی معطر آفاقیت میں بھگو ڈالیں، اور فطرت کا تذکرہ ڈوب کر پڑھیں:

بارغ و تتّی ایں سمیناں عرضے کناں
شواگوں مئیں عرضا بندیں ژہ کیچ و مکراں
مدّیں بشامئے درکفاں استیں (1) ژہ مژاں
ژہ زِرے (2) بنداں بارغیں پرّایاں (3) جناں
جُڑ حراسانا آف و شیر بنت و ایررشاں
سیاہیں گُوڑ بنت و سارہ و سانگانا جُھراں
اُچ بُنڑیں آ او بدّھڑا سرلو پاں شلاں
ساھتے گوئنڈیں بوروہ پشتا تاھراں
روضوا شمس ایغا پخیر ،دُھبّایا شلاں
شف گروخ دُکّاں دیم کناں تانہہ آفیں دِ ہاں
نیم شفے اوھیلہ کناں بندیل بستغاں
گواراں تور خانا تنسویں گڈاں آف دیاں
مانڑ کی شانکا نوذ کو انٹی آ چرہ کناں
گواراں سالُو آ نوذ کناں کونجی ولہراں
بیڑاں دگّی آ تکڑی ڈوراں پُرکناں
کُپڑی کوہا ،گوں سمیناں،سرسا کناں
بانز راں لاڑاں ،کئورے ڈنئی آ ایر رشاں
دیر سریں بیجی ،نیم شفے بلی ترو پغاں
گوں مژ و دنزاں،ہُونگ وہاگہ (4) کو کراں
سملہ جیذاں زیمر و زینہارہ (5) جُڑاں
بوذناں دوست ئیغاں ، ہفوخی گروخہ کناں
گُوڑمس گُوڑ (6) بنت و کوھہ سابنداں لگڑاں

بُھڑّا گواراں آو دیاں دُردیمہ بزاں
آف دیاں چیٹیالئے کڑو شاہیں پاشناں
سیمُرہ کنڈھائیں گرانڈ تُنی بیثغاں
جکٹو ھیلاں پہ سمینانی سیلہاں
نوذ کہ ژہ بشامہ بُنہ بنداں بیگھاں
کیچھاں ویلھو آں (7) گراں ہمبوئیں (8) شاں
بیایاں گواراناں مں گوارغئے ہندا سوہواں
بیائیں شوار ماہ لنجئے رُذیں گُلا شوں دیاں
گواراں گِربندا پہ سنڑیں آ اندیم رشاں
سملہ کوھیں بانڈواں مارے مار کناں
برھنغیں پٹی آں شفی بابے تار کناں
سمّلئے کلا مینیں گوں ششکانیں رُذاں
مں ھذیں خُشالاں شہ واں بگی ایں جڑاں
گرند کناناں پہ ڈائنڑا کوہا ماں گراں
رستزانی ئے دامن و کوڑاں آف کناں
گڑدیں مہلیچ (9) ئے جیمہ ایں گُلا سا کناں
تنڑا کوہا گوں سمیناں سرساکناں
گوارنت و مستئے اوٹغہ گوئر کاں آف کناں
کانہلو (10) شھرا ،یہ شفے اوطاقا گِراں
(داں) کوہے بانبور بیڑ ثو گپتہ ملپذاں
رند سمینانی شراں چو سمو دروشاں
چو سمینانی چَراغ موراں موسماں

جی پڑیانی نیم شفی وھشیں ترھکغاں
آف کڑی آنی بانزراں ژ غرو (11) ءَ کناں
نوذ ضرور گوارنت او گنوخا وھش کناں
(ہماں) لوغی لیموئیں زا مرہ چیڑا آودیاں

[**حاشیہ:**1- بادل کی ایک قسم 2- سمندر 3- بجلی کی چمک 4- دھماکہ دار آواز 5- موٹی آواز 6- جمع ہوہوکر 7- چکر کاٹ کر 8- سرسبز 9- گول چہرے والی محبوبہ 10- کاہان کا پیار سے نام 11- بہتے پانی کی آواز]

ترجمہ:

پتلے اور پیاسے بادلوں سے عرض کرتا ہوں
تم میری درخواست پہ کیچ ومکران سے امڈنا شروع کردو
ساون کے سفید بادل دھند میں سے نکلتے ہیں
سمندر پ۲ سے بنتے ہیں، نرم نرم بجلی چمکتی ہے
بادل خراسان پہ لنگوٹیے دوست بن کر اترتے ہیں
سیاہ مجمع بنا کر سارہ اور سانگان پر جھک جاتے ہیں
اُچ بنڑیں اور بدھڑا کی وادیوں پہ بجنے لگتے ہیں
ایک مختصر ساعت کے لیے لورالائی کی پشت پہ ٹھہرتے ہیں
شمس کے روضے پر، اور فقیر دُھبہ پر جھنکار کرتے ہیں
شبینہ بجلیاں سلگتی ہیں، رخ کرتی ہیں کم آب علاقوں کی طرف
آدھی رات کو اپنی آمد کی خوشخبری والی مشعلیں جلاتی ہیں
ترخان پہ برستے ہیں، پیاسے پہاڑی دنبوں کو پانی پلاتے ہیں

مانڑ کی شانک پر بارش کے ریلے اونٹوں جیسی قطاریں بناتے ہیں
سالو پر برستے ہیں، بارش کے ریلے کونج کی ڈاریں بنا کر
گھیرے میں لیتے ہیں دکی کو، تکڑی کے گڑھوں کو بھر دیتے ہیں
کوہِ کپڑی پہ بادل چھتری بن جاتے ہیں
(اڑتے پرندوں کی طرح) ایک پر جھکا دیتے ہیں اور ڈنئ دریا پر جا اترتے ہیں
طویل بیجی دریا نیم شب دھماکہ خیز ہو (طغیانی میں آئے)
دھند اور غبار میں گھنے بادلوں میں گھن گرج تھی
سمو کے خیمے کے آس پاس کے علاقوں پہ بادلوں کی موسیقی ہے، نغمے ہیں
میری محبوبہ کے خیمہ زن علاقے میں بجلیاں سوکنوں کی طرح چمکتی جاتی ہیں
(بادل) باہم مجتمع ہوہوکر پہاڑ پہ چڑھتے جاتے ہیں
بھڑ پہ برس کر موتی چہرے والی محبوبہ کی بکریوں کو پانی پلاتے ہیں
چیٹیال کے بڑے سینگوں والے پہاڑی بکروں کی پیاس بجھاتے ہیں
سیمر کے خم دار سینگوں والے دنبے پیاسے ہو چکے ہیں
اور منتظر ہیں بادلوں بارشوں کے مناظر کے
بادل ساون میں شام کے وقت تشکیل پاتے ہیں
علاقوں کے علاقے چکر دار جھپٹے کھاتے ہوئے سرسبز وادیوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں
برستے ہوئے آؤ، تمہارے حتمی برسنے کی جگہ کا مجھے پتہ ہے
(ہاں) آؤ تمھیں ماہ رخ کا مضبوط خیمہ دکھاؤں
گِر بند پہ برستے ہیں اور سنٹریں کے اس جانب برستے ہوئے
سمو کے پتھر سے بنے نقل مکانی کرنے سے پہلے کے گھروں پہ بار بار حملہ آور ہوں
برہنہ میدانوں کو شبینہ حملوں سے سیراب کر دیں
میری محبوبہ کے پراندوں کو نہ بھگونا کہ خوشبوؤں کو نمی لگ جائے گی

سمو کے خیمے کو بھگو دو اس کی ساری چٹائیوں سمیت
میں اُن سفید بادلوں سے تب خوش ہوں گا
جب وہ گرجتے ہوئے ڈائنٹر کے پہاڑ کا محاصرہ کر لیں
رستر انی پہاڑ کے دامن اور زرعی زمینیں سیراب کر دیں
گول چہرے والی میری محبوبہ کے وسیع خیمے پہ سایہ کر دیں
تنڑا کے پہاڑ پہ بادل سایہ فگن ہو جائیں
برس جائیں اور مست کے تالاب پہ بھیڑ کے بچوں کی پیاس بجھا دیں
کاہان شہر پہ ایک پوری رات مہمان بن جائیں
بانبور کے پہاڑ تک سارا علاقہ گھٹاؤں میں چھپ جائے
برسات کے نقش ہائے پا سمو کے چہرے کی طرح خوبصورت ہوتے ہیں
جب برسات کے بعد چراگاہ اگتی ہے
جئے ہو بارش کے قطروں کی آدھی راتوں کی میٹھی آہٹوں کی
بارش کا پانی خیموں کے اطراف میں خوبصورت آوازوں سے بہتا ہے
بارشیں ضرور برسیں گی اور اس مجنوں (مست) کو خوش کر دیں گی
اور اس پالتو گھریلو لیموں جیسے زامر کی ٹہنی (سمو) کو سیراب کریں گی

****

اب ذرا ایک اور سمت سے بادلوں اور بارش کا سفر دیکھتے ہیں:

ہر دمے ستاریں ہذائی نامہ گراں
نام محمد ئے یا تنوں پیر گوں پڑکواں
رب و سیلائے کنت پہ کوریں بندغاں
من صذہ بکاں تہ سولاّ کاں یغرہاں
شر نغاھدار بی کایاں بھیڈی ماں ڈبراں

مئے دلا لہراں کایاں چوبشامی دَرزاں
چو سمندران و سانوڑیں کور گوں اُچلاں
دوست منی درینے کوشتی مس سوزیں کوکراں
چیلکاں جنت چو سانوڑیں آ بندیں جُڑاں
بانگہے سرگواث کیث ژہ ہموئیں شماں
شرہ نائی (1) کہ گون انتی سمو ئے سلام
تاں زرے کیث کہ مستہ کاں نیل بندیں جُڑاں
نوذژہ سرسیل ایں حراسانا بُں جناں
منّاں مئیں عرضا بنداں ژہ کیچ و مکراں
میر نصیر خانئے پیہر یں محلاں ساکناں
شف گروخ پنگھر بنت و پہ دامانا شلاں
گواراں سنّی آ موشریں سیوی آ رِشاں
اسپلنجی ئے دیر بُنیں ریجاں آف کناں
ڈھاڈرا نازیناں اوو بولانا گزاں
کورے بولانا ایر کفاں مشکافا دہاں
مس بَشّکااو شاہر غا گرند و گُوڑ کناں
داں دمے گوئنڈیں بورو ئے دیماتا ہراں
رہنغ ایں پٹاں ساہتے گوئنڈیں ایر رِشاں
تنسواں وشکی مس اشی بندیں جھمراں
دیذ انت و گنداں پہ پڑی آنی جینہراں
نرونت منداں (2) ژہ وثی کہنیں جوسراں
آف کن اِیں کُمباں پہ شکاری او کونتراں
بیدھی میذ اِش تنگاں ماں بیوانیں گراں

جہلیں پیشینے جُڑ ژہ گئوڈنگا سمبراں
ژہ زرے بند اں بارغیں پرایاں جناں
گور ونڑیخا او برگہ سرواہاں ڈھل گراں
گرندغیں بشامی نتل بندیں کوکراں
(کہ) سمونشتی ایں دانی گوں سوریں چُلّھراں
نوذگوارانا مئے دلئے کارانہ کناں
ایر رشاناں پہ میر بلوچانی بوذناں
دوستہ دور مانڑیں بانڈواں مارومار کناں
گورغیں کاڈاں سملئے جیڈی امسراں
ترمپ شلوخیں تئ گورغیں کلا لعل کناں
جاداں پاریزیں گندنواں بوآں نمب جناں
سملئے سیری جیہا سالوکی رواں
نوذ کہ ہینڑاناں گواراں سمیّ ئے پاکڑاں(3)
درکفی گُلا گوانکہ جں آسہ مڑداں
سک کنیں گُلّاں آڑ تغہ زوراخیں جُڑاں
جکٹو گندی دوست پُڑی آنی جینہراں
اے ہواں ترمپاں کہ گنوخا دیم داثغاں
پہ گنو خانی گوئشتنا بستو آتکغاں
سمو گوں ماندائیں دلے نوذاں پولہ کاں:
''کائیں گواراناں شواگنوخ نئیثہ الکہاں؟''
اے جواوداثہ تانہی ہمبوئیں جڑاں
''چرغا دیثیں کوہ سلیمانئے پنگھراں
چے ءَ سنبھالئی کہ کشتئے ژہ ڈیہہ و الکہاں

بستغیں دست و ترا داثغنت مستو آ سلام
چرغئے اوذا پولغئے سمو دروشماں
جز غئے پوذاں کانہل و کنگال اث(4) تمام
نی نہ یا یان و دوست منی پیغاماں مہ خاں
اژتئ بے سیثیں سلاماں دیرا گہاں
باز تئ لڈانی پذ و گاماں بیثغاں
پاذاں نال بستہ پہ ڈغارانی جُز غاں
چم منی سُہرانت پہ شفانی گو ئذ وہا وہاں
ئیں شذی آن و ئیں وثی جّراں شینگلاں
وث ہذا سئ ایں مں پہ تئ شِکا شینگلاں
کوہ سراں نداں داراں ششماہی روشغاں
واڑتغیں سیثاں، داثغیں دیمی توشغاں
مالکئے ذکرا مں شف و روشی ءَ کناں
زار ہے جواناں کہ گنا ہاں مافہ کناں
زار ہاں مئیں آں تہ رسئے برّانی مرید
''ہنچشاں مں دِہ ،چو ، توئے ،حانی آ زہیر''

[**حاشیہ**:1- چلتی ہے 2-سرچشمہ 3- گھر کے آس پاس 4-لاغر]

ترجمہ:

بہر دم خدائے ستار کا نام لیتا ہوں
نام محمد از بر ہے مجھے، مرشد جھنڈیوں جھالروں سمیت
رب وسیلہ کرے اندھے بندوں کے لیے

سیکڑوں غلطیاں کرتا ہوں، تمھی سمت سیدھی کرو میری
اچھی طرح نگاہ رکھو میں نے پانسہ پھینک دیا ہے
مرے دل میں موجیں اٹھتی ہیں جیسے ساون گھٹائیں ہوں
جیسے سمندروں، سیلابی ندیوں میں اچھال آ جائے
محبوبہ میری قوسِ قزح ہے سفید بادلوں پر نمودار ہوتی ہے
ایسے اشکارے مارتی ہے جیسے ساون کے پانی بھرے بادل بجلی چمکاتے ہیں
ایک صبح بادِ نسیم چلتی ہے سرسبز بلندیوں سے
سکون بخشتی ہے کہ سمو کے پیغام ساتھ لا رہی ہے
کس سمندر سے ابھرتی ہے اور بنتے بادلوں کو مست بنا ڈالتی ہے
بادل، مناظر بھرے خراسان سے اٹھتے ہیں
مانتے ہیں میری درخواست اور شروع کرتے ہیں کیچ مکران سے
میر نصیر خان کے عظیم الشان محل پہ سایہ کر دیں
رات کو بجلیاں وسعت پا کر دامان میں برسیں
سّنی پہ برستی ہیں سرسبز سبی پہ موسلا دھار کرتی ہیں
اسپلنجی کے نیچے گئی ہوئی نمی کو دوبارہ سیراب کریں
ڈھاڈر پہ نغمہ سرا ہوں اور بولان سے ہو گزریں
پار کریں بولان اور اتریں مشکاف کے علاقے پر
بشک اور شاہرگ پہ گرجیں برسیں
ایک ذرا سا لورالائی پہ رک جائیں
بلند سطح مرتفع پہ مختصر لمحہ کے لیے اتر جائیں
پیاسی ہیں ہرنیاں، دشوار چٹانوں پہ
آنکھیں گھما گھما کر دیکھتی ہیں بادلوں کو بوند کی آس میں

چشموں کو نہیں جاتیں پرانے ٹھکانوں کو نہیں لوٹتیں
بھر دو جوہڑوں کو، شکاریوں کے لیے، کبوتروں کے لیے
منتظر پہاڑی جانور پیاس بجھائیں ان غیر آباد کوہساروں پہ
ڈھلتی سہہ پہر کو بادل شمال مشرق سے ابھرتے ہیں
سمندر سے بنتے ہیں باریک بجلیاں چمکاتے ہیں
ونڑیخ اور برگ کے علاقوں پر جم کے برسیں
گھن گرج ہے ساون کی مست گھٹاؤں میں
(کہ) سمو ابھی تک گزارہ کر رہی ہے کھارے پانی کی تلچھٹ پہ
بارش برس کر میرے دل کی مرادیں پوری کر رہی ہے
رم جھم کرتی ہے معزز بلوچوں کے علاقوں میں
محبوبہ کے امیر رہائشی علاقے پہ جم کے برسیں
گوری حسیناؤں پہ، سمو کی سنگی سہیلیوں پہ
موسیقی بھری بوندیں تمہارے خوبصورت خیمے کو شاداب کر لیں
اس کے پراندوں کو نہ بھگونا زلفوں کی خوشبو کو نم آلود نہ کرنا
سمو کے عروسی خیمہ میں دولہا کی طرح جاتے ہیں
بارش جب اپنی میٹھی آواز کے ساتھ سمو کے علاقے پر برستی ہے
وہ نکلتی ہے خیمے سے پکارتی ہے گھر کے افراد کو
خیموں کی رسیاں مضبوط کرو کہ گہرے بادل پہنچ گئے
کھڑی ہو کر دیکھتی ہے موسیقی بھری بوندوں کو
''یہ تو وہی بوندیں ہیں جو میرے مجنوں نے بھیجی ہیں
یہ تو اسی دیوانے کے کہنے پر سفر کر کے آئی ہیں یہاں''
سمو اداس دل کے ساتھ بارش سے پوچھتی ہے:

''(تم علاقہ بھر) برستی آ رہی ہو، تم نے میرے مجنوں کو کہیں دیکھا ہے؟''

یہ جواب دیا دور سے آئے گہرے بادلوں نے:

''ہم نے اسے کوہِ سلیمان کی وسعتوں میں گھومتے دیکھا ہے

اب کیوں اسے یاد کر رہی ہو، تمہی نے تو اسے وطن بدر کر دیا ہے

ہاتھ جوڑ کر اس نے تمہیں سلام بھیجے ہیں

وہیں پھر رہا تھا وہ، اور تلاش کر رہا تھا سمو کی صورت کو

وہیں پھر رہا تھا وہ، بہت لاغر و خستہ حال تھا

اب نہ لوٹوں گا محبوب! مجھے آنے کے پیغام نہ بھیج

میں تمھارے بے فائدہ سلاموں سے دور ہی بھلا

میں تمھارے کارواں کے پیچھے بہت گھسٹتا رہا ہوں

میرے پیر اونٹ کے پیروں کی طرح سخت ہو چکے ہیں ننگے چلتے چلتے (تیرے پیچھے)

آنکھیں میری سرخ ہیں رت جگوں کی وجہ سے

نہ میں بھوکا ہوں نہ لباس کے لحاظ سے شکستہ حال ہوں

خود خدا جانتا ہے، میں تیرے عشق میں تباہ حال ہوں

پہاڑوں میں رہ کر ششماہی روزے رکھتا ہوں

منافع کھا لیا، سخاوت میں دیا مال آگے کا توشہ ہے

مالک (خدا) کا ذکر میں رات دن کرتا رہتا ہوں

فریادیں اچھی ہیں کہ خطائیں معاف کراتی ہیں

میری فریادوں پہ مدد کو پہنچ جاتا ہے بیابانوں کا مرید

''ایسے ہی میں ہوں، جس طرح تو ہے، اپنی جانی کے لیے بے قرار''

****

شیئر

مہراں قطّارے بستہ مس دِیر پاندیں دہاں
دوروباری ایں شنز شہ ربہ رحمتاں
ہر کہ وھشالیں گوں وثی کشِت وکیلغاں
شنز شہ نوذاں سوزہ شنت سول پہ سَجّلاں
زامری چیڑ لڑزاں مس گر گونیں گراں
پَیری مَس باغارہ تڑ و گھیراں سمبراں
منجھرا کورا گوں گذاری آں گوئستغاں
حاجی پہ حجا مس سملہ دیذارا رواں
پرتئ عیناں باز زہیر مجنا پیثغاں
بیگہاں کایاں اژ زرِی سندیں کوہ بناں
لنڈی وَکُنڈھی آ مُہا ڑایث پہ وثاں
کشّی کُنڈِھی آ دستہ جنت سندیں پانہڑاں
آ تکغئے دیما مس تئ رتّی آں رِژاں
موت پرمرداں حق اِن و شرمندغ نیاں
زہر کشہ دوستا داشتی مستا راسلام
اژ ہواں و ختابیثہ مئے سموئے سلام
دیر کناں جانا شدّئی خاصائیں گُذاں
میری ہتھیاراں گوں کلیری لامبہ کناں
درشک کلیر یغیں ہَیثئی خاوند مہر واں
گِندِی سمو مئے سنجاں گوں آ سکی کَجّلاں
لہر مارانی لیٹاں مس دِلگیریں دِلاں

گپتغث کیفاں یاتہ کاں یا اللہ توئے
لنگواں شاہی جَھنگ جنے چَھتہ کہ روے
ہول پوشانی ہیپتاں پارتا دیئے
سو بھائے بچاں شے بھری مستا بیردیئے
گوانگ جشہ جَتّا چو بیا دلدار چلگری
مست پہ میٹر و منتاں سرہالہ نِوی
پُشت جشئی سمو تَکشی لاہورہ گلی
آتکغہ دلدار گونشی مستہ مُدّعی
مڑدمے مجنائیں پرے مستہ گندغا
دل مناں شی کہ اژ شمیزامس ہُو کناں
ہاروکَنڈی آ مس دے گوں درشکے آ کناں
یہ بریں جکئے کیغذیں سمومس گشاں
روشے پیشینا ہَنہ چوٹی آ گوستغاں
پیش ژہ باما سرورے محلاں آتکغاں
روضوہ دیما کہ نتر بستہ مہتراں
سارکشہ لوکاں گوں کچاوا او کنگڑاں
زوارہ ثاں سیر ساث ،دیے چوسُہریں تنگواں
گندیں شوا یکے استیں چوسمو دروشاں
تئ زہیر سمو چابکی تاوانہ دیاں
پیر محبوب شاہ تربتہ مہماں بیثغاں
پیرہ مہماناں دامناں شِیر و شکلاں

ترجمہ:

محبتیں (بادل) دور دراز سے قطار بناتی ہیں
خوش حالی کا زمانہ ہے کہ رب کی رحمتیں پھوار بن گئیں
ہر شخص مطمئن کھیتی باڑی اور پیداوار اٹھانے میں
بارشیں برسنے کی بدولت تازگی ہے سبزہ ہے
زامر نامی درخت کے گیسو گہری گھاٹیوں میں بل کھاتے ہیں
پرسوں میں باغار کے علاقے سے روانہ ہوا
منجھر اندی جوتوں سمیت پار کی
حاجی حج کے لیے، مگر میں سمو کی دیدار کے لیے جاتا ہوں
تمہاری آنکھوں کی دید کی تڑپ سے مجنوں ہو گیا ہوں
شام کو آتا ہوں وسیع میدانوں والے پہاڑوں سے
لُنڈی اور کنڈھی کی باہم تکرار تھی
کنڈھی آگے بڑھ کر میدان سے پتھر اٹھاتا ہے
اگر آگے بڑھے تو میں تمہاری کھال رنگ دوں گا
جواں مرد کے تئیں موت برحق ہے، میں اس پہ نادم نہیں ہوں
محبوبہ روٹھ گئی اس نے مست کو سلام بھیجے
اس دن سے سمو کے ساتھ میرا سلام بند ہوا
میں جسم پر سے قیمتی ملبوس ہٹا لیتا ہوں
اپنے امیرانہ ہتھیار کلیر کے درخت پہ ٹانگ دیتا ہوں
قدرت دیکھو، خدا کلیر کے درخت پر بھی مہربان ہوا
سمو میرے ہتھیاروں کو غزال آنکھوں سے دیکھتی ہے
محبت دلگیر دل میں سانپ کے زہر کی طرح موجزن ہوتی ہے

خمار طاری ہوتا ہے، خدا سے مدد مانگتا ہے
شاہی خدام کے دل میں ڈال دو
زرہ بکتروں کی ہیبت کو ہماری مدد کا کہو
اس بار سوبھا کے بیٹے مست کو لوٹا دو
اونٹوں کے ساربان نے دلدار چلگری کو بلایا
مست منت سماجت سے نہیں سمجھے گا
وہ سمو کو بھی خاطر میں نہ لایا اور لاہور کی گلیوں کا قصد کیا ہے
دل دار مست کا مدعی ساتھ لے کر آیا
ایک مجنوں شخص کو مست سے ملانے
دل چاہتا ہے کہ یہیں سے ہُو کا نعرہ بلند کروں
گلے کا ہار کسی درخت سے لٹکا دوں
ذرا رک جاؤ حسین سمو میں کہوں
ظہر کے وقت میں بارکھان سے گزرا
صبح صادق سے پہلے سخی سرور کے محل (دربار) پہنچا
روضہ کے سامنے مہتر و معزز لوگوں کا ہجوم ہے
کجاووں پہ سوار لوگوں کا ہجوم ہے
ان میں سوار تھیں دلہن والی زیورات پہنی طلائی چہرے والیاں
دیکھیے، ہے کوئی سمو سے مشابہت والی؟
سمو تیری یادیں کوڑوں کی طرح لگتی ہیں
پیر محبوب شاہ کے مزار پہ آن مہمان ہوا
میں پیر کا مہمان ہوں، اس نے مجھے کھانے میں دودھ اور مصری دیے ہیں

****

شیئر

اش کثوں گوشاں کپتہ ڈکالے امبرا
لڈثوراجاں دیر بڑتہ سمّو کا شراں
مں وثی صذگنجیں خذا یاعرضہ کناں
ہور چوگواراں مں گوارغہ ہندا سوہواں
بلّاں مں سمّو بوذناں او طاقاکناں
جی پُڑی آں شوئے نیم شفی وھشئیں ترھکغاں
مئیں زواں ہُژ با مں شوئے ترنپاں دعا کناں
دز بُھراثاں مں شوئے آف شیفاں جناں
سملئے کوہیں بانڈواں مارو مارکناں
ربہ پرموذیں نوذژہ کشمیر بتُلغاں
کولپورہ وڈّا بوروہ دامانا گراں
مں ہمے نوذاں شوار یہ شفی شونافے دیاں
یہ شفے ٹکیلّہ سرا اوطاقا کناں
مستہ لوہی آں آف کناں کوھہ پاشناں
تنّسوی جکّاں نہ رّواں کہنیں زئے یاں
اوٹغا مست ایغا پرے گوئر کاں آف کناں
نوذ رُخا دُگّی آ رہا گڑواسہ دیاں
کُپّڑی سُنٹا نوذ کوانٹی چرہ کناں
تَل مناں خوش نئیں نوذ شمیذاں گھاسہ کناں

کَور و کاراہی نوذ تِلٹّا اندیم کفاں
ھیدا ءَ کنڈغ پاندَہ بگّی ایں ژلاں
شاہ علی تلاّ زہر ینیں پیری آں دیاں
منجھرا ماوند گوئڑتغا عرشی کوکراں
میر وزیر خانہ بستغیں شہرا ساء کناں
دوبّرا بوذوئی تڑو گھیراں آف کناں
میر بہار خانہ بتّواں تارو وارکناں
رستزانی ئے کوڑ بناں لاڑو لاڑ کناں
کوہے دربّھانی گوئڑ تغابگّی ایں جڑاں
چاکرہ کورا شوگروخ گرنداناں گزاں
کوئٹ منڈاہی نوذ ارنڈا ایرہ کفاں
گواراں تلّی آ سیولہ شہرا ساء کناں
ڈھاڈرا گواراں شوگروخ بولانا گُزاں
نیامغی تنکانی دفا ویلہوآں دیاں
کوھہ دراژاذا دامُنے سیا ہانڑا دیاں
پاذاں ھٹکیناں نوذ صلاحے نوخیں کناں
پَیڑیں سندھہ گوارغا وہمی بیثغاں
سندھہ پٹّی آں شوگروخ پیری آں دیاں
سندھڑہی گوئڑ تو کانہلو تنّگا گڑ تغاں
یہ شفے سمّو بوذناں او طاقا کناں

ترجمہ:

میں نے سنا کہ امسال قحط پڑ گیا ہے
قبائل نقل مکانی کر گئے اور سمو کو دور چراگاہوں کی طرف لے گئے ہیں
میں اپنے صد گنج خدا سے عرض کرتا ہوں
بارشیں برسیں میں ان کے برسنے کی جگہ جانتا ہوں
وہ سمو کی چراگاہوں پہ ٹھکانہ بنائیں
واہ برسات تمہاری نیم شبوں کی موسیقی بھری آوازیں
میری زبان سوکھ جائے جو میں تمہیں بددعا دے دوں
میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں اگر میں بارش کے پانی کا رخ موڑ دوں
میری دعا ہے کہ سمل کے پتھر سے بنے گھر کو جل تھل کر دیں
خدا کا فرمان ہوا اور بادل کشمیر سے نکلے
کولپور سے ہوتے ہوئے لورالائی پہنچے
میں ان بادلوں کو ایک رات کے لیے راستہ دکھاتا ہوں
ایک رات ٹکیل پہاڑ پہ بسیرا کرلو
پہاڑی بکروں کے لیے مست کے لوہی کو بھر دو
وہ پیاسے کھڑے رہتے ہیں مگر باسی پانی پینے نہیں جاتے
مست کے تالاب کو پہاڑی لیلوں میمنوں کے لیے بھر دو
برستے بادل دکی سے گڑ واس کی طرف لپکتے ہیں
کوہ کُپڑی پر بارشیں اونٹوں جیسی قطاریں بناتی ہیں
تل مجھے اچھا نہیں لگتا، اس لیے بادل وہاں سے کنی کترا کے گزرتے ہیں

گوراور کاراہی سے ہوتے ہوئے بادل کوہِ تلٹ پر حملہ آور ہوتے ہیں

ھیدا کی چوٹی تا سفید ژل

وہ شاہ علی کے تل پر غضبناک انداز میں گھر گھر کر برستے ہیں

عرشی سفید بادل منجھر اماوند برسے ہیں

میر وزیر خان کے آباد کردہ شہر کو سایہ کر دیں

دو دفعہ بوذ والی کے دامنوں نشیبوں کو سیراب کریں

میر بہار خان کی اراضی کو لبالب بھر دیں

کوہِ رستانی کے دامنوں پہ نغمہ سرا ہوں

دربھانی پہاڑ پہ سفید بادل خوب برسے

دریائے چاکر پر سے شبینہ بجلیاں گرجتے گزریں

کوٹ منڈاھی سے ہوتے ہوئے بارش ارنڈ کی اترائی اترتی ہے

برستی ہیں تلّی پہ اور سبی کے شہر کو سایہ فگن کر دیں

ڈھاڈر پہ برستی ہیں شبینہ بجلیاں بولان سے گزرتی ہیں

وسطی دروں کے دھانے پر چکر کاٹتی رہیں

سلسلہِ کوہ پہ سیاھانڑ کو لپیٹ میں لے لیں

یہاں ذرا سا رک کر بادل باہم مشورہ کرتے ہیں

وہ ایک بار سندھ پہ برسنے کا ارادہ باندھتے ہیں

سندھ کے میدانوں پر شبینہ بجلیاں رقص کرتی ہیں

سندھڑی پہ برس کر وہ کاہان کی طرف مڑے

ایک رات سمو کے رہائشی علاقے پر شب بسری کریں

****

شیئر

گواریں شوانوذاں مئے دلہ کارا کارکنیں

رستانی ئے سَر ہُڑُ گاں (1) آف گیرکنیں

بانکہ کوہیں بانڈواں مارے مارکنیں

ساتیں والی آ لُڈولاڈانی گوُستغئے

منجھرا تنکا ڈیہوی ترڈھاٹاں جنئے

یک گھسیٹے دہ کچھیں ماوندا برئے

کانجہ سربندا کوکراں گھاٹ و گھمرے (2)

دیغرے زڑدیں نیلغیں کوہے (3) دام گرئے

[**حاشیہ:** 1۔کوھی 2۔عورتیں کبوتر کی طرح غٹرغوں کرتی منہ سے موسیقی پیدا کرتی ہیں 3۔تدڑی]

ترجمہ:

برس جاؤ بادلو ہماری فرمائش پوری کر دو

کوہِ رستانی کو سیراب کر دو

میری محبوبہ کے پہاڑی علاقے پہ جم کے برسو

ساتیں والی سے گیت گاتے رقص کرتے گزرو

اے سیلاب منجھرا کے درے سے چیتے کی طرح دھاڑتے گزرو

بادلو، ایک بار وسیع ماوند پہ جھپٹ آؤ

کانج کے اوپر برستے بادل گھمر لگائیں

عصر کے وقت تدڑی کوہ پر برستے جاؤ

****

شیئر

مالکیں اللہ قدرتی کارانہ کنئے
نوذاں گُوارینے اُلکہہ و ڈیہاں سوزکنئے
بانگہے صحوی بستغث عرشی کوکراں
مالکئے عرشی جینہریں ہمبوئیں جُڑاں
اے ہواں عرشی کوکرو ہمبوئیں جُڑاں
(کہ) مالکا داشتاں گوں وثی سگھ وقدرتاں
تانہی نوذ گواراں مس سَمّو بانڈواں
نوذ گوارنت و موسمے پدگڑدہ کناں
سملئے پیغام آڑتغاں نوذِی جینہراں
آتکاں پیغام گوئنتش ہمبوئیں سلام
پیاذغیں پاذاں ڈھاڈرو بیجی آ گزاں
مس ژہ سیوی آ بادراہا سمبراں
مس پہے راہاں کورِ بیجی آ آتکغاں
کُچڑہ شاخا آتکغاں بانبورہ دہاں
چیارمی روشا کانہلو شہرا آتکغاں
مہر اللہ خانا گوانک جثو گڑ دینتہ مناں
توکلی مست بیاترا پیغامے دِیاں
سمل ئے پیغام گونتوں ہمبوئیں سلام
گڑد بروملکا گُوئر ہمے پروئی لشکراں
مس رواں سڑدار نَیلاں مارپروئی چرغاں

گڑتغاں مس دے گوں دِلئے دوریں اندوہاں
بیثغاں ظاہر نہیشتغاں پروئی گھوڑواں
اندوہاں دوراں مس گوں سَموّلحمیں غماں
دیذغاں کوراں پہ شفا سرشونہ نواں
حقہ دوستی ایں گندغی نیتیں مئے دلا
روحہ روُوآں دِل گنوخیں پہ سَمّلاُ
گُرتغاں مس کہ نشتغاں بُڑزیں ڈبّرے
یہ دُماغے آ بانکئے چاری بیثغاں
یا خداوند تہ قدرتی گوانکے دئے مناں
سملے لوڈیں گوں وثی جیڈی امسراں
آ تکہ لُڈّاناں پیہی مس ارگونیں گراں
دَگّ دیر بیثہ یاخذاوند چوں کناں
بادشاہ کوہئے پیر سوُہری آ گوانک جناں
اے ہواں مڑدیں کیث گوں سوزیں مرکواں
دُلدُلا زواریں کوفغا گونیں ذوالفقار
کلموے داثو سَٹّوں ارگونیں گراں
مادے لمّانا داشتہ مار ،پیراں ،گوئرشماں
دریپغا مَیغا سَمّلا ’’ رکھ اَللّٰہ‘‘ کشہ
شِلنڑیں درنگاں دِرِکئے مار بذنامہ کنئے
تہ نوئے بذنام گوں وثی جیڈی اَمسراں
سچّوئیں دوستی آ تئ شرمندغ نیاں

ترجمہ:

اللہ تُو مالک ہے انہونے کام کرنے والا
بارشیں برساتے ہو، علاقوں خطوں کو سرسبز کرتے ہو
صبح سویرے عرشی بادل آئے
پروردگار کی فلکی خوشبو بھرے پُر آب بادل
یہ وہی عرشی بادل ہیں
جنھیں خدا نے اپنی قدرت و کرامت سے تھام رکھا ہے
دور دیس سے آئے بادل سمو کے خیمے کے پرانے علاقے پر برستے ہیں
بارشیں برستی ہیں اور اپنے موسموں میں واپس لوٹ آتے ہیں
بارش کی باریک رم جھم سمو کا پیغام لے آئی ہے
پیغام جن میں لطیف سلام شامل ہیں
پیدل چلتا ہوا ڈھاڈر اور بیجی سے گزرا
میں سبی سے بادراہ کی جانب چل پڑا
اس راستے میں دریائے بیجی پہنچا
کچھڑ کے کنارے میں بانبور کے علاقے پہنچا
چوتھے روز میں کاہان شہر پہنچا
سردار مہراللہ خان نے مجھے بلایا؛
''تو کلی مست، آؤ تمہیں ایک پیغام پہنچا دوں
میرے پاس سمو کے پیغام اور اس کے سبز سلام موجود ہیں
علاقہ لوٹ جاؤ پروئی قبیلے میں''
''میں تو جاؤں سردار، مگر پروئی قبیلہ ایسا کرنے نہیں دیتا''
میں دل کے رِستے زخموں کے درد کے ساتھ علاقے کی طرف چل دیا

میں نمودار ہوا تو پروئی کا لشکر موجود دیکھا
میں سمو کی آتشیں یادوں کا مارا ہوا
اندھا ہوں رات کو راستہ بھٹک جاتا ہوں
سچی دوستی ہے ہمارے دل میں کوئی بدی نہیں
روح کا آوارہ ہوں دل سمو کے لیے پاگل ہے
میں واپس ہوا اور ایک بڑی چٹان پر بیٹھ گیا
ایک لمحے کے لیے مالکن کی جاسوسی کرتا رہا
اے اللہ معجزہ کر میری مدد کو آ
ارے سمو مدھر چال چلتی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ نظر آئی
رقصاں چال میں دشوار پہاڑوں کے بیچ داخل ہوئی
راستہ چل کر جاؤں تو بہت دور پڑے، اے خدا میں کیا کروں؟
میں شاہِ کوہستاں (حضرت علیؓ)، اور پیر سوہری کو صدا دیتا ہوں
یہ وہ ہستی ہے جو سفید گھوڑی پہ سوار ہے
دلدل پہ سوار کندھے پہ ذوالفقار
کلمہ پڑھ کے میں نے چٹان پر سے چھلانگ لگائی
میں لڑھکتا جاتا تھا کہ مرشدوں نے بازوؤں میں تھام لیا
زمین پہ گرنے کی آواز پہ سمو نے چونک کر ''اللہ خیر'' کہا
''اتنی اونچی چٹانوں سے کود کر ہمیں بدنام کرتے ہو''
''تم ہرگز بدنام نہ ہوگی اپنی سہیلیوں میں
میں تمہاری سچی محبت میں شرمسار نہیں ہوں!''*

****

شیئر

گوں منی عرضا بثغہ مالک مہرواں
بستغہ ماڑی ءَ سرا آف بندیں جُڑاں
ٹیکشہ گرنداں تنڑا چوٹی ءَ رشاں
تُرکہ کُنایاں مانڑکہ بندا آف کناں
نوذگرنت ریخا بہاولاں زئی آں ساکناں
بانزراں بیڑنت بُوذن ایں شوخوآ رشاں
پیرہ کورا اوننگرئے در بارا شلاں
پیر سرا چرنت ایر کفاں دوستئے بانڈواں
(سمو) گرینہہ ءَ کنت گُٹا گوانگہ جنت جیڈی امسراں
چکیں شوا چُوڑاں (1) ساز کنیں ہژ گڑدیں رذاں (2)
کاول و کندھارہ گروخ نزی بثیغاں
گرنداں نارہاٹیں جی پہ شئے وشیں زیمراں
ترمپاں نال گوانک ایں جی پہ شئے وہشیں ترھکغاں
پیر سراچرنت ایر کفنت دوستئے بانڈواں
ول و کول میرو روذناں (3) سر چیڑ و کناں (4)

[**حاشیہ**:1- خیمے کی رسیاں 2- خیمہ کی چٹائی کی بنائی کا ایک نمونہ 3- نئی اگی گھاس 4- اونچا]

ترجمہ:

میری التجا سے مالک مہربان ہوا
ماڑی کے اوپر پانی بھرے بادل چھائے
گرجے بادل تنڑا کی چوٹی پہ دھواں دھار برسے
ترک کنا اور مانڑک بند کو سیراب کریں
بارش ''ریخ'' پہ برستی ہے اور بہاولاں زئی پہ سایہ فگن ہوں
پرسمیٹ کر شوخو پہ برسیں
پیرءَ کورا اور سخی کی خانقاہ پہ برسیں
پیر سر پہ گھوم کر محبوبہ کی رہائش گاہ پہ اتریں
سمو مترنم آواز سے سہیلیوں ہمجولیوں کو پکار کے کہے
اپنے خیموں کی طنابیں کھینچو اور خیمے پہ ڈالی چٹائیوں کو برابر کردو
کہ کابل وقندہار پہ چمکتی بجلیاں قریب آرہی ہیں
گرج کا شور ہے، خوش آئند ہے تمہاری میٹھی موسیقی
بوندوں کی میٹھی آوازیں ہیں، خوش آئند ہیں زمین پہ ٹکرانے کی تمہاری آوازیں
پیر سر سے اتر کو محبوبہ کی قیام گاہ کا رخ کرتی ہیں
یہ بوندیں تو بیل بوٹوں کو خوشبودار کول میر کو، روذن کو اگنے میں مدد دیتی ہیں

****

شیئر

جی ہواں استیناں (1) عجب رنگیں
بڑزے ژا سرحدیں جڑاں بنداں
اوٹغ و گچکاراں تلائیناں
آں صحابانی زیارت و ہنداں
نوخ کناں شاہا چشمو و چاثاں
گوئر بڑیری ئے اُلکہہ و درنگاں
رونگھنڑا تیرماڑی سرو سَنداں
چپرو راسوئے ڈل و درنگاں
پہ مڑونگانئے سنٹھہ سابنداں
ایرشاناں پہ کلشنڑ و سنداں
در رِشاناں پہ مَنجُکی بنداں
شر گرنت جوزو جافری باغاں (2)

[**حاشیہ**:1۔ برسنے والی بادل کی ایک قسم 2-اخروٹ]

ترجمہ:

جی ہواُن عجیب وغریب بادلوں کو
جو دور دراز سے بن کر آتے ہیں
تالاب اور جوہڑ بھر دیتے ہیں
وہ ولیوں صحابیوں کی زیارتوں پر برستے ہیں
شاہ کے چشموں کو تازہ دم کرتے ہیں
بڑیر کے علاقوں چٹانوں کو
رونگڑ میں تیرماڑی کے میدانوں پہ
چپر اور راسو کے پتھریلے علاقے پہ
مڑونگان اور سُنٹ کے سایوں پہ
دلدلوں میدانوں میں اترتے ہوئے
منجکی کی بلندیوں پر چڑھتے ہوئے
اخروٹوں کے باغات کی طرف رواں ہوتے ہیں

****

شیئر

پوپل و خوشبوئیں برو بُوراں
شوا اغر درمانے کنیں سوراں
ہاگرے آمینا اشاں یکا
دُرلبھی مں چادرا چکا
کچوئیں پکو بنت اژ ہ حقا
سوب مناں سالوخی اُراں گوں بنت
نوذ چوہل پاذاں سمین ایغاں
سمبریں سرسا بستغیں نوذاں
شوا گُزیں بالا ذ ا پوا دیغا
ذیث گِریں گنجیں رتنڑی ریخاں
پلوا سنبھالیں اووسیماں
تنسو او تُن آفیں و لایتاں
آف کنیں مستہ مزل و راہاں
مزل و و یلھو آں گنوخ بُیغاں
لیو کنیں جاندرانڑا ہمو گنجیں
کوہ جاندرانڑئے بِیام گُری گٹاں
کُمب و لوہی آں(پہ) کوہ سری مَیذاں
آف کنیں مخماڑہ شمہ ڈوراں
ہلکہ مں لالئے چپراں کوڑاں
بیدہ و پٹی آں چراغیناں
نوذ گوارنت و آف کناں بنداں
کانگڑی کورا چادر و منداں

داں نِلی آ او ڈانوڑہ کنڈاں
پُڑ بجارہ گڑ دغئے ہنداں
چاکرہ لڈانی پذ و رنداں
میر ژہ محلاں بادشاہی آں
ٹیلشہ براثی جھیڑو و جنگاں
کپتہ مں زِندا نیں غم وپندہاں (1)
شُکر گویاں مں قادر ئے رنگاں
بدرو وبشامہ گدرول بنداں (2)
بیگھاں وہشیں گھمراں زیراں
چندہاں شیدائی سوادھ گیراں
مارا چو ججی خافظاں خوبیں
خوب اژہ ستارہ درا ڈاتیں
بہر کناناں پہ امتہ گواراں
بانزراں پیرہ کنڈغہ ڈھاراں (3)
سنگ سیلاہئے گمبنداں (4) گواراں
ہڑ دو کورانی ہارہ شِیکاریں (5)
راج بلوچی پہ وسغا جوانیں
بڑز کوہستاں باغ و بازاریں
ریخ گُل جہلا سوز و گلزاریں
سائے سڑدارا حیر و آمانیں

[حاشیہ:1-اچھل کر باہر نکلا 2- تیز بارش 3- سایہ کردیں 4- جہاں بالاچ کی قبر ہے 5۔آواز]

ترجمہ:

بَر اور بُور سے الائچی جیسی خوشبو آتی ہے
تم ہی ہجر کے زخموں کا علاج کرو
ہاں تم ہی تمنا کی تکمیل کر سکتے ہو
چادر پر ہی موتی تلاش کیے جا سکتے ہیں
خدا ہی کچھوں کو پکا کرتا ہے
فتح مجھے دولہا جیسی نصیب ہو
بادِ صبا بادلوں کی منادی گر ہے
روانگی کو تیار ہو جاؤ سر پہ سایہ کرنے والے بادلو
گزر جاؤ پہاڑ کے سلسلہ پر سے
جلد ہی پُر گنج رنتڑی کے ریگستان پہ برسو
پورا علاقہ برس جاؤ
پیاسے اور پانی کے لیے منتظر خطوں پہ
سیراب کر دو مست کی راہوں کو منازل کو
اس مجنوں کی منزلوں کو اس کے لپک آنے کی جگہوں کو
صد گنج جاندران پہ رقصاں ہو جاؤ
کوہ جانداران کی درمیانی گھاٹیوں پہ
جھیلوں گڑھوں پہ جو آبی مخلوق کے لیے ہوتی ہیں
خماڑ کی وادی کے جوہڑوں تالابوں کو بھر دو
میری لعل کا خیمہ پہاڑ کے دامنوں میں ہے
سنسان اور میدانی چراگاہوں میں
بارشیں برسیں اور بھر دیں بندات کو

کانگڑی ندی میں پانی ہو آبی مخلوق ہو
نلی کے علاقے تک اور ڈانوڑ کی درزوں تک
بجار پڑ کے واپس ہونے کی جگہ تک
چاکر کے کوچ کے آثار کے پیچھے پیچھے
میر چاکر کو شاہی محلات سے
اپنوں کے ساتھ قبائلی جنگوں نے نکال باہر کیا تھا
(اور وہ) قید جیسے غموں کا شکار ہو کر رہ گیا تھا
میں خدا کی قدرتوں کا شکر گو ہوں
بدرہ اور ساون کی برساتیں شروع ہوتی ہیں
شام کے وقت گھن گرج جیسے غٹر غوں ہو
کتنے شیدائی ان مناظر کے نظارہ بین ہیں
ہمیں تو یہ حاجیوں، حافظوں کی طرح اچھی لگتی ہیں
خوب ہیں یہ مناظر کہ خدائے ستار کے در کی بخششیں ہیں
یہ برستی ہوئی، امت میں تقسیم ہوں
پیر کے کنڈغ پہ اپنے پروں سے سایہ کر دیں
سنگسیلا کی گنبدوں پہ برسیں
دونوں سیلابی ندیاں گنگناتی آئیں
قومِ بلوچ شاد و آباد ہو
کوہستان کی بلندیاں باغ و بازار ہوں
نشیبی ریگستان سبز و گلزار ہوں
سردار کے زیرِ سایہ امن ہو خیر ہو

****

شیئر

بڑز کناں دستاں مالکا عرضداشے کناں
سمّلئے سیری خیمہا ترنپ سرساکناں
پَڑ چلاں (1) بندی گوں وثی شِلیں (2) موڑدا نغاں
در کفی گُلا گندی شے چوٹیں جینہراں
تانرگہ بندیث و تاں گُرہ گوارینی جڑاں
بڑزتریں بُرجاں جُہل تریں جے ھین ایں (3) گراں
تُمبوئے وشکی مس اشی بندیں پنگھراں
دیرِ سریں کوہانی سرہ نوخافاں وراں

[**حاشیہ**:1- خیمہ کی چٹائیاں 2- لمبی پتلی انگلیاں 3- بہت گہرے]

ترجمہ:

ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوں مالک سے التجا کرتا ہوں
سمو کے عروسی خیمے کو بوندوں کی چھتری نصیب کر
تا کہ وہ اپنے خیمے پر اپنی لمبی حسین انگلیوں سے چٹائی باندھے
وہ خیمے سے نکلے اور بارش کا نظارہ کرے
بادل کیسے بنتے ہیں اور کس سمت سے برستے ہیں
کہیں بلند چوٹیوں پہ کہیں عمیق ترین کھائیوں میں
تمبو کی ہرنیں بلند چٹانوں پر
وسیع کوہستانوں میں بارش کا تازہ پانی پیتی ہیں

****

شیئر

شیئر جثیں ماخ وہاکثیں ملخاں
ہاکثیں ملخانہ سمینغاں
بیگھاں اِستیں کہ مُڑاں بنداں
بانگھاں عرشی کو کرے گرنداں
گندغا کڑ زنت چو عجب رنگاں
کرموئے تنکا گوئرتوہ گواراں
گوارنت و ہمبوئیں سلام باراں
پاذہ کیث دُردانغ اَمُلّانی
روث گوئر سر گواثاں سیمین ئیغاں
زیارتہ کنت گوں لیلویں دستاں
دوست گوں چُکی اَنگل وِگرّاں

ترجمہ:

ہم شعر کہنا شروع کرتے اور فرشتے ہاں کہتے
بارش کی ہواؤں کے فرشتے ہاں کہتے
شاموں کو بادل دُھند سے اٹھتے
صبحوں کو عرشی بادل گرجتے
قابلِ دید ہیں یہ عجب رنگ ہیں
کرمو کے درے میں تمہارے پاس آن برستے ہیں
برستے ہیں اور سبز سلام برساتے ہیں
حسیناؤں کی دُردانہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے
جاتی ہے مشرق سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں کی طرف
اپنے حسین ہاتھوں سے انکا زیارت کرتی ہے
بچوں جیسی ضد اور مطالبوں والی محبوبہ

شیئر

سمو گوں مالاں رستانی ئے کوہ سراں
مالہ چارینی آفہ کاری سوزیں زہاں
پاذشفاذی آ ٹاہغیں مالانی پذا
مئیں اَمُل ماہیں جواں نہ یہ میش وپہ بزاں
عرضیں مئیں گوں شوا بدروی بے ہوشیں جڑاں
ساکنیں سیماں گواریں سموئے بوذناں
کندغَیں سمو گوں وثی جیڈی امسراں
کیزاں تئ لوڈاں گنداں گوں جیڈی امسراں

ترجمہ:

سمو ریوڑ کے ساتھ رستانی کے پہاڑ پہ
مال چراتی ہے دور دراز سے پانی لاتی ہے
ننگے پیر ریوڑ کے پیچھے گھسٹتی رہتی ہے
میری ماہ جبیں بھیڑ بکریوں کے ساتھ اچھی نہیں لگتی
بدرہ کے مست بادلو، تم سے درخواست کرتا ہوں
سایہ کر دو اُس کے علاقوں کو برسو سمو کی چراگاہوں پہ
ہنس رہی ہے سمو اپنی سہیلی سنگیوں کے ساتھ
کاش میں تمہیں تمہاری سہیلیوں کے بیچ حسین چال چلتے دیکھ سکوں

****

*توضیحات

مست کو یہ کرامت بھری سہولت میسر تھی۔ ایک بار پروئی نے جب ردِعمل میں اُسے قتل کرنے کے لیے ڈانگ ڈگو اٹھایا تو وہ ایک غرّاتا جھاگ اڑاتا مست اونٹ بن کر اُن کے درمیان سے صحیح سلامت گزر گیا۔ (عوام اپنے ہیروؤں کے ساتھ کتنے ادبی افسانوی قصے منسلک کرتے ہیں !!۔ مست کے ساتھ ایک بڑی مائتھالوجی شامل کی گئی۔ یہ بہت دلچسپ بھی ہے اور اس کا تذکرہ بھی کرتے رہنا چاہیے۔ مائتھالوجی تو کسی عوام اور قوم کی بنیاد ہوتی ہے!)۔ مگر ایسا صرف عوام نے نہیں کیا، مست اپنی شاعری میں ایسے تمام واقعات کا تذکرہ کرتا رہا ہے۔

مست ـــــ ویلیو سسٹم کا باغی

اُس کی دنیا کو تہہ و بالا کرنے والے سمو سے محبت کے اِس واقعہ کے بعد مست پٹڑی سے اتر تا گیا۔ محبت کی اپنی پگڈنڈی ہوتی ہے، یہ دنیاوی راہوں شاہراہوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ زندگانی کے روز و شب کی ساری گردش کا مرکزہ سمو بنتی گئی۔ ساری خواہشیں، مسرتیں، کاوشیں، مظاہر مناظر سمو سے وابستہ ہوتے گئے۔ سمو عالم کی وسعتیں پا کر کُل میں ڈھلتی گئی۔ کائنات سکڑ کر سمو بن گئی اور مگر اُدھر سمو ڈھل کر کائنات بنتی گئی: ''اللہ بارش دے دو کہ سمو کے پالتو بکرے دنبے پیاسے ہیں''۔ خیرات کے گوشت میں عورتوں کا حصہ الگ کر کے پہلے انہیں کھلاؤ کہ، ''عورتیں سمو کی رعیت ہیں!''، ''اپنے اپنے ریوڑ سے ایک دنبہ لاؤ تا کہ بڑی سی خیرات کریں، خلق خدا گوشت کھائے کہ سمو کی شادی ہے.....'' وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔

سمو کی ذات کی پیچھے، اُس کے نام کا برانڈ لیے، اُس کے تعلق سے، اور اُس کی آڑ لے کر انسانوں کی بہبود کا کام کرنا ہے، اور یوں اچھائی، اور خدمتِ خلق مست کی زندگانی کے ہر نکتے کا آغاز اور انجام ٹھہرا:

مئیں سلاماں دئے توپہ ماڑیّا
شاذیہاں نشتی ئے قراریّا
پیاذغاں دگ گوئنڈیں شکاریّا

ترجمہ:

میرا سلام دے دو، فصیل کے مالک شادیہان کو
کہ تم تو قرار و آرام سے رہ رہے ہو
لیکن اگر شکاری نامی پہاڑ کی چٹان کو کٹوا کر راستہ بنا دو
تو پیدلوں کے لیے سفر بہت مختصر ہو جائے گا

واضح رہے کہ شکاری نامی دشوار چٹان دکی اور ماوند کے راستے پر آتی ہے۔ اتنی دشوار کہ راہی کو اُس کے گرد طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ مست نے شاعری میں کسی راہ رو کے ہاتھ فرمائش بھجوادی اور شادیہان اپنے لوگوں کے ساتھ کدالیں اور دِگّا لیے اُس چٹان کے سر پر ضربیں مارنے آن موجود ہوا۔ وہ لوگ اُس وقت تک بلا اجرت و شہرت کام کرتے رہے جب تک کہ چٹان پیدلوں کے لیے شاہ راہ نہ بن گئی۔

یہی کام مست نے ماوند کے قریب موجود باغار نامی چٹان سے بھی کروایا۔ قبائلی سربراہ شادیہان سمو کا اوورسیئر بنا، اُس کے نام اور اُس کے محبوب کی فرمائش پہ سڑکیں راستے بناتا رہا۔ جی ہاں اُس زمانے میں علاقے کا طاقت ور ترین قبائلی سربراہ عوام کی بہبود کے لیے مستری بن چکا تھا۔.....مست و شادیہان جیسے لوگ ہی تو بلوچوں کے ایدھی اور ادیب رضوی کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں۔

مست نے جہاں ذرا بھی قیام کیا، بیٹھے بیٹھے دس بارہ پتھر جمع کیے، لائن میں رکھ کر چار دیواری جیسی حد بندی کی علامت بنا ڈالی اور اُسے مسجد کہہ ڈالا۔ مری، کھیتر انڑ، بزدار، بگٹی، قیصرانڑیں اور مزاری کے علاقے میں بے شمار ''مستہ مسیت'' موجود ہیں۔

اسی طرح وہ بارانی بلوچستان میں جگہ جگہ بارش کا پانی جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کے لیے تالاب کھدواتا رہا ہے اور اس کا نام ''مستہ اوٹغ'' رکھتا رہا۔ تا کہ چرند پرند اور انسان ''تانہہ آفی'' (پانی کی کم یابی) کی وجہ سے پیاس سے نہ مریں۔ اوٹغ ایسی جگہوں پر کھدواتے رہے ہیں جہاں پہاڑوں کے بارانی پانی کے بہاؤ کو بڑے بند اور وسیع گڑھے کے ذریعے جمع رکھا جا سکے۔

مست نے یہ بہبودی کام بہت سے علاقوں میں کیے۔ اور پورے مشرقی بلوچستان میں کیے، ہر قبیلے میں۔

کہیں ریلوے سٹیشن بنانے کے عوامی مطالبے پہ مبینہ طور پر چلتی ریل گاڑی کو پاؤں سے ''ہش سمولاغ'' (رک جا سموّ کا گدھا) کہہ کر روک رہا ہے، کہیں فقیروں درویشوں پہ ٹرین کا کرایہ معاف کروا رہا ہے۔

مخاطب سمو ہے، مقصد انسانوں کی خدمت ہے۔ یہی ہے توکلی کی بلندی، سربلند۔ ایسا انسان دوست انسان جو عام توکلی سے اونچا ہوتا گیا، اور مست کی صورت اختیار کرتا گیا۔ اس کی پیش گوئیاں سچ بنتی گئیں، دم کرنے سے بیمار ٹھیک ہونے لگے۔ اس کی درویشی پکی ہوتی گئی۔ سب کو یقین ہوا کہ مست واقعی فقیر ہے درویش ہے، بزرگ ہے۔ اس نے فلاسفروں والا راستہ اپنایا.....وہ شاعری کرنے لگا۔

انھی خوبیوں، اچھائیوں کے مجموعے سے ابھرتا ہے توکلی مست۔ انھی انسانی اوصاف کا مجموعہ تھا ہمارا یہ عاشق۔ سیدھا سادا خیر خواہ انسان، نیک دل، ہمدرد اور دل خواہی سے بھرپور۔ اب ایسے مست کو اگر کوئی، دلائی لامہ کے چوغے میں لپیٹ دینا چاہے تو کتنی بڑی زیادتی ہوگی۔ اِن بے دلیل و بے منطق لوگوں کی جہالت دیکھیں کہ وہ کس شخص کو ''صوفی'' بنانے نکلے ہیں۔ ذرا تصور کرلیں کہ قبائلی معاشرہ ہے اور ایک شخص اعلانیہ طور پر، شاعری کے ذریعے محفلوں اجتماعوں میں ایک شادی شدہ اور آل اولاد رکھنے والی محترم و مکرم خاتون سے محبت کا کھلے عام اعلان کرتا پھر رہا ہو۔ اُسے نہ اپنی عزت وقار کا خیال ہے، نہ سیاہ کاری میں قتل ہونے کا ڈر.....زمان و مکان کی اتنی بڑی بغاوت تو ایک جی نیئس ہی کر سکے گا؟۔ مروج سے بغاوت، معروض سے بغاوت، معروض کے وارثوں مالکوں سے بغاوت، پورے ویلیو سسٹم سے بغاوت؟۔ ارے سائیں مست باغی تھا، انقلابی تھا۔ وہ کہاں سے سٹیٹس کو کا ترجمان ہوگا۔ پورے ساٹھ ستر سال تک سرکاری نشریاتی تبلیغی اداروں کے دانش ور مست کے ساتھ یہ ناانصافی کرتے رہے.....ایسی صوفی گیری سے مست کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ عام بلوچ تھا، اور عام بلوچوں کے اندر رہ کر دانش اور کمٹ منٹ کا پرچم بلند کیے

رہا۔ انسانی زندگی کی مشکلات کو کم کرنے میں لگا رہا۔ نہ کسی دوزخ کے خوف سے اور نہ کسی لالچ میں۔

****

محبت و مہر کمٹ منٹ کے تسلسل کا نام ہے، اعتبار کا متواتر امتحان۔ محبت آگ میں ننگے پیر چلنے کی آزمائش ہے۔ محبت اپنے پیروکار کو تذلیل سے بچاتی ہے، بے توقیر ہونے نہیں دیتی، ہر دروازے پہ جھکنے نہیں دیتی۔ سب کو پتہ ہے کہ محبت محبّ کو خود اپنے آپ کے سوا کچھ بھی نہیں دیتی۔

پچھلے ابواب میں بھی ہم آپ نے مست کو ہمہ وقت درد بھری فریادیں کرتے دیکھا ہے، ہم اگلے ابواب میں بھی درد کی اس شدت و ثبات کی باتیں کریں گے۔ بھئی، اگر محبت اور اس کے درد کو مست سے نکال دیں تو کچھ بھی نہ بچے گا۔ وہ گرگڑاتا ہے جیسے اونٹنی سے اس کا بچہ بچھڑ جائے۔ مگر ایک بات کی طرف ضرور توجہ دیں؛ مست کی ساری زندگی کی یہ ساری فریادیں، یہ سارا نالہِ حزیں صرف اور صرف سازِ عشق کا ہی تھا۔ کیا کبھی مست کو محبت کے علاوہ کسی اور درد میں روتے کسی نے دیکھا، کسی نے سنا؟ کسی نے پڑھا؟۔ اس کے واحد زندہ چھوٹے بھائی پیرک کی موت واقع ہوئی وہ نہ رویا، کاہان پہ انگریزوں کا قبضہ اس کے لیے محض تشویش اور غصہ بھری بے قرار کرنے والی بری خبر ہے، وہ روتا پیٹتا قطعاً نہیں۔ بلوچستان کی پسماندہ راہیں شاہراہیں اُسے لوگوں کو جمع کر کے خود کو بہتر اور ہم وار کرنے پر اکساتی تو ہیں، مگر وہ اپنی زندگی کے دکھوں پہ آہ و بکا نہیں کرتا۔ سرداروں کے مذاق کا مسلسل نشانہ بنے رہنے کی بے حرمتی کی شکایتیں تو کرتا ہے، شعر تو کہتا ہے مگر رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔ دہلی میں دھکّے ملنے کے سارے درد بھاگ کر اُس درِ دُکل میں پناہ لیتے ہیں جو اُس مخصوص رمق کا جگایا ہوتا ہے۔ زمانے کے باقی سارے درد، عشق کے بڑے درد کے سائے میں یوں چُھپ جاتے ہیں جیسے مرغی کے چوزے ماں کے پروں کے نیچے پناہ لیتے ہیں۔ مست کے ہاں محبت اور فراق کے زخم ہی زخمِ اعظم، دردِ اعظم ہوتے ہیں۔ محبت کا زخم باہر سے دکھائی نہ بھی دے لیکن درد تو ہوتا ہے۔ عشق کا یہ درد بڑا اسلو ریلیز نگ ہوتا ہے۔ دو طرفہ آگ کی سجی، نہ تیز نہ مدھم، نہ سکون نہ بے سکونی، نہ قرار نہ بے قراری.....کسک سسک.....یہی رمق، یہی تجلی اور یہی درد مست کی زندگی

کے ساتھی بنے۔مست، سمو سے ڈسا جا چکا تھا۔وہ دیوی کے حسن کی تیر سے گھائل ہو چکا جو اتنی بھرپور اتنی مکمل تھی کہ دوسرے زخم بہت حقیر تھے، اُن دوسرے دنیاوی زخموں پہ کراہنا تو بہت ہی حقیر کام تھا۔آنسو بہاتا، ڈکراتا، بلبلاتا مست باقی سارے مظاہرِ عالم کے سامنے ایک بہادر پہلوان کی صورت کھڑا تھا۔اسی مہر نے اس کی کمیاں، خامیاں مٹادیں۔مہر سفلی طفلی حسرتوں، خواہشوں اور تمناؤں کا قاتل ہوتا ہے۔یہ ان کو ختم نہیں کرتا انہیں ٹرانسفارم کرتا ہے، اُن پہ قابو پاتا ہے۔محبت نے مست میں صرف جاں گدازی نہیں چھوڑی، جاں نثاری بھی چھوڑی۔مہر میں تفریقِ ہستی نہیں ہے، مہر میں تقسیمِ مستی نہیں ہے۔مہر، کمیونزم ہے۔

ملکوتی جذبہ سے سرشار وہ بڑی آفاقی میوزک کی جنرل اسمبلی میں بلوچستان کا مستقل مندوب بن گیا۔تھاپ کے ساتھ ہی اس کے قدم اٹھتے تھے، لَے کے دوش پہ اس کے بازو پھیلتے سمٹتے تھے اور عشق ہی کے اشاروں پہ اس کا جسم تھرکتا تھا۔مست ایک ہی جلوہ کے ہاتھوں فطرت کی رقص گاہ کا مرکز بن جاتا ہے، عظیم لولا کی ہم آہنگی میں رل مل جاتا ہے.....کوئی دوئی نہیں، کوئی بے سُراپن نہیں۔مہر نے ایک طرح کی ابدی خاموشی ابدی حیرت دے کر اُسے ابدی کیف اور ابدی مسرت بخش دی۔سمو حسن، حسن سمو، سمو کیف، کیف سمو، کیف آور سمو، استاد سمو، موسیقار جھنکار سمو، منظر وہی دے گئی، وہی تمناؤں کا روشن ترین ستارہ بن گئی، بصارت وہی بخش گئی بصیرت، اُدھر ہی سے آئی۔

محبت آنکھوں سے نہیں دل و دماغ سے دیکھتی ہے، اسی لیے تو پروں والے کیوپڈ کو اندھا دکھایا جاتا ہے۔

محبت کیا ہے.....؟ محبوب کی معرفت کے حصول، اور محبوب کی مرضی پوری کرنے کے لیے انتہائی کوشش صرف کرنا محبت ہے۔دل سے محبوب کے سوا ہر چیز کے نکل جانے کا نام محبت ہے۔ایسی روشنی جو قلب و روح کو منور کر دیتی ہے۔عرفان کی اُن منزلوں کو چھوتی ہے جہاں بظاہر ظاہری اسباب و وسائل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔محبت ہزاروں میلوں کی مسافت پر موجود محبوب کی دھڑکنوں کو محسوس کر لیتی ہے۔سانسوں کے ردھم کو سن لیتی ہے۔جہاں محبوب کے دل کی بات

سمجھنے کے لیے الفاظ و اظہار لایعنی ہو کر رہ جاتے ہیں، وہاں دل کی بات دل سمجھ لیتا ہے۔روح کی پکار، روح سن لیتی ہے۔

.....اور یہ روزِ اول ہوا تھا۔اُسی شام جب لگا جیسے تتڑا کے پہاڑ پہ بہشتی موسموں کا شہزادہ کھیل رہا ہے، ابدیت کا ساز دامنِ کوہِ رستانی پہ جو بجا تھا، وہیں تو عظیم الشان نغمہ بلند ہوا تھا، وہیں پریم کی ڈوریاں مست کو جکڑنے کے لیے پھینک دی گئی تھیں۔سمو سے منعکس ہونے والے نور کی ندیاں بہی تھیں اور سکون کے ساگر کا جھولا پینگیں لے چکا تھا، ایسا سکون روشن ہوا جس میں لاکھوں بے چینیاں تھیں۔مہر بذاتِ خود مقصد، آرزوئے مقصد، حصولِ مقصد اور مدعائے زندگی بن چکی تھی۔مست، سمو کی دید کے راحت آمیز مشروب سے مست ہو گیا تھا، جاہل سے عالم بن گیا تھا، باتونی سے خاموش اور خاموشی سے شاعر۔مہر جو ازل سے تھا، جو ابد تک ہے۔یہی مہر اسے اکائی سے کائنات تک لے گیا تھا، وارفتگی عطا کر دی تھی ..... وارفتگی سے واپسی ناممکن، واپسی کی ہر ترغیب اس کی توہین ہے۔خدا مہروندوں کو کائنات کی وسعت سے اکائی کی پستی تک پسپائی سے بچائے، خدا اُسے واپس جسم تک آنے سے بچائے، خدا عشق کی توہین سے بچائے۔

مست توکلی نے سام رس چوسا، جیسے محبوب کے اَدھ کھلے منہ میں چمکتے دانتوں پہ زبان رکھ دی ہو۔اس نے حسن پر عشق کی مہر لگا دی، وہ نڈر ہو گیا۔قبیلے سے نڈر، قوم سے نڈر، بلوچ سماج سے نڈر، سماجی بندھنوں سے نڈر۔سمو نے اُسے فیوڈل ثقافت کو دُھتکارنے کی جرأت بخش دی۔عاشق مست خود سب سے بڑا ہوا، سب سے بے پرواہ۔خود ہی یسوع، خود ہی ویرونیکا، خود یہودا، خود پطرس، خود حواری، خود صلیب، خود کلوری۔''آپے گڈّی آپے ڈور''۔اٹھلاتی متوالی سمندری نرم موجوں والی چال، رقصاں اور شاعری کرتی آنکھیں.....اور حسنِ کامل۔مست نور کے اس چشمے سے، کا ناف، پی کر خود نور ہو گیا تھا..... نور ہی نور، اس کے اوارے دوارے سب نور، زمین نور، آسمان نور، چاند نور، چتّواں مراثی نور، اُس کا طنبورہ نور، ازل نور، ابد نور، اٹھنا بیٹھنا نور، ارتقا انقلاب نور، غم نور مسرت نور، بیجی نور، بیجی کی لہریں نور، نور تدڑی نور ماوند، نفسک ساڑتاف نور، مست نور، مست کے ماننے والے نور.....مگر نور کا سرچشمہ : سمو۔سمو کے نور نے مست کی

تاریکی کو جذب کرلیا، اُس کے دل نے اِس کے دل کو سمولیا، اُس کی آنکھوں نے اس کی آنکھیں سمیٹ لیں، اس کی صداقت نے مست کے جھوٹ کو تیمّم دے دیا۔ مست نے محبت کو قریب کرلیا اور خود قربت کا پجاری ہوگیا۔ کوہستان نے تالیاں بجائیں کہ کسی ایک نے پھر جرأتِ انکار کرڈالی، کفر رواج کا ایک اور واقعہ ہوگیا تھا، تبدیلیِ عقیدہ کا ایک اور طبل بج چکا تھا۔

اور پھر کبھی کاہان میں سمو جیسی مدھر چال کوئی دوسری ناری نہ چلی، غازی خان میں کوئی کنجری سمو سے کیے قول کو تڑوا نہ سکی۔ مست کے عشق کی پائیداری ضرب المثل بن گئی، عشق بادل کا نرم سایہ بنا جسے کبھی شہرت اور عہدے کی، لالچ اور خوف کی دھوپ دبوچ نہ سکی۔ مست وسمو کے عشق کا پھل دار درخت کسی موسم میں بے ثمر نہ ہوا، یہ بھرا برتن کسی کے سامنے برہنہ نہ ہوا۔ یہ شیریں شفاف اور سخی ندی کبھی خشک نہ ہوئی۔

مہرواں باث و وذ گہیں راہاں شوں دیا
پہ ہمو مسکیف ہر کسی پُجاثاں مراذ
پہ ہزار گنجیں کو ڑو ا بے بہر کس مہ وا
میغ و سمو ئے دو ستیازیادہ کنت ہذا

(اللہ وآمین)

قحط سالیوں کے بلوچستان میں سردیوں میں گھاس سبزہ بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ تین ماہ بلا کی سردی پڑتی ہے۔ یوں سردی اور بھوک بہت تعداد میں مویشی مارتی ہیں۔ ریوڑ لاغر اور نڈھال ہوجاتے ہیں۔ انہیں اپریل تک زندہ رکھنے کے لیے اگلے تین ماہ تک چارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تب بلوچ عورتیں اپنی جان خطرے میں ڈال کر میلوں کا فاصلہ طے کرکے دشوار چٹانوں اور خطرناک پہاڑوں پر جاکر سوکھی ہوئی گھاس کاٹ کر لاتی ہیں۔ ایسی دشوار گزار جگہیں جن کی گھاس سال بھر میں نہ تو کسی پہاڑی جانوروں کی پہنچ میں رہی ہو اور نہ اُس پر پہلے کسی دوسرے انسان کی نظر پڑی ہو۔

رہ گزاں سمو روث پہ ریما
دوست منی روثاں پنگھرے دیما

سمو گھاس کاٹنے جاتی ہے
میری دوست بلند اور اڑیل چٹان پہ گھاس کاٹتی ہے

''کاہ چر'' (کاشر) اس علاقے کو کہتے ہیں جہاں ذرا سی گھاس کی اطلاع ملتے ہی علاقے کے سارے چرواہے اپنے مویشی لے کر 15-20 دن کے لیے پہنچ جاتے ہیں اور جب وہ گھاس ختم ہوجاتی ہے تو وہ پھر کسی اور کاہ چر کی طرف رواں ہوجاتے ہیں۔ مری علاقہ میں مست وسمو کے زمانے میں آج کی طرح مشہور کاہ چر مندرجہ ذیل تھے، جن کے درمیان ہمارے بھیڑ پال لوگ اپنے اپنے ریوڑ لے کر صفا و مروہ کی دوڑیں لگاتے رہتے ہیں:

گنجیں ٹمھاڑ، کڑوسریں جاندرانڑ، موشریں چمالنگ، تیمریں تدڑی، مزں مریں رستزانی، ہمبوئیں کوٹ منڈاھی، کڑوگڑ دنیں ڈونگان اور کچھیں ماوند۔ بیگل جہاز اور ڈارون بھی اگر مست کے علاقے میں ہوتے تو وہ بھی گھاس وسبزہ کی تلاش کے سفر کرتے رہتے۔.....سمو اسی گردونواح کی انسان تھی، اس لیے وہ بھی کوئی استثنا نہ تھی۔

انسان ہر دور میں مشقت کرتا ہے۔ یہی اُس کے انسان ہونے کی پہچان ہے۔ پرابلم صرف ایک جگہ آتی ہے، جب دوسرے اُس کی مشقت کو تسلیم نہ کریں اور جب اُس کی مشقت کو اپنے ذاتی منافع کے لیے استعمال کریں۔ یعنی مشقت محنت کرنا بہت اچھی بات ہے، مشقت کا استحصال کرنا بری بات ہے۔ مست نے محض ایک جگہ پہ نہیں، بلکہ بار بار سمو کے توسط سے بلوچ عورت کی مشقت کو تسلیم کیا۔ اُس مشقت کی شدت کو ناپا، تولا، اس سے نجات کی خواہش کی۔ اُس نجات کے لیے متبادل بتائے۔ ایک بہت ہی ابتدائی طبقاتی سماج میں یہی بات کرنا بھی بہت باریک دانش وری ہے۔ مست عورت کے حالاتِ کار کی سختی کو بیان کرتا ہے۔ وہ اس کی مشقت اور محنت کو بیان کرتا ہے:

ٹلّی مئیں دوست ماں گزدریں بیٹاں
(میری محبوبہ گزنامی درختوں والی ریت پر گھسٹتی چلتی ہے)

سمو، جو کہ مست کی زندگی کی محور و مرکز ہے۔ وہ اس کی مشقت بھری زندگی پر کڑھتا ہے۔ صرف وہی کہہ سکتا ہے کہ:

دوست منی پالوشاں شتہ سندھا
دیم پہ دیریں الکہاں داشئی
پیاذغی دوست گوں امسراں ٹلی
بُول تفسی ماں شیفغیں پونزا
ملّغی ڈیلا جنت لوارگرمیں

ترجمہ:

میری دوست جھلسانے والے سندھ گئی ہے
اس نے دور دراز کے علاقوں کا رخ کیا
پیدل گھسٹتی ہے میری محبوبہ اپنی ہم عمروں کے ساتھ
بول نامی ناک کا زیور اس کی ستواں ناک میں تپ جاتا ہے
اس کے نازک بدن کو گرم لو مار دیتی ہے

CEDAW دو سو برس گزرنے کے بعد بھی وہ فقرہ نہ کہہ سکا جو کہ ہمارا دور اندیش مست کہہ گیا تھا کہ: ''میری ماہ جبیں نازک محبوبہ بکریاں چرانے کے لیے تو نہ تھی''۔ (اس سے تو معاشرے کو دوسرے بڑے کام لینے چاہیے تھے!!)۔

مست، سمو کی تکالیف پہ ہی نہیں کڑھتا، بلکہ وہ تو ان قوتوں کی نشان دہی بھی کرتا ہے جو سمو کا استحصال کرتی ہیں، اُسے مشقت کی بھٹی میں جھونکتی ہیں۔ جو سماج مست کی سمو کو ننگے پیر پہاڑوں، ندی نالوں، چٹانوں، چوٹیوں پہ بھیڑ بکریوں کے لیے چراگاہوں کی تلاش میں شب و روز بھٹکنے پر مجبور کرتا ہے وہ سماج و قوم اور وہ معاشرہ مست کی نظر میں بزدل، کم زور، محتاج اور غلام ہے:

دوست منی بے واکاں کشہ وانڈھوگوں بزاں
پاذ شفاذیا کوہ بن وکوڑان و گراں

ترجمہ:

بے اختیار لوگوں نے محبوبہ کو عارضی چراگاہ میں قیام کے لیے بکریوں کے ساتھ کر دیا ہے
ننگے پاؤں پہاڑوں اور دامنوں اور چٹانوں میں

ہمیں اِس حقیقت سے واقف ہونا چاہیے کہ دو سو برس قبل کا بلوچستان اس کا متبادل دے بھی نہیں سکتا تھا۔ ظاہر ہے جس علاقے میں بارش ہوگی، وہیں سبزہ اُگے گا۔ لہٰذا اُسی علاقے میں سارے لوگ اپنے گھر بار عارضی طور پر چھوڑ کر اپنے ریوڑ لے جاتے ہیں۔ وہ پندرہ بیس دن عارضی آئی ڈی پیز (وانڈھوی) بن جاتے ہیں۔ جب اُس جگہ بارش والا پانی اور گھاس مویشیوں کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے تو وہ پھر واپس اپنے اصل گھر لوٹتے ہیں۔ اُس زمانے میں (بلکہ اب بھی) فارمنگ کا نہ تصور موجود تھا نہ حکومتی اقدامات تھے اِس لیے کہ حکومت تو ہوتی نہیں تھی۔ صنعتی سماج تھا نہیں کہ وہاں مزدوری کی جاتی۔ زراعت وہاں کیا ہوگی جب پینے کا پانی تک موجود نہ ہو۔ ٹیوب ویل اور نہر بہت بعد میں انسان نے وضع کرنے شروع کر دیے۔ اس لیے پیداواری رشتے تو یہی مویشی بانی کے ہی رہنے تھے۔ مگر یہاں سمو کی زندگی کی کٹھنائی کو محسوس کرنا، اس کی مشقت کا وزن و ناپ بیان کرنا، اور اُن پر کڑھنا ہی تو افضل انسانیت تھی۔ بلاشبہ جب بھی بلوچستان میں عورتوں کی نجات کی تنظیم قائم ہوگی تو مستِ مقدس کا نام سرخ روشنائی میں اس کے ''بانی'' کے طور پر لکھا جائے گا۔

سمو کا ایک بیٹا تھا، چھوٹا۔ ایک بار جب مست، سمو کے ہاں مہمان ٹھہرا تو سمو اُس سے ملنے آئی۔ بیٹا بھی ساتھ ساتھ چلا آیا۔ سمو نے مست سے دُراہی کیا (ہاتھ ملایا)۔ کچھ دیر بیٹھی مست کے ساتھ۔ اس کے بعد کہا، ''گنوخ (مجنوں) گھر چلتی ہوں، اجازت دو''۔ مست نے کہا، ''ہا، موکلیں ترا۔ اب چلی جاؤ''۔ ماں کے دوپٹے کا پلّو پکڑے ہوئے بیٹا بھی ماں کے ساتھ

روانہ ہوگیا۔ ماں بیٹے کی رفتار میں تفاوت کے سبب سر کی چادر کھچ گئی اور وہ سمو مائی کے مقدس سر سے گر گئی۔ سر کی چادر اور دستار کا گر جانا بلوچستان میں انتہائی بدشگونی اور باعثِ تضحیک تصور ہوتا ہے۔ ریورنڈ سمو کے ویٹیکن سر کا ننگا ہونا مست کے لیے ناقابلِ تصور تھا' جھٹ سے کہا: ''ہے تئی دست بھرا' تہ سموسری پرینتہ''۔ (ارے تیرا ہاتھ ٹوٹ جائے' تو نے سمو کی چادر گرادی)۔ بچے کا ہاتھ بھی سوکھ گیا اور وہ پاگل ہو کر مر بھی گیا۔

جس شخص نے عورت کی بے حرمتی پر سمو جیسی محبوبہ کے سونے جیسے بیٹے کو معاف نہ کیا، وہ بھلا عورتوں کی بے توقیری پہ دوسروں کو بخشے گا؟۔ تو لوگو! یا، سموراج کی تکریم کرو یا پھر مست کی بددعا کا سامنا کرو!۔ بڑے انسانوں کے افعال اور اقوال کو وسیع تناظر میں دیکھنے والے لوگ ہی ثقافتی طور پر بلند ہونے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

آج بھی پورا بلوچستان، پوری بلوچ قوم مست کے اس فتوے کی زد میں ہے۔ اے چارہ گراں، کچھ اس طرف بھی توجہ دیجیے۔ اے آزادی آبادی کے متوالو، بلوچستان کی سمو تو اب بھی، اکیسویں صدی میں بھی ننگے پیر بکریوں، چراگاہوں کی غلام ہے۔ اسے آزادی دلانے کی بات کرو۔ مگر نہیں کروگے، بس گم راہی پھیلاتے رہوگے، آزادی، آبادی، اور ایسی ہیومن رائٹس مانگتے رہتے ہو جن کا تمہارے اپنے گھر کے ہیومنز پر اطلاق نہ ہو۔

فکرِ مست محض نظریاتی دانش ورانہ نکتہ وری نہ تھی۔ یہ تو عوامی پذیرائی اور قبولیت کا ایک ایسا انقلاب تھا جسے جان ریڈ کے بقول، ''ہزاروں لاکھوں کان ایسے تھے جو اُس کی باتیں سننے کے لیے جیسے پہلے ہی تیار ہوں''۔ ذرا غور کیجیے کہ غربت و افلاس میں پڑا ہمارا قبائلی' اپنا آنہ آنہ سنبھال کر رکھتا ہے۔ اپنی اولاد پہ بھی خرچ کرنے سے قبل وہ دس بار سوچتا ہے۔ مگر وہی Calculated شخص جب مست توکلی کو گزرتا دیکھتا ہے تو جا کر اُس کی منتیں، سماجتیں کرتا ہے، اُسے مہمان ٹھہراتا ہے، سمو کے نام پہ پانچ سات دنبے خیرات کرتا ہے یا پھر سمو کی شادی رچانے آٹھ دس دنبے کاٹ ڈالتا ہے۔ آس پاس سے بھی ہر شخص اس فرضی شادی کے لیے اپنے اپنے خیمے سے ایک ایک دنبہ سر پہ اُٹھائے مرکزی اجتماع کی طرف چلتا آتا ہے۔ یوں بغیر دعوت کے، بغیر کارڈ کے' بغیر کسی واحد

میزبان کے' دولہا توکلی اپنی شادی کا ایک ہی نشست میں ہزاروں روپے والا جشن مناتا۔ اس جشن میں حال حوال ہوتا، جھگڑے تصفیے میں ڈھل جاتے' سیاسی سماجی مسائل پہ بحثیں ہوتیں، موسیقی ہوتی، رقص و دریس ہوتا اور کلام مست گایا جاتا۔ ابھی اِدھر سے فارغ ہوئے نہیں کہ اگلی وادی میں ایک اور میرج ہال تیار ہے۔ دولہا کے انتظار میں براتیوں کی ایک اور امت کھڑی ہے۔ سمو کی شادیوں کی محفلیں ہی تو اس ناصری کے مرید کے ہیکل تھیں۔ بلوچ لوگ اس انقلابی کی باتیں سننے، اور اس کی دعائیں لینے ایک دن میں دو دو چار چار بار سمو کی شادی کا جشن مناتے۔ مرد و زن اُمڈ اُمڈ کر آتے اس چے گویرا کی محفل میں جو نہ سردار تھا نہ سرکار، جو نہ وار لارڈ تھا نہ بھتہ وصول کرنے والا، نہ فتویٰ فروش تھا اور نہ ظاہر دار۔ ایک کنگال شخص پہ اپنی پونجی لٹاتے اور دنبہ بکری لا کر جنگل میں منگل کر جاتے میرے بلوچ۔ مالدار بھی خود، قصائی بھی خود، سبجی کے باورچی بھی خود، کھانے والے بھی خود۔ (میرے عوام کی نفسیات اب بھی وہی ہے، کوئی مست جیسا پاک انقلابی اُن کے پاس جائے تو!!)۔

اور یہ سارا جشن سمو کے نام کا تھا، سمو کی شادی کا فقرہ ہی مست کو تخیل اور شاعری میں اُس کے خیمے کی طرف لے جا سکتا تھا، سمو کی شادی کا ہی بجار (امداد باہمی کا دنبہ) ہوتا تھا۔ مگر سمو ایک عورت تو نہ تھی، سمو کی صورت تو کُل عورت ذات تھی۔ اسی لیے تو اس جشن میں گوشت خوری سے ذرا پہلے مست توکلی اپنے یک نقاطی انقلابی ایجنڈے کا مرغوب فقرہ ضرور کہتا: ''یک بریں سمو راجا جھاڑ، ناتیں ما گوژ دہ نہ وروں''۔ (پہلے سمو کی رعیت یعنی آس پاس خیموں میں موجود عورتوں کا حصہ انہیں کھلا دو' وگرنہ ہم نہ کھائیں گے)۔ ارے کیا یہ ون ملین ڈالر فقرہ، زندگی سے گریز کا فقرہ تھا؟، یا پھر یہی فقرہ عین زندگی تھا؟۔ ایک بھی شخص نہیں پورے بلوچ سماج میں بشمول میرے، جو اس اکیسویں صدی میں بھی اتنا پروگریسو ہو جتنا پروگریسو دو سو برس قبل مانٹرک بند میں توکلی نامی ایک چرواہا ہوا کرتا تھا۔

سمو کی قوم کا حصہ منصفانہ طور پر بانٹنے کے بعد، مست محفل میں موجود لوگوں میں گوشت برابر برابر بانٹ دیتا اور پھر اپنا اور اپنی دوست سمو کا حصہ وصول کرتا۔ مست دونوں حصے اٹھائے محفل

سے ذرا دور جا کر بیٹھ جاتا اور ایک شخص کو کھانا پیش کرتے نظر آتا۔ وہ شخص نظر نہ آتا، بس کھانا ختم ہو رہا ہوتا۔ کھاتے ہوئے مست اس شخص سے گفتگو بھی کیے جاتا مگر زور زور سے نہیں بلکہ ایسے، جیسے قریب بیٹھی ہوئی شخصیت سے کی جاتی ہے۔ (ہماری مائتھالوجی کے صدقے جایئے!)۔

یہ دونوں محترم شخصیتیں انیسویں صدی کے آخری نصف میں محبت کی پرنُور وادی یعنی بلوچستان میں وہ تحریک لے کر اُٹھیں جو دنیا کے ہر کونے میں اپنے اپنے ڈھب اور اپنے اپنے طرز پہ جاری تھی: ''محبت کی تحریک''، نام تھا ان کی جدوجہد کا: محبت.....ایک ایسا مستقل مظہر جو اپنے سے منسوب لوگوں کو جریدۂ عالم پہ بقا بخشتا ہے، دوام عطا کرتا ہے۔ ضابطہ ہے زندگانی کا۔ دیگر سارے نظریات خواہ سائنسی ہوں یا غیر سائنسی، سارے مذاہب خواہ مشرقی ہوں یا مغربی، اور سارے فلسفے خواہ یونانی ہوں یا ایشیائی، اسی مطلق مرکزے تک رسائی کے لیے ہی اپنی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی ساری تکالیف، قربانیاں اور محنت اسی محبت کی شاہراہ کی تزئین کے لیے ہی تو ہیں۔ سمو اور سمو بیلی اسی آفاقی اچھائی یعنی محبت کی حکمرانی کے رضا کار تھے۔ وہ اُس ویلیو سسٹم کے خلاف کمر بستہ ہوئے جو ترقی اور ارتقا کے پیروں کی زنجیر بن چکا تھا۔ نجاتِ آدم کی یہ تحریک دراصل اُس پلے کارڈ کو لے کر چلی جسے بہت چھان پھٹک اور احتیاط کے بعد ''محبت کی آزادی'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ''گوڑی بے بختاں کہ عاشقانی غیوہ کفاں'' (بدبخت ترین لوگ ہوتے ہیں وہ جو عشاق کے امور میں ٹانگ اڑاتے ہیں)۔

تحریک کے یہ دونوں نفیس قائدین پوری زندگی بلوچ معاشرے میں محبت کی آزادی کی جنگ لڑتے رہے کہ وہ تو تھے ہی محبت کی آزادی والی پارٹی کے کل وقتی کارکن۔ محبت نے ان کا سب کچھ خرچ کرا ڈالا، محبت انہیں فٹ بال بنا بنا کر قطب شمالی و جنوبی کی مسافت والی ٹھوکریں مارتی رہی، انہیں جگ ہنسائی کا شکار بنایا، اُن کی قوتِ مزاحمت کو چاٹ ڈالنے کے جتن کیے.....

محبت نے ان کی دنیا اُجاڑ دی مگر محبت نے ان کی بخشش بھی تو کرا دی۔ محبت نے انہیں تونگر بنا ڈالا۔ انہیں، نظر انداز کیے جانے والے وجودوں سے اُٹھا کر سماجی تبدیلی کے اسباب و وسیلے میں ڈھال دیا۔ یہ اعزاز نہ پیسوں سے خریدا جا سکتا ہے، نہ اُسے خیرات میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سماجی تنظیم کا یہ عطیہ 'کبھی کبھار' اور 'کسی کسی' کو نصیب ہوتا ہے۔ مست اور سمو اسی ''کبھی کبھار'' اور ''کسی کسی'' میں فٹ بیٹھے اور ''ابد ابد'' اور ''ہمہ اُو ہمہ اُو'' میں ٹرانسفارم ہو گئے۔ ہم، برگزیدہ ٹھہرے۔ مست کا تذکرہ کر کے گویا شفق سے اُفق تک رواں اِس انسانی تحریک کی دو آنے کی ممبری ہم آپ نے بھی حاصل کر لی ہے۔

اسی جدوجہد کے دوران اُن پہ یہ واضح ہوا کہ سماجی عمل میں ان کا ''یک نقاطی ایجنڈہ'' کئی دوسرے نقاط سے وابستہ ہو کر وسعت پذیر ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ ''محبت کی آزادی'' ان تمام عوامل سے بھڑ گئی جو اس آزادی کے سامنے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اولین بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ محبت کے دو فریقین میں سے ایک، یعنی عورت کو تو اُس سماجی معاشرتی سطح تک آنے ہی نہ دیا گیا جہاں سے وہ برابری کی بنیاد پر، اور آزادی سے محبت کر سکتی ہو۔ چنانچہ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ آپ محبت کی آزادی کی بات کریں مگر، محبت میں شامل فریقین کی آزادی کی بات نہ کریں۔ اس لیے کہ دنیا میں محبت ہی وہ واحد متبرک کھیل ہے جسے صرف آزاد اور مساوی انسان ہی کھیل سکتے ہیں۔ آقائیت کی زنجیروں میں جکڑے فرعونوں کے لیے تو اس کے مین گیٹ پہ ہی Not Allowed کا بڑا سا بورڈ لگا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ساری رکاوٹیں مستیں تو کلی کے لیے طبقاتی دشمن بنیں جو عورت کی برابری اور آزادی کو روکتی تھیں۔ اس طرح پورا سر قبیلی فیوڈل نظام، اُس کی معاشی بنیادوں اور اُس کے اخلاقی اقدار سے نمٹنا مست کے لیے حکمت عملی میں مشاقی اور استادی کا معاملہ بنا۔

عورت کی آزادی کی جنگ کے ساتھ ساتھ دوسری جنگ اُس نے قبائلی اور بین القبائلی جنگوں اور خانہ جنگیوں کے خلاف شروع کی۔ اس لیے کہ محبت امن کے ماحول کی گل پری ہوتی ہے۔ کشت و خون، ہاؤ ہو، آتش و آہن اُسے مرجھا ڈالتے ہیں۔ امن ہی میں محبت پروان چڑھتی ہے، امن ہی میں مصوری اُگتی ہے، امن میں ادب، شعری، موسیقی اور رقص کو ترقی نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ اس جانب تاریخی اور بہت بڑی پہل کاری کی ضرورت تھی اور مست المست، چھلاوے کی مانند اس پہل کاری میں کود پڑا۔ اس نے اپنی تلوار اور ڈھال عین جنگ کے دوران محبت کے حوالے کر دی اور امن خرید لیا۔

ہوا یوں کہ 1858ء میں شم کے مقام پر دو بلوچ قبائل باہم بھڑ گئے۔ چمبھڑی نامی اس جنگ میں دونوں قبائل اپنی پوری قوت کے ساتھ ٹکرا گئے۔ گھمسان کے اس یُدھ میں مست توکلی بھی اپنی ساری مہارت اور جوانی کے ساتھ سرگرم تھا۔ تلواروں کی چمک ایک نیزے کے فاصلے تک آئے سورج کو اپنی حاضریاں دے رہی تھی۔ کٹتے لڑھکتے سر سفا کی کی گواہیاں دے رہے تھے، بجتی ڈھالیں خیر کی فاختہ کی دوریاں بڑھا رہی تھیں۔ ہنہناتے گھوڑے الحفیظ والامان کی قوالیاں گا رہے تھے، تلواروں کی کاٹ اولادِ آدم کی بقا کی لوحِ محفوظ میں چھید ڈالتی جاتی تھی، برادر کشی کا منشور واضح طور پر لکھا جا رہا تھا اور شیطان تالیاں بجا رہا تھا..... اچانک مست توکلی کو کچھ ہو گیا۔ وہ اس سب کی نفی کرنے لگ گیا۔ اسے خیر کے دبلے فرشتوں کی دوبارہ سرفرازی کرنی تھی۔ کسی بھی سمو کو ''بے مست'' نہ کرنے کا گنیز بک میں ریکارڈ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ مست نے وہ حرکت کر ڈالی جس کی بدولت اگر وہ کسی مہذب معاشرے میں ہوتا تو اس کے نام سے یونیورسٹیاں قائم ہوتیں، اُس کے مصرعے، سڑکوں، نصابوں، پروجیکٹوں کے سرورق بن جاتے اور ایک بین الاقوامی انعام مقرر ہوتا اچھے انسانوں کے لیے جس کا نام ''توکلی پیس پرائز'' رکھا جاتا۔ مست نے اس جنگ کو یادگار بنا لیا کہ بلوچ تہذیب و تاریخ میں فکرِ مست کا ایک اور باب کھل گیا۔ دل تھام کے سنیے کہ تیغ زن، جوان سن، سرخ چشم و سیاہ جگر، مست جنگ کے عین شباب میں اپنے بھائی بندوں اور اپنے قبیلے کی گری ہوئی لاشوں اور نعروں کی للکار میں کشت و قتل سے اچانک دست بردار ہو جاتا ہے۔ وہ چمبھڑی کی جنگ کے میدان سے باہر نکل آتا ہے۔ قتل کا اوزار دائمی طور پر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور درندوں جیسی داؤ بازیاں رخصت ہو گئیں، دھاڑ چنگھاڑ کی یاوہ گوئی گنگ ہو جاتی ہے اور زمزم میں دھلا منہ مردار الفاظ کی لڑیاں پھوٹنے سے منکر ہونے لگتا ہے۔

چاہیں تو بے درد دانش ور کی طرح آپ بھی کہہ دیں کہ مست بزدل ہو گیا، چاہیں تو اپنی شعوری سطح کو عمودی سمت میں پست بنا کر وہی طعنے دہرائیں مست کے لیے جو عام آدمی عام آدمی کو ایسے موقعوں پر دیا کرتا ہے..... اور اگر چاہیں تو قبائلی جنگوں پر لعنت بھیجنے والے اس اولین بلوچ سورما کے ہاتھ پہ بیعت کر ڈالیں جس نے بھگوڑے پن اور محبت کو ترجیح دی مگر شیرِ بلوچ نہ بنا، پین

اسلام ازم کا نصیر خان نوری نہ ہوا۔ جس کا ہر اعصابی ریشہ موسیقی کی تار بن چکا ہو اُسے تقدس آلود دھاگے کی کیا ضرورت ہو گی۔

مگر مجھے یقین ہے، اے میرے اچھے قاری! کہ آپ بھی میری طرح اتنے بہادر نہیں۔ دنیا کی دائمی رزم گاہ بلوچستان میں جنگ کے خلاف بات کرنے کی جرأت ہم آپ میں رہی نہیں ہے۔ گوادر کے باشیل نامی پہاڑ سے لے کر جھنگ کے اُس پار تک آپ کے سارے بھائی بند، تلواریں سونتے ایک دوسرے کے قتل و قتال میں مصروف ہیں' تو آپ بھلا دریا کی مخالفت میں کیا تیریں گے؟ اور کب تک تیریں گے؟۔ قبائلی جنگوں کی حقیر تلوار بازی کا منظر نامہ 'Thrill' استغراق اور رومانٹس ازم سے اس قدر بھرا ہوتا ہے کہ زاویے بدل بدل کر چچازاد بھائی پر وار کرنے کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ بلوچ اس لیے خلا نورد، سائنس دان اور سٹیٹس مین نہیں ہے کہ اس کے دماغ کی ہر ہر فیکلٹی بردار کشی کے نت نئے داؤ پیچ ایجاد کرنے میں کھپ چکی ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے برادر کشی پاگل پن نہیں ہے؟ اور اگر ہے' تو بلوچستان کو پاگلوں کا وارڈ قرار نہ دیا جائے؟۔ اور اگر برادر کشی پاگل پن ہے اور اگر پورا بلوچستان پاگل ہے تو ایک صحت مند مست کو یہ سارے پاگل مل کر ''مست' مستالا' گنوخ'' نہ بولیں گے کیا؟۔ لہٰذا مست ہی پاگل ہے، مست کے ماننے والے ہی پاگل ہیں۔ باقی بلوچستان تو اپنے وارڈ میں لیٹا اپنی ہوش مندی کے گیت گا رہا ہے۔ آج بھی، اب بھی، اِسی وقت بھی۔

معلوم نہیں دانش کی گہرائی کی کیا سطح ہو گی جس نے دو سو برس قبل اس مجذوبی کھیل کی بے معنویت، لغو پن اور سطحیت کو ایک اَن پڑھ بلوچ پر آشکار کر دیا تھا۔ اور پھر بہادری کی اس گہرائی کو کون ناپے جہاں آپ دو بڑے قبائل کی مکمل یکسوئی والے قصاب پن سے علیحدہ ہو جاتے ہیں..... تن تنہا، اکیلا۔ اخلاقی جرأت کا سمندر چاہیے ہوتا ہے ایسے اقدام کے لیے۔ ''مشرق کا ستارہ'' تو ایک بار پھر جنم لے چکا تھا بلوچستان میں۔ یہاں مست بچہ نہ تھا بلکہ بیس بائیس برس کا قبائلی جوان تھا۔ وہ اس قبائلی نظام کا پرورش یافتہ تھا جہاں قبائلی جنگیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں، جہاں درندوں سے ہر وقت اپنا ریوڑ بچانا پڑتا ہے، جہاں چوروں، ڈاکوؤں سے ہر وقت نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔

جہاں فطرت کی ننگی آفتوں سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ اور مست اِن ساری ٹریننگوں اور ساری مشقوں میں سے گزر کر جوانی تک پہنچا تھا۔ وہ زبردست شکاری تھا، سیلانی تھا.....لہٰذا ہر طرح سے باہوش اور فہمیدہ شخص تھا۔ اور اس سارے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھیں تو پتہ چل جائے گا کہ جنگ جدال اور کشت و خون کو اس نے بہت سوچ سمجھ کر ہی مسترد کر دیا تھا۔(1) ایک سورما، شکاری، پھرتیلا، نوجوان اور جنگوں میں پیش پیش رہنے والے بلوچ نے قتلِ معصوماں میں شامل رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا یہ شعوری فیصلہ بعد میں اس کے ایک مصرعے کے تناظر میں بہت مشہور ہوا اور ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گیا۔۔ اس ایک مصرعے نے بلوچوں کو جتنا باشعور کیا، ایک پوری لائبریری اتنا نہ کر سکے گی۔ مصرع مصرعہ ملاحظہ ہو؛

جواں نہ ینت جنگانی بذیں بولی

(اچھی نہیں ہیں جنگ کی واہیات باتیں)

پھر یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ مست کے اسلاف میں ایک بلوچ خاتون اپنے محبوب خاوند کو اُس وقت بھائی قرار دیتی ہے جب اُس تک یہ جھوٹی خبر پہنچتی ہے کہ اس کے خاوند کو دشمن کا تیر ''پشت'' پہ لگا۔ یعنی اس جنگ میں پیٹھ دکھائی ہوگی۔ مگر یہاں تو مست، علی الاعلان، بہ نفسِ نفیس، بہ قلم خود، مکمل ہوش و حواس میں بلوچ مذبحہ خانے سے نکل بھاگتا ہے۔ مگر مہان سمّو ،مست کے اس عمل کو یوں آمنا صدقنا سمجھ کر پی جاتی ہے کہ گویا وہ خود بھی ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ حق پہ کھڑے ہو کر، مروج باطل سے اعلانیہ کفر کی جرأت کی قوت تو دیکھئے کہ برادر کش بلوچ کی برادر کش زبان میں برادر کشی سے انکار کرنے والے مست کے خلاف ایک بھی ضرب المثل نہ بنی۔ ایک ایسے قبیلے میں مست نے جنگ سے پیٹھ دکھائی جہاں ''راہزن'' نام کا باقاعدہ ایک عہدہ ہوتا ہے جس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ننگی تلوار لیے میدانِ جنگ میں کھڑا ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی شخص جنگ سے بھاگ نکلے تو وہ اسے قتل کر ڈالے۔ مگر دیکھئے کہ چمبھڑی کی جنگ میں راہزن بھی باادب باملاحظہ رہتا ہے اور مست اس بلوچ قتل گاہ سے ایسے خراماں نکل آتا ہے جیسے چمنستان میں سیر کرنے جا رہا ہو۔

نہ صرف مری قبیلے کو مست کی اس حرکت پہ کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ وہ اپنی زندگی کے اگلے چالیس برس تک بگٹیوں، مزاریوں، لیغاریوں، کھیتران، بزداروں، قیصرانڑیوں، دریشکوں، کھوسوں اور گشکوریوں کا روحانی پیشوا' اُن کا پیرانِ پیر' اُن کا اپنا' اُن کا شاعر' اُن کا دعا گورہ کر اُن کے دلوں دماغوں پر مکمل بادشاہی کر کے طبعی موت مر جاتا ہے۔ اور موت کے سوا سو برس بعد آج بھی مست کی محبوبیت اور ہر دل عزیزی میں کوئی کمی نہ آئی۔ اور بلاشبہ عالم گیر سچائیوں کو بیان کرنے والے اس ولی کا نام بہت بعید والے مستقبل تک لوگوں کے دلوں میں کندہ رہے گا۔

جنگ گریزی کے اس عظیم واقعہ کو معتبر بنانے کے لیے ہم مست علیہ الرحمہ کے اشعار بھی ڈالتے ہیں:

چمبھڑی جنگا مں سری مڑداں گون اثاں
یہ برے جنگئے جکثاں ناں وہشیں پڑاں
مار دو دیمی آ بیڑ شہ زرکاں پوترواں
ساکثہ آخر سرمنی زر مُشتیں لُڑاں
یہ برے کار کنڈغا گی ایشت ذرہ بُراں
ولنڑے اِشتو مں پذی رنداں گڑتغاں

ترجمہ:

میں جنگِ چھمبڑی میں صف اول میں شامل تھا
اور جنگ کے تلخ میدان میں موجود رہا
ہمیں دونوں جانب سے زرکانڑیں قبیلے نے گھیر لیا
نقرئی دستے والی تلواروں نے ہمارے سروں پہ سایہ کر دیا
زرہ بکتر چھید ڈالنے والی تلواریں کام تمام کیے دیتی تھیں
ولنڑ کو چھوڑ کر میں واپس ہو گیا

اس کا بھائی ولنڑ اس معرکے میں کام آیا، ظاہر ہے جس کا مست کو بے حد دکھ ہوا۔ (2)

مست نے زندگی بھر جنگ سے اپنی نفرت جاری رکھی۔ اس کا بجا طور پر خیال تھا کہ انسانوں کی آبادی، خوش حالی اور ترقی کے لیے امن ایک ضروری چیز ہے۔ امن تمام منفی قدروں کا مخالف ہوتا ہے، اور تمام مثبت قدروں کا حامی۔ مست امن کا خواہش مند ہو کر گویا تمام برائیوں کو جڑ سے کاٹنے اور تمام اچھائیوں کے شجر اگانا چاہتا تھا۔ اس نے جب بھی بلوچستان کی بات کی، وہ بات بارش کی کی، لہلہاتی فصلوں کی کی، چراگاہوں، مال مویشی کی تندرستی، گھوڑوں کے ہنہنانے، بھیڑوں بکریوں اور ان کے بچوں کے منمنانے کی کی، شتر بچوں کی بدمست چوکڑیاں بھرنے، دودھ اور گھی کی بہتات کی کی، امن وامان کی کی۔ وہ ایک امن دوست اور صلح جو رہنما کے بطور اپنی سنّت چھوڑ گیا اور جب جب جنگ چھڑ جانے کی بات ہوتی تو اُسے سخت تکلیف ہوتی۔ ایک ایسے ہی موقعے پر جب مخالف قبیلے سے جنگ شروع ہونے کی اطلاعات عام ہو گئیں تو لوگ اپنے بال بچوں اور مال مویشی لے کر محفوظ مقامات کی طرف چلے گئے۔ علاقہ ویرانی کے بھوت پر یتوں کا مسکن بنا، کھڑی فصلیں مالک مالکن کے قدموں کی چاپ سننے کو ترس گئیں۔ مست پر اس سارے منظر نامے نے چتا کا کام کیا۔ وہ جنگ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر بیٹھتا ہے، امن کی فاختہ کی بلائیں لیتا ہے، آبادی آبادکاری کے مالک سے ترس کھانے کی التجائیں کرتا ہے۔ وہ آدم زاد کی واپسی کی دعائیں مانگتا ہے اور گل زمین کی از سرنو بحالی کے منتر پڑھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

یا ھذا رکھ ژہ ناغماں شرّاں
بانگہے شرّاں ناغمانیاں
ناغمانیا کشتغیں زھماں
ھُوکلورُستہ مس شفہ نیاما
آتکہ ڈاھ ژہ برکھمہ دیما
لڈشہ راجاں دربھلوبّریں

کورمرنج ئے مں موسماں شرّیں
(کہ) سملئے لالیں بانڈوے مانیں
جواں نہ ینت جنگانی بذیں بولی
کئے وثی مال و مڑدماں رولی
لڈشہ راجاں دربّھلواشتہ
دیم پہ سوزیں جیہلاں داشہ
دوست منی پالوشاں شتہ سندھا
دیے پہ دیریں الکہاں داثئی
بُوٗلے تفسی مں شیفغیں پونزا
ملغی ڈیلا جنت لوار گرمیں
دوست ژہ دیریں الکہاں بیایاں
ہلکے مں اولی کوہ بناں نندا
بانہڑے اولی بوذناں ساراں
میش اووکوہانی سرہ بوراں
زرتئے رونی بنت مں تلّاں

ترجمہ:

اے خدا ناگہانی آفات سے بچا
(اور) سحرگاہ کے ناگہانی فسادات سے
اچانک نیام سے نکلی تلواروں سے بچا
آدھی رات کو غلغلہ بلند ہوا
بارکھان کی طرف سے جنگ کی اطلاع آئی

قبائل نقل مکانی کر گئے، در بھانی ویراں ہو گیا
دریائے مرنج بہت حسین ہے
کہ سمو کا خوب صورت گھر وہیں ہے
اچھی نہیں ہیں جنگوں کی واہیات باتیں
مال مویشی اور افراد خانہ در بدر ہو جاتے ہیں
قبائل نقل مکانی کر گئے، در بھانی سے
اور رخ کر لیا پردیس کے سبزہ زاروں کی طرف
میری محبوبہ جھلسا دینے والے سندھ کو گئی
دور دراز علاقوں کی طرف
اس کی ستواں ناک میں بول (زیور) تپ جاتی ہے
اس کے نازک بدن کو گرم لو لگتی ہے
کاش کہ عزیز و دوست دور دراز علاقوں سے لوٹیں
پہلے کی طرح دامنِ کوہ میں خیمے گاڑیں
اپنے چھوڑے ہوئے گھروں میں پھر بس جائیں
بھیڑیں پہاڑوں پہ منمناتی پھریں
جوار کی فصل کی کٹائی کرنے والیاں فصلوں میں ہوں

دراصل جنگ و امن کے انتخاب کا معاملہ ازل سے دانش وروں میں اہم مسئلہ رہا ہے۔ حکمرانی کے داؤ پیچ میں بلوچ پی ایچ ڈی، ڈاکٹر چاکر اعظم کے زمانے سے ہی شہ مرید کو اس مسئلے سے دوچار کیا جاتا ہے اور شہ مرید تیس سالہ جلاوطنی کو ترجیح دیتا ہے مگر وہ چاکری شیطانی جال (بردار کشی کی جنگ) میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرتا۔ دوسری طرف فکر و عمل کا پہلوان بیورغ ہے جو امن کے حق میں بہت خوبصورت موقف اپنا کر بھی اسے دوام نہ بخش سکا، اور بزدلی کے حقیر طعنے کے سامنے ہتھیار ڈال کر آفاقی گروہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ کون کہتا ہے کہ قبائلی جنگوں کے

دوران اندھا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ ہمارے دانشور مست نے Thrill اور جذبات سے بھرپور اس جنگ کو اور ہی طرح سے دیکھا تھا۔ مگر ماتھے کا لکھا ملاحظہ ہو کہ لزومیت بالاچ کو بھی ہیرو تو بنا گئی مگر بہت کوتاہ بینوں کا۔ معروض کے کھیل دیکھئے، کسی کو کہاں پٹخ دیتا ہے اور کسی کو کہاں پہنچا دیتا ہے۔!!

میر ژہ محلاں بادشاہی آں
ٹیلشہ براثی جھیڑو و جنگاں
کپتہ مس زندانیں غم و بنداں

ترجمہ:

میر (چاکر) کو شاہی محلات سے
برادر کشی نے نکال باہر کیا
اور وہ غموں کے زنداں کا قیدی بنا

مست کے اپنے جونیئر ہم عصر رحم علی مری کا معروض، برادر کشی والا نہ تھا بلکہ وہاں ایک ایسی برحق جنگ چھڑ گئی تھی جہاں ایک طرف بربریت بھرا سامراجی انگریز تھا جو ہزاروں کوس سے لوٹ مار کرنے اور انسانوں کو غلام بنانے بلوچستان آ نکلا تھا۔ اور دوسری طرف اپنی سرزمین اور بود و باش بچانے والے آزادی پسند مری تھے۔ رحم علی جنگ کا نامہ نگار بن جاتا ہے۔ اور پھر اپنے اس جنگی ہول ٹائمری کو ہی اپنی دانشوری تھما کر خود محض جنگ کا نقارچی بن جاتا ہے۔ لیکن مست کو آفاقی بنانے والے نے Paradigm ہی ایسا قائم کیا تھا کہ جنگوں، آہوں، اور قتلوں کا دلدادہ بلوچ بھی جنگی نقیب کی بجائے امن کے پجاری کا مرید بننے پر مجبور ہے۔ مست کا امتیاز یہ ہے کہ وہ حق کی خاطر جنگ کو جھٹکتا نہیں۔ ظلم، زور آوری اور بالادستی کے خلاف اس کا امن سراپا جنگ بن جاتا ہے۔ وہ علی الاعلان امام (حسینؓ) کی ٹولی میں شامل ہو کر یزیدیوں سے جنگ کا اعلان کرتا ہے۔ انگریز جب حملہ کرتا ہے اور مست علاقے میں نہیں ہوتا تو اس حملے کا بہت تشویش سے اپنی شاعری میں اظہار کرتا ہے اور خود اپنی

غیر حاضری کو بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ سیدھا سادا، بغیر لگی لپٹی کے واپس علاقے جا کر انگریز سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اُلکہاں دیراں اژ کئے آ پڑساں چھوراں
کس نہ یئے کو ہا کہ دلی احوالے گراں
بیا پذا گڑدوں کہ گپتغا کاہاں کافراں
دوشی ماں وہاوا آتکہ دودادرمیاں
اڑد جھوذانی پرشتغو بیشہ پشّواں
وسّغا جوانت راج بلوچانی کوہسراں
بیبی ئے بچّاں ڈسشہ راہ پر اُمتّی
دڑدونداں راسوب ژہ درگاہا ڈہی
مستہ بیڑابی پار بھیڈی ڈبّری

ترجمہ:

بہت دور ہوں کس سے مفصل حال حوال پوچھوں
علاقے سے کوئی آنے جانے والا نہیں کہ اصل حقائق معلوم ہوں
مجھے واپس جانا چاہیے اس لیے کہ کاہان پر کافر (انگریز) قابض ہو چکے ہیں
کل رات سردار دودا خان کو خواب میں دیکھا
کہ کفار کا لشکر شکست کھا گیا اور وہ پشیمان ہے
بلوچوں کے لیے کوہستان اچھا ہے
بی بیؓ کے بیٹوں نے امت کو راستہ دکھایا
دردمندوں کو فتح عرش سے نصیب ہوتی ہے
مست کا بیڑا پار، اس کی جیت

لہٰذا مست قبائلی خانہ جنگیوں کے سخت خلاف ہوتے ہوئے، سامراج دشمنی اور حق پرستی میں جنگ کو جائز قرار دیتا ہے۔

یہی حال آزات جمالدینی کا بھی ہے۔ وہ بھی اگر ایک طرف استبداد کے خلاف جنگ کرنے کا حامی ہے تو دوسری طرف عالمی امن کا زبردست طرف دار ہے۔ اس کی نظم ''تھوکتا ہوں جنگ پر'' بہت ہی مقبول ہے۔

یہ بات مست کے کارواں کے راہی ہی جان سکتے ہیں کہ بلوچوں کو آتش کی طرح پانی کی بھی ضرورت ہے۔ برادر کشی کی آگ بہت لگائی جا چکی اور کھیلی جا چکی۔ اب انگاروں پر لوٹنے سے بہتر ہے کہ پانی سے رغبت پیدا کی جائے۔

خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی کشت و کوش کے خلاف بھی جُت جانا چاہیے۔ اب تیر کمان اور تلوار کا دور نہیں اب تو ایٹم بم اور بین البرِ اعظمی میزائلوں کا برباد کر ڈالنے والا زمانہ ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی بین الاقوامی جنگ ہوئی تو یہ محض افراد، قبائل یا اقوام کی جنگ نہ ہوگی بلکہ انسان ذات بھسم ہو جائے گی۔ نسلِ انسان کی بقا کا معاملہ ہے۔ انسان ذات کی بقا سب سے اہم انسانی فریضہ ہے۔ انسان زندہ ہے تو اس کے لیے تعلیم، صحت، روزگار، رہائش اور ثقافتی ترقی کی کوششیں ہو سکتی ہیں۔ انسان زندہ ہے تو انسانی سرگرمیاں یعنی دنیا قائم ہے۔ اس لیے انسانیت کی بقا کی ضرورت پہ ایمان ہونا چاہیے۔ یہ عقیدے، نظریے، نسل، رنگ، ذاتی آمدنی، سماجی طبقے کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تو سارے انسانوں کا مسئلہ ہے، سارے انسان جو ایک ہی کشتی یعنی ''زمین'' پر سوار ہیں۔ سب کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ امن ہوگا تو انسانی بہبود کا نظریہ ہوگا، انسانی ترقی کے پروگرام ہوں گے، شراکت کے مواقع زیادہ ہوتے جائیں گے۔ امن ہوگا تو انسان وسعت قلبی پائے گا، بالغ نظری حاصل کرے گا، روحانی طور پر زیادہ امیر ہوگا، زیادہ روحانی سخی ہوگا اور زیادہ انسان ہوگا۔ امن انقلابی ہے کہ اس پر تبدیلی کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ امن تخلیقی توانائیوں کو آزاد کرتا ہے، امن اظہارِ رائے محسوس کرنے اور ڈھل جانے کو آزاد کرتا ہے۔ خوف کی حالت کے خلاف سخت لڑائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

گناہ گار ہیں، دنیا سنوار دے یارب
وطن میں بار ہا میں نے سنا ہے یہ جملہ
نہ جانے عہد ہے؟ یا حکم؟ یا کوئی
جملہ، ہر اک لفظ جس کا سحر زدہ
بدی کے ہاتھوں اجاڑے ہوئے جہاں کے لیے
ہم ایک جنگ شروع کر رہے ہیں، پھر یارو!
زبان کھولو! کوئی عہد، کوئی حکم، دعا کوئی
جو اس جہاں کو بچالے، بس ایسی بات کہو

رسول حمزہ توف

اور شاعری تو امن کا فعل ہے۔ چلو ہم دور لاطینی امریکہ سے گواہی لاتے ہیں، معتبر گواہی.....نرودا کی گواہی:

''امن شاعر کی تکمیل میں ایسے ہی معاون ثابت ہوتا ہے جیسے روٹی کے بننے میں آٹا۔''(3)

******

مست کے زمان کا مکان بلوچستان، ماقبل فیوڈل معاشرہ تھا۔ ایسے معاشروں میں محبت قابلِ جرم عمل تصور ہوتا ہے۔ ایسی حرکت پر ڈنڈا، پتھر، اور تلوار جیسے آلات ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ایک ایسی موت جس کا نام نہ ہو، جس کا خون بہا نہ ہو، جس کا انتقام نہ ہو اور جس میں ثواب کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔ حرام موت..... بے موت موت.....شرمندگی کی موت۔

توکلی نے اسی سخت ماحول میں محبت کی۔ اور وہ بھی ایک دوشیزہ سے نہیں بلکہ کسی کی بیوی سے محبت کی۔ جی ہاں، شادی شدہ عورت سے..... اور پھر اس کا اظہار اعلانیہ کیا، شعر کہہ کر، محفلوں اجتماعوں میں باتیں کر کے، موسیقی کی محفلیں بپا کر کے، ان میں گا گا کر اور مال مویشی خیرات

کر کر کے۔ کتنی بڑی جرأت چاہیے ہوتی ہوگی اُس بلوچستان میں اِس عمل کے لیے!۔

اُس کے ردِعمل میں پیش آنے والی مصیبتوں اور تکالیف کا اندازہ کرنے کے لیے کتنے گیگا بائٹ کا کمپیوٹر چاہیے ہوگا اور کتنا بڑا سینہ چاہیے ہوگا انہیں سہنے برداشت کرنے کے لیے؟۔ مگر باغی تو پھر باغی ہوتا ہے، اُسے ''پرومیتھی اَس'' کہیں یا ''مستیں توکلی''، دیوتا گیری کے کام عام آدمی تو نہیں کر سکتا!!۔ سو مست نے محبت سوچا، محبت کہا، اور محبت کی۔ اور یہ تینوں کام مروجہ سماجی نظام پہ عظیم الجثہ آہنی ہتھوڑے تھے۔ اور مست جتنا بڑا آہن گر کون تھا بلوچستان میں!!..... مارتا گیا .....زور سے اور تیزی سے۔

مست اُتنا ہی بڑا باغی تھا جتنا بڑا وہ عاشق تھا۔ وہ صرف اور صرف ممنوعہ کام یعنی، محبت کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اور صرف بغاوت کرتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ بغاوت کے بغیر محبت، اور محبت کے بغیر بغاوت ناقابلِ تصور اعمال ہیں۔ چنانچہ توکلی نے بلوچوں کے سارے رسوم و رواج کی جڑ یعنی عورت مرد کے درمیان محبت کے کالعدم شدہ رواج کی دھجیاں بکھیر کر اسے سمّو کے پاؤں کی خاک بنا ڈالا۔ صدیوں سے جاری فیوڈل رسم و رواج کی پرواہ نہ کرنے والا محبّ بھلا دوسرے چھوٹے رواجوں کی کیا پرواہ کرے گا۔ یا بحیثیت مجموعی رسم کے ''والی'' کی کیا سُنے گا، رواج کے رکھوالے کی کب مانے گا!۔ سماج کے ایک جزو کا کفر پورے سماج کا کفر ہوتا ہے۔ چنانچہ مست پورے بلوچ معاشرے کے ویلیو سسٹم کا کافر بنا اور پھر اِس کفر کے، اپنے اِس لشکر میں سارے بلوچوں کو شامل کر لیا.....قیصرانڑیوں لیغاریوں کو، بزداروں کھیترانڑوں کو، بگٹیوں گشکوریوں کو، مریوں مزاریوں کو..... سب کو۔ سب اُس رواج شکن کے گن گانے لگے۔ سب، اُس کی خواہش کے مطابق ایک شادی شدہ خاتون کی مست کے ساتھ بار بار شادیاں کروانے لگے، سب اپنے کندھوں پر اپنے ریوڑ کے سب سے اچھے دنبے اُٹھائے اِن اَن گنت شادیوں میں ''بجار'' دیتے رہے اور مست کی دعوتیں کرتے دعائیں لیتے رہے۔ اُس کی شاعری سے محظوظ ہوتے رہے۔ (میرے پاس میرا سب سے پیارا، موٹا تازہ اور خوب صورت ترین دنبہ میری تحریر ہے۔ سو وہ نذر رہے میرے اِس بڑے مرشد کی .....ایک فرق دوسرا ہے لوگوں کے قربانی

کے دنبے اور میرے والے میں؛ میں نے مست کی کرامات کی جگہ اس کی عالم گیر تعلیمات کے لیے اپنا بہت پیارا اور راتوں کو جاگ جاگ کر موٹا بنایا یہ دنبہ دیا ہے!!)۔

مگر انقلاب مستی کا نتیجہ نہیں، مجبوری کا انجام ہوتا ہے۔ انقلابِ مست کا راہنما محبت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اُس نے ایسا کرنا ہی تھا۔

مگر اِس عظیم لشکر کا راہنما محض محبت کے ہاتھوں مجبور نہ تھا، وہ تو معاشی اور سماجی لحاظ سے بھی بہت بے کس تھا، یتیم تھا، مفلس تھا، ناخواندہ تھا۔ بے ترتیب اور تنہا نہتا یہ فرد محبت کو آزاد کرنے کا سپارٹیکس بنا۔ اور اس کے مقابل تھا رواج، رسم، قبائلیت، سرداریت اور فیوڈل ازم۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ''سمو'' کا آفاقی، اور مختصر ترین نعرہ لے کر لولاک کی سچائیاں اُس میں لپیٹے منفی سماج کی عملی نفی کرتا جاتا ہے۔ نفی نفی سے ٹکرا جاتی ہے۔ اثبات ہی جدلیاتی نتیجہ ہے۔ خواہ نظر آئے یا نہ آئے، خواہ دیر نکل آئے یا سویر، خواہ اس کی شکل کیفیتی ہو یا کمیتی۔ مست نفی کر جاتا ہے ان منفی قوتوں کی جن کے دلوں کے دروازوں پہ سٹیٹس کو کے زنگ آلود قرنوں پرانے بڑے بڑے تالے پڑے ہیں.....وہ بھڑ جاتا ہے اُس سماج سے جو خود کو برقرار رکھنے کے لیے سارا وقت خانہ جنگی کرواتا رہتا ہے۔ مست معاشی نہیں کلچرل ریولیوشن سے ابتدا کرتا ہے۔ وہ اس بڑے اور عمیق تالاب کے پانی میں دیوہیکل Spalashes پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو صدیوں سے ٹھہرا رہنے کی وجہ سے متعفن ہو چکا تھا۔ محبت، جتنی بے انت بے کراں ہوتی ہے اُتنی ہی اس کی اصلاحات گہری اور بے حساب ہوتی ہیں۔ ڈوبتا ہی چلا گیا انقلابی، غرقاب ہوتا گیا انقلابی۔

ایک عام سے چرواہے (حالانکہ چرواہا عام سا کہاں ہوتا ہے) کی عام سی محبت (حالاں کہ محبت عام سی کہاں ہوتی ہے) اپنے دائروں کو وسیع کرتی چلی گئی اور کل عالم، کل کائنات کو اپنی مہک کی لپیٹ میں لیتی رہی۔ جنگ گریزی کی بزدلی امن پسندی کی شجاعت کے پرچم میں ڈھلتی جاتی ہے، خود پرستی انسان دوستی کی وسعت کو جگہ دیتی ہے ''سید سدنے والوں کے لیے دوزخ ملن سزائیاں'' اور سمو آکھنے والوں کے لیے ''بہشتی پینگاں پائیاں'' کے نعرے تتڑا کے پہاڑوں سے نکل کر چار چودھار کا مقبول نعرہ بن جاتے ہیں۔ مست بیک وقت ثقافتی (لہٰذا سیاسی) جنگ کے

مزے لوٹ رہا تھا اور بیک وقت دوزخ کے جلا ڈالنے والے عذاب سے گزر رہا تھا۔ وہ مسرت کے جام بھی لنڈھا رہا تھا اور بیک وقت درد کے لامحدود سمندر میں بھی ڈوب رہا تھا۔ مست حافظ بنا، رومی بنا، فرانسس بنا، مزدک بنا اور ان سب ہم جولیوں کی طرح یسوع کی بھیڑوں کا چرواہا رکھوالا بنا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا ہوتا اگر یسوع، لطیف، چے، کاڈویل، اور مست محبت ہی سے بغاوت کر جاتے؟۔

زندگی میں کتنی بار اُن کے ہاتھ انھیں بے کار لگے ہوں گے، لب بے مصرف لگے ہوں گے، اور ان کے دل ہلکان رہے ہوں گے۔ کتنی بار انہیں اپنی سانسیں بے فائدہ لگی ہوں گی۔ کتنی بار وہ گہرا روئے ہوں گے، اداس، شکستہ، خالی..... جلتے روح و دل کے ساتھ فیوڈل رواجوں کو کراہتے ہوئے خود کو بے کار، بے وجود، ناکام تصور کرتے ہوں گے۔ کتنی بار وہ خود پہ تلخ ہوئے ہوں گے، اپنی بے بسی پہ ہونٹ کاٹے ہوں گے، وہ اپنی عمر، اپنے پنجرے، اپنے غصے اور اپنی دانشوری کو بدعائیں دیتے ہوں گے۔ نابودی کے احساس میں ڈپریس، خود کو لاتعلق، مسترد کردہ سوچتے ہوں گے۔ اگر وہ ان تمام کیفیات کے سرچشمے محبت ہی سے بغاوت کرتے تو؟

مگر پھر خیال آتا ہے کہ اوہ نہیں۔ بزدلی، پس ماندگی، بھگوڑا گیری، بے نامی، گم نامی کے لیے ایک دنیا پڑی ہے۔ اُن کی ان جانکاہ کیفیات میں کڑھائی ہونے ہی نے تو دنیا کو رہنے کی جگہ اور اعتبار کا مقام بنا دیا۔

بلاشبہ انیسویں صدی کے بلوچ قبائلی معاشرے میں، اس عظیم انسان کا پیدا ہونا ہی ایک غیر معمولی بات تھی۔ مست نے نہ صرف بلوچستان کے مستقبل کے عمیق ترین جذبات اور اس کی روح کے مظاہر کی عکاسی کی بلکہ وہ اس کے مقدر کا نقیب بھی بننے میں کامیاب ہوا۔ مست عشق پہ اپنی کمٹمنٹ میں بڑ نامی درخت کی جڑوں کی طرح محبوبہ کی طرف پیوست، مرکوز اور وابستہ رہا۔ ایک سمو کو دیکھا دل ہار گیا، کروڑوں سمووں کی حالتِ زار دیکھی دنیا ہار گیا.....دنیا کو جیسے صرف اور صرف سمو کے لیے بننا تھا۔ گھاس سمو کے مویشی کی، درخت سمو کے لیے سایہ، پہاڑ سمو کے جیذ، بارش سمو کی پیام بر، ریل گاڑی سمو کی باربردار گدھی، حضرت خواجہ سلیمان سمو کا منشی.....سمو ایک شخصیت

سے، ایک جسم سے اور ایک وجود سے حسن اور سچائی کے مظاہر اور علامتوں میں ڈھلتی گئی۔ مست کے ہر فقرے میں سمو کی فاقہ کشی کے نوحے ہیں، ہر مصرعے میں اس کے روز و شب کو بدلنے کی آرزوئیں ہیں، ہر ارمان سمو کی بہبود ہے' ہر شیئر سمو کی چمکتی دمکتی شفاف انسانی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے، اُسے وسعت بخشتا ہے۔ سمو ہی اول سمو ہی آخر.....انسان ہی اول انسان ہی آخر۔ مست انسانیت کی مریدی کی وسعتوں میں کہاں سے کہاں پہنچا!۔

سمو حسن تھی، مہر کا سرچشمہ تھی۔ اس سے زیادہ معتبر، اس سے زیادہ باکرامت، اس سے زیادہ حسین، خوش گفتار، سبک اندام اور برگزیدہ شخصیت تو کوئی اور نہ تھی۔ مست اسی سمو کا مرہونِ منت تو ہے۔ مست کی محبت، بزرگی، درویشی، شان، شاعری سمو ہی کی بدولت۔ اُس کی سماجی کارروائی کی متحرک اور محرک سمو، اس کی لعل و گہر جڑی آفاقی شاعری کا سبب سمو، مواد سمو، قافیہ وہی، ردیف وہی، بحر سمو، ایندھن سمو۔ سمو ہی اس کے فکر کا جواز بنی۔ وہی اس کے فہم اور ادراک کی تمام قوتوں کا Tonic تھی۔ وہی کمانڈر تھی مست کی ساری صلاحیتوں کی.....اس لیے کہ مست محبت میں مکمل ہتھیار ڈال چکا تھا۔

مگر سمو محض ایک جسم، ایک ذات، ایک شخص نہ تھی۔ وہ تو عورت تھی، عورتوں میں سے تھی۔ اور جس سماج میں پیداواری رشتے واضح نہ ہوں، جہاں استحصال کی صورتیں شکلیں ابھی دھند سے نہ نکلی ہوں، جہاں قدیم کمیونزم سے جڑا ہوا قبائلی نظام مکمل جاگیرداری میں نہ ڈھلا ہو وہاں عورت تو صنف کے بطور، انقلاب کا موضوع بھی بن سکتی ہے، انقلاب کا ہراول بھی، اور انقلاب کی قائد بھی۔ یہی تو وہ نقطہ ہے جسے اکیسویں صدی کے، کالموں کے کالم بھرنے والے بورژوا دانش ور آج تک سمجھ نہ پائے۔ جس سماج میں مزدور بطور طبقہ Assert نہ کرتا ہو، جہاں چرواہا بطور طبقہ مجتمع نہ ہوسکتا ہو۔ وہاں عورت بطور طبقہ بورژوا دانش وروں کی پھیلائی گم راہی یعنی ''ایک غیر کمیونسٹ سماج'' کو طبقاتی سماج جتانے کا کام دے سکتی ہے۔ استحصال کی بدترین قسموں کا شکار یہ طبقہ تضاد بھرے سماج میں سب سے بڑے تضاد کا موجب بنتا ہے۔ ان تضادات سے کھیلا جاسکتا ہے۔ یہی تضادات دیگر طبقاتی تضادات کی وضاحت بھی کر سکتے ہیں اور انہیں ابھار بھی سکتے

ہیں۔ مست نے اصل میں، ایک غیر محسوس انداز میں، اسی تضاد کو اپنے فکر کا ستون بنایا۔ اور عورتوں کے طبقے کو ''سموراج'' کا نام دے کر اپنی بساط اور معروض کے مطابق سماج کے تضادات کو اُبھارا۔ وہ سموراج کا ٹریڈ یونینسٹ ہی نہیں اُس کا نظریہ دان بھی بنا۔ سمو کے نام اور شخصیت کی آڑ میں وہ عورتوں کے مقام اور حقوق کی بات کرتا ہے۔ مروج کو مسترد کرتا ہے۔ اور مستقبل کے معاشرے کی بات بتاتا ہے۔.....شاہ لطیف یہی کچھ کر رہا تھا دُور میدانی علاقے میں۔

میر گل خان نصیر مست توکلی کی روشن فکری کو یوں تسلیم کرتا ہے:

''جب وہ سوچتا ہے کہ اس کی محبوبہ دن کو بھیڑ بکریاں چراتی اور ایک عام خانہ بدوش عورت کی طرح گھر کے دوسرے تمام مشقت بھرا کام کاج کرتی ہے تو اُسے دکھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو آرام و آسائش کی اُن تمام نعمتوں سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے جو اُس وقت اُس کے تصور میں آسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ترقی پسند ہے''۔(4)

ہم اس کتاب کے اولین صفحوں میں ذکر کر چکے ہیں کہ مست نے اپنی محبوبہ اور اس کے توسط سے بلوچ عورت کی زندگانی کی مشکلات کو دیکھا ہے۔ اسی سلسلہ میں دیکھیے' کہتا ہے۔

دوست منی بیواکاں کثہ وانڈھو گوں بزاں
پاذ شفاذیا کوہ بن و کوڑان و گراں

ترجمہ:

غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں نے میری محبوبہ کو بکریوں کے ساتھ گھر سے بہت
دور چراگاہ (کاشر) روانہ کیا ہے
وہ ننگے پیر ہے اور چٹانوں، پہاڑوں اور میدانوں میں چلنے پہ مجبور

ہم اس سلسلہ کو مزید طول نہیں دیتے کہ بار بار دہرانے سے لفظ کا تقدس مجروح ہو جائے گا۔ ہم بس مست کی زبانی بلوچ عورت کی موجودہ حالت کا اس کے محض ایک مصرعے کے ذریعے ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سمو کی زبانی اس ایک مصرعے سے زیادہ جامع بات کوئی بلوچ کر ہی نہیں سکتا۔ آپ عورتوں کی حالت پہ پوری کتاب لکھئے، میں مست کا یہی ایک مصرع لاتا ہوں۔ مجھے

یقین ہے کہ آپ بڑے دل گردے کا مظاہرہ کرتے ہوئے سپورٹس مین شپ میں اپنی پوری کتاب لپیٹ کر اس ایک مصرعے کی نذر کر دیں گے۔

استیں زالے آں ہچ ہورّا پیلہ نیاں

(عورت ہوں، اس لیے اپنے کسی قول کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہنے دی گئی ہوں)

عورت کی پست حالی کے اس پورے پس منظر میں مست ایک دوسرے مصرعے میں نجاتِ نسواں کی عظیم ترین خواہش رکھتا ہے۔

بُتکہ ژہ سمو آسنیں واڑا

(رہا ہوگئی سمّو آہنی دروازے والے قید خانے سے)

''آہنی پنجرہ''..... ہے نہ فلسفے کی اصطلاح۔ مکمل بلوچی اصطلاح، میڈ اِن بلوچستان۔ مارکس سے سات سمندر پار۔ ہم اقوامِ عالم سے حسین ترین نظریات کی تشکیل میں بلوچ اور بلوچستان کا حصہ تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

تو کلی مست سمو کے بارے میں کیسی زندگی کی خواہش رکھتا ہے، آیئے دیکھتے ہیں:

سمو مں دوشی دیشہ گوں وھاو و شاذہاں
سیر سالو کی کرّہ کنت بے دوشیں گذاں
بریخہ کاں چماں گوں ہزار لَونیں سیر مغاں

ترجمہ:

میں نے رات سمو کو خواب میں دیکھا
وہ بہت خوش شاداں تھی
دلہن بنی ہوئی تھی اور اس نے بہت اچھے کپڑے پہن رکھے تھے
اس کی آنکھیں بہترین کاجل سے چمکتی تھیں

مست اپنی سمو کی موجودہ حالت کی ابتری کے خلاف اور اس کے لئے ایک اچھی روشن زندگی کی تجویز درج ذیل طویل شَیر میں دیتا ہے۔ جس میں وہ اس کی زندگی میں ایک تبدیلی لانے کی بات کرتا ہے اور اسے اُن تمام نعمتوں سے فیض یاب کرانا چاہتا ہے جو اُس زمانے کے معروض میں موجود ہو سکتی تھیں:

زیانہو پروئی آں بغائیناں
ہوندہ حیران و دَور حرامینیاں
رہ گزاں سمو گوئستہ پہ ریما
دوست منی روث مں پنگھرے دیما
لہر منی جانا ریز گرنت ماری
موژ ہ کنت روح دِل ہزارواری
شاہری نوخیں قصوے کاری
شوانزانیں مَنیں کیغذہ ڈولا
دوست منی بازیں خذمتاں لوٹی
چیٹہ لوٹی چوتنگویں بچی
سانبہ لوٹی چو شِیر دفیں بہاناں
سانبہ لوٹیث و سانبغے جواناں
جواں نہ ایں سمو گوں بُزگلی مڑداں
بیثیں گوں دُر گوشیں مہیری آں
لڑزثیں استارا سہیل ایغا
ٹِلّثیں دوست مں گزدریں بیٹاں

مں ہواں درنگانی بزیں سایاں
دنزکثیں تیرغ چڑتغیں بوراں
ھِنڑ کثیں شیر واریں لکوری آں
درنزثیں زڑدوآں سہا گیناں
بیگھاں ترہ پولی کثیں ھرّاں
شَیر جثیں ماخ و ہاکثیں ملخاں
ہاکثیں ملخانہ سمینیغاں
بیگھاں اِستیں کہ مژاں بنداں
بانگھاں عرشی کو کرے گرنداں
گِندغا کڑزنت جو عجب رنگاں
کرموئے تنکا گوئڑ توہ گواراں
گوارنت او ہمبوئیں سلام باراں
پاذہ کیث دُردانغ املّانی
روث گوئرسرگواثاں سمین ایغاں
زیارتہ کنت گوں لیلویں دستاں
پیالوے نوش کاں کاغذیں رکاں
یکے پہ واسطا یا خذائیا
یکے پہ نیتا گنوخ ایغا
بیایاں مئیں تُتّی ایں دلا پُجاں

ترجمہ:

حیف ہے تم پہ سست پروئی قبیلے والو
تمہاری سٹی گم ہے اور تمہاری ساری امارت حرام ہے
سمو خشک گھاس کاٹنے، راستے سے گزری
میری محبوبہ دشوار گزار بلند چٹان پہ چڑھتی ہے
درد کی موجیں میرے جسم پہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہیں
میری روح ہزار ہزار بار تہہ و بالا ہوتی ہے
اور ایک نیا شاعرانہ تصور لاتی ہے
لوگو، تمہیں میری محبوبہ کا پتہ نہیں ہے
میری دوست کی بہت خدمت کرنا پڑتی ہے
ایسی دیکھ بھال جیسا کہ بیٹوں کی جاتی ہے
ایسی دیکھ بھال جیسی کہ گھوڑی کے شیر خوار بچوں کی، کی جاتی ہے
دیکھ بھال مانگتی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنا اچھا بھی ہے
سمو بکریوں کے ریوڑ چرانے کے لیے تو نہیں بنی
اسے تو بالیاں پہنے مہیریوں میں سے ہونا چاہیے تھا
جہاں سھیل کا ستارہ ٹمٹماتا رہتا
وہ نہر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں اِٹھلاتی پھرتی
بلند پہاڑوں کی گہری ٹھنڈی چھاؤں میں ہوتی
اناج کھائے اس کے گھوڑے چوکڑیاں بھر کر گرد و غبار پیدا کرتے
گھوڑیوں کے شیر خوار بچوں کی ہنہناہٹ ہوتی

سہاگن اونٹنیاں بدک بدک جاتیں
شام کے وقت شتر بچے کھیل کود میں زمین ہلا ڈالتے
ہم اپنی شاعری گاتے اور فرشتے آمین کہتے
آمین کہتے بادِ سحری کے فرشتے
شاموں کو دھند کے عقب سے بادل اُٹھتے
صبحوں کو عرش کے بادل گرج اُٹھتے
یہ عجب رنگ ہوتے، قابل دید ہوتے
کرمو کے درّے میں تمہاری پاس برستے
برستے اور تم تک ہمارے پُر مہر سلام پہنچاتے
اُٹھتی ہے میری دُردانہ
جاتی ہے بادِ سحری کے پاس
وہ اپنے دلربا ہاتھوں سے ان کی زیارت کرتی ہے
اپنے نازک ہونٹوں سے جام نوش کرتی ہے
ایک پیالہ خدا کے واسطے
ایک مجھ دیوانے کے نام پہ
تا کہ وہ جام میرے پیاسے دل تک پہنچیں

مست تو اپنی سمو کو یہ سب کچھ نہ دے سکا۔ ہماری نسل بھی وہ سماج قائم نہ کر سکی جہاں آج کی سموئیں اپنے عہد کی ساری نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ مگر اس فلاسفر کا دیکھا خواب ضرور تکمیل پائے گا۔ جب بادل، بادِ نسیم، شتر بچے، گھوڑے، اونٹنیاں، اشجار، سایہ دار چٹانیں، جام، شاعر کے گیت اور فرشتے سب ایک ساتھ ایک ہی سُر میں، ایک ہی لے میں آفاقی Harmony قائم

کرلیں، اور سب کے سب سمو کی خدمت کریں، عورت کی بھلائی کریں اور انسان کی دیکھ بھال کریں۔

توکلی مست اپنی محبوبہ کے حوالے سے عورت کی پوری زندگانی، اُس زندگانی کے حالات اور شرائط کو یک دم بدل کر انسانی بنانا چاہتا تھا، اس کی ساری بنیادی ضرورتیں پوری کرنے والا ایک نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔

قادرئے کُنڈھی شلوخیں
سملئے بیلی گنوخیں
(سمو) گونین گوں مستہ چَڑی آں
سمو گٹ گوں بِر گڑی آں
سمو پونز گوں پُلڑی آں
سمو سر گوں چُنڑی آں
سمو پاذ گوں جُتڑی آں
سملئے دوست گوں مری آں
سملئے لوغ گوں کڑی آں
سمو کایئے تہ برانے
بچی دُرانہ دیانے
سمو پہ حجا روغیں
سنگتی مستا برغیں

ترجمہ:

قادر کھیتر انڑ کی کنڈھی نامی گھوڑی سبک رفتار ہے
سمو کا محبوب دیوانہ ہے
سمو مست کے پیار میں مدہوش ہے
سمو کے گلے میں برگڑی نامی زیور ہے
سمو کی ناک میں پلّی نامی زیور ہے
سمو کے سر پہ چنزی ہے
سمو کے پیروں میں جوتیاں ہیں
سمو کا محبوب مری عوام کے ساتھ ہے
سمو کا گھر اور لوگوں کے گھروں کے ساتھ ہے
سمو! اگر چلو تو تمہیں ساتھ لے جاؤں
(تمھیں) لڑکوں جیسے سونے کی بالیاں پہناؤں
سمو تو حج کرنے جا رہی ہے
اور ساتھ لے جا رہی ہے مست کو

اور مست نے صرف یہ فلسفہ سوچا ہی نہیں، وہ اس کے عملی جامہ پہنانے کے لیے زندگی بھر کام بھی کرتا رہا، اپنے سٹائل میں، اپنے معروض کے مطابق۔ اور چونکہ محبت کے راستے کی وسعت اور روانی و ہمواری مطلوب تھی لہٰذا محبت ہی کے عطا کردہ توانائی کے طفیل وہ یہ کام کرتا رہا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ محبت تو ''اُن کچھ چیزوں میں سے ہے جن کی خاطر دمِ آخر تک لڑتے رہنا چاہیے''۔(5)

حوالہ جات

1۔ گچکی، یوسف ''مست توکلی'' ماہنامہ آساپ کوئٹہ، جنوری 1993ء
2۔ مری، مٹھا خان ''سمو بیلی مست'' بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 1991ء صفحہ 111
3- پبلو نرودا ''یاداشتیں''، صفحہ 153
4۔ نصیر، گل خان، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، 1976۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ 314
5۔ پائلو کوئہلو ۔ By The River Piedra We Sat Down And Wept.....صفحہ نمبر 49

رستانی کانفرنس

آپ جوں جوں سماجی سائنس کی گہرائیوں میں اترتے جاتے ہیں، آپ کا سماجی ذمہ داری کا احساس بڑھتا جائے گا۔ چنانچہ مست توکلی اب ایک غیر روایتی بلوچ بنتا جارہا تھا۔ جسمانی اور نفسیاتی دونوں صورتوں میں مونچھوں کا تاؤ، گردن کی اکڑ، پیشانی کے بل، جاہ و جلال کے لوازمات، شہرت ونمود کے سامان اور مال ومتاع سب کچھ اُسے ہیچ اور پست لگنے لگے۔ اب اس کے لیے دنیا بھر کا مقدس ترین لفظ تھا: سمو..... اُسی کے نام کا ورد کرنا، اُسی کے تذکرے جپنا، اسی کے نام کی نیازیں بانٹنا اور اُسی سے مانگنا، چاہنا، گڑ گڑانا، روٹھنا منانا۔ باتوں میں تسلسل نہیں، سوچوں میں یکسوئی نہیں، معمولات میں قرار نہیں..... توکلی ایک بہکا بہکا، بکھرا بکھرا، مست مست سا شخص بنتا جارہا تھا۔ بلھے شاہ کے بقول:

جس تن لگیا عشق کمال، ناچے بے سُر تے بے تال

''جسے محبت لگے تو وہ بے سُر اور بے تال ناچتا ہے اور کمال کا ناچ ناچتا ہے''

محمد خان پیر داذانڑیں اور حاجی بختیار خان سومرانڑیں نے مجھے بتایا تھا کہ مست کے لنگوٹیے بہار خان سے اس کی یہ بے سُر بے تال رقصاں حالت دیکھی نہ گئی۔ اُس کے اِس دوست، ہم جولی اور ہم نوا کو اپنے توکلی کی تکلیف بے کل کرتی جاتی تھی۔ پس وہ علاقے کے بڑے یعنی شادی ہان کے پاس چلا گیا اور اس سے توکلی کی یہ حالت بیان کر کے مدد چاہی۔ شادی ہان جو علاقے کا سفید ریش تھا، سربراہ تھا، معتبر اور باور والا وڈیرہ تھا، اس نے ایک بزرگ کی حیثیت سے سمو کو قاصد

بھجوادیا کہ ''مائی (خاتون)! میرا تم سے قرآن ہے، بدی اور بدکاری کی کوئی بات نہ ہوگی۔ بس تم اسے ذرا سا دیدار کرادو۔ یہ کہتا رہتا ہے کہ میں عاشق ہوگیا ہوں، درویش، بزرگ، ولی ہوگیا ہوں۔ تم آنا شاید یہ ٹھیک ہوجائے''۔

اُس وقت کا انسان اپنی زبان کے بھرم کا بہت خیال کرتا تھا۔ انسان کو دوسرے انسان پہ اعتماد زیادہ ہوا کرتا تھا۔ مردوں اور عورتوں دونوں میں ایک شان ہوا کرتی تھی۔ اور پھر شادی ہان تو بڑی شان والا تھا تھا، بہت باوقار، عزتوں کا رکھوالا۔ اپنے لوگوں کا خیر خواہ، ان کے غم خوشی کا خیال رکھنے والا۔

پُر اعتماد سمو نے بزرگ وسفید ریش کی بات کو عزت دی اور ملاقات کا دن طے ہوا۔ تب بہار خان نے مست سے کہا، ''آؤ تمھیں سمو سے ملوادوں''۔ دونوں دوست مسافت طے کر کے ماوند سے سمو کے علاقے رستانی گئے۔ اور ایک ٹیکری پہ واقع سمو کے خیمے سے اترائی میں ذرا دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔ نظریں ٹیکری پہ موجود خیمے پہ مرکوز، ہپناٹائزڈ..... جونھی سرزمینِ محبت کی شہزادی اپنے خیمے سے روانہ ہوئی اور مست و بہار خان سے محض تیر کش کے فاصلے تک پہنچ گئی تو یہاں مست بے ہوش ہوگیا۔ خاتون قریب آئی، اُسے بے ہوش دیکھا تو اس کا نام لے کر پکارا، ''توکلی..... توکلی''۔ مگر کوئی سُدھ، کوئی افاقہ نہیں۔ وہ یونہی بے سُدھ نیلا پڑا ہوا تھا۔ منہ پہ جھاگ۔ کوئی ہوش کوئی سُوجھ نہیں۔ محبت کی دیوی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا، ''نذغ'' و ''مزن سر'' و ''گُن'' کی خوشبودار جھاڑیوں سے معطر ہاتھوں نے اس کی آنکھوں، بالوں اور چہرے کو سہلایا، فائدہ کچھ نہیں، افاقہ کچھ نہیں۔ مہذب انسان کچھ دیر بیٹھی رہی۔ حسن خود عشق بیماری کے تھپیڑے کا شکار تھا، وہ کسی کی تقدیر کیا بدل پاتا۔ پیار کی ملائم طاقت کے سامنے صرف درندے شکست نہیں کھاتے، سمو تو اشرف المخلوقات کی بھی اشرف رکن تھی۔ اس نے سر کو خم دے کر پیار کے دیوتا کی کمٹ منٹ کے چرن چھوئے اور بہار خان سے کہا ''ابا (بھائی، بیٹا) یہ اب کسی کام کا نہ رہا''۔

واہ واہ۔ یہ فقرہ تو گویا قبیلہِ عاشقاں میں قبولیت کی سند ہے۔ میری عمر کے کتنے سارے

لوگ واپس جوان ہونا چاہتے ہوں گے، اور اسی فقرے کا تمغہ اپنے سینے پر لگانا چاہتے ہوں گے۔ مگر ہر سینے کی قسمت میں ایسی نعمت کہاں!

Saint سمو نے توکلی کی Saint hood کی تصدیق کر دی۔

''مائی، تمہیں اجازت ہے''۔

جواب تھا بہار خان کا۔ آسمان کا چہرہ پڑھ لینے والے ہی تو بہار خان کہلواتے ہیں کہ مست کا ساتھ کسی ڈفر، کسی غبی کو کیا نصیب ہوگا؟۔

کوہِ سلیمان کی لیلیٰ چلی گئی اور جونھی وہ اپنے مہذب خیمے میں داخل ہوئی تو اِدھر مست کو ہوش آ گیا۔

بہار خان نے پوچھا: ''توکلی کیا ہو گیا تھا؟.....سمو، سمو پکارتے تھے۔ سمو آئی تو بے ہوش ہو گئے۔ وہ بیٹھ بیٹھ کر بالآخر چلی گئی''۔

کہا: ''بہار خان! عشق گدھا گدھی والی جنسی بات نہیں ہے۔ دوست تھی، آنکھیں ملیں ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے دیکھا میں نے اُسے دیکھا، بس ہو گیا وصل''۔(1)

تب رستانی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر اُڑتی بدلی نے، پرپغ کے پھول پہ بیٹھی تتلی نے، بارش کے پُرخ نامی ننھے قطرے نے، افق سے اُفق تک کھچی قوس قزح کی لکیر نے، بلوچ کی غربت کی علامت واحد بھیڑ کے گلے میں بندھی گھنٹی نے، اور رستانی کی بے کراں خاموشی نے بہار خان کے کان میں اذان دی: ''مست ولی ہے.....مست درویش ہے.....مست فلسفی ہے.....مست عاشق ہے''۔

ایک جھلک دیکھی کشتی ڈبو بیٹھا، خیمے کا ہیولا دیکھا تو منزل پا گیا۔ اتنی مختصر گھڑی میں اور اس قدر آٹو میٹک انداز میں خاکی توکلی کو آفاقی مست بنا دیا گیا۔ کدھر ہے ریاضت، کہاں ہے میرٹ؟۔ ارے بابا عشق کے دربار میں اپوائنٹ منٹ آرڈرز، انٹرویو سے صدیوں پہلے ہی ٹائپ ہو چکے ہوتے ہیں۔ معروض و موضوع راہبر کے منظر عام پہ آنے سے بہت پہلے کمیتی کاروائی جاری رکھے ہوتے ہیں۔

مہر یونیورسٹی کے اس پُر وقار کانوکیشن کے بعد مست اور بہار خان وہاں سے لوٹ آئے۔ بہار خان کی ڈیوٹی گم نامی کی لگی اور مست دائمی پائیداری اور کائنات کی ابدی شہریت کا ''کارڈ ہولڈر'' بنا۔ دونوں مہر کے ہاتھوں سے ودیعت کردہ اپنی اپنی ڈیوٹی میں جُت گئے۔ مست ایسے کام میں لگ گیا جہاں قرار اور آرام کا گزر نہیں ہوتا۔ اپنے مشن میں ایسے منہمک کہ آج، موت کے دو سو سال بعد بھی اپنی پارٹی کی ممبر شپ مہم میں مگن ہے۔ میں اور اے میرے قاری آپ، اُس کی پارٹی کے latest ممبرز بنے ہیں!!۔ مبارک ہو۔

مست نے سمو سے محض ایک جھلک لی اور اسے اس قدر Enrich کیا کہ اس روشنی سے دو صدیوں سے دنیا فیض لے رہی ہے، مگر آج تک اس میں کوئی بریک ڈاؤن کوئی لوڈ شیڈنگ نہ ہوئی۔ اِس کا کوئی کھمبا نہ گرایا جا سکا۔ محبت کی کرامت ملنا تو چُنے ہوئے لوگوں کا حصہ ہے ہی مگر اسے تسلسل سے نبھانا بھی صرف مقدر والوں کی میراث ہوتی ہے۔ اور بلوچ توشہ مرید سے مست توکلی تک اِسی مہر کی زندگی میں زندہ رہے ہیں۔ یہی ہے بلوچستان۔ یہی ہے بلوچ آئیڈیل معاشرہ۔ ہم اسی میں جیے ہیں ہم حتماً اسی میں جئیں گے۔ سرمایہ کے عبوری دبیز پردے کو پیوند لگتے لگتے معدوم ہو ہی جانا ہے۔ ہم اُسی معاشرے کو قائم کر کے رہیں گے، جب شادیھان قول دیتا ہے کہ ''کوئی بدی برائی نہیں ہوگی، آدمی پاگل ہے سمو، تم اس سے ملو گی تو ممکن ہے ٹھیک ہو جائے''۔ تو سمو باور کر لے چل کر آئے سر گود میں لے لے۔ یہی تو وہ بات تھی جو وکٹر ہیوگو نے اپنی 'لامزریبل' میں لکھی تھی کہ، ''پہاڑوں میں ایک عجز بھرا کمیون موجود ہے''۔ مست کے جنون کے صدقے، بہار خان کے قول کے صدقے، سمو کے یقین کے صدقے، بلوچ کے کمیون کے صدقے، بلوچ کمیون ازم کے صدقے۔

ایک بات بار بار دہرانی ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ مست اور سمو کی یہ محبت خلا میں نہیں زمین پہ وقوع پذیر ہوئی کہ زمین خلا سے پاک تر ہے۔ اور یہ محبت زمان کی چوکھاٹ ہی میں رونما ہو کر پروان چڑھی تھی کہ انسانی واقعات وقت کے تانے بانے ہی میں سرزد ہوتے ہیں۔ زمین کے جس قطعے پر مستیں توکلی امر ہو گیا وہ مشرقی بلوچستان کہلاتا تھا، جہاں زمان نے خود پہ انیسویں صدی کا لیبل لگا

رکھا تھا۔ زمان جغرافیہ کو اپنا پنگھوڑا بنائے رکھتا ہے اور جغرافیہ خود پہ بسنے والوں کی معاشی معاشرتی زندگی کا خالق و پالنہار ہوتا ہے، یہ انسان کی پیداواری سرگرمیوں کے لیے رحمِ مادر ہوتا ہے۔ وقت، جغرافیہ اور انسانی پیداواری سرگرمی، تینوں مل کر اپنی مطابقت اور تقاضوں کے تحت حالات کو ہی نہیں بدلتے بلکہ اپنے آپ کو بھی سربلند کیے رہتے ہیں۔ انھی عناصر نے مستیں توکلی اور سمو کے کردار تخلیق کیے، انہیں وسیع سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنایا، خود انہیں تقدس و عظمت کے نمونے میں ڈھال دیا اور ان کی داستان کو ابدیت عطا کی۔ مہر تو بس بہانہ بنی۔

مگر یہ بہانہ محض ایک سادہ سا بہانہ نہ تھا۔ یہ تو مست و سمو کو سو سو بار مار کر پھر حیات عطا کر کے گھڑا گیا تھا۔ محبت نے ان دو ہستیوں کو اپنے کانٹے دار شکنجے میں بھینچ ڈالا۔ اُن پر سے دنیاداری کی پوشاک اتار پھینکی۔ انہیں بار بار زمین پہ پٹخا، پھٹکا، چھانا اور جب انہیں خوب صاف کر دیا تو پھر.....فراق کے ابدی درد کی چکی میں انہیں باریک آٹے میں پسوا ڈالا۔ ہجر کی اذیت سے اتنا گوندھوا دیا کہ ان میں لوچ پیدا ہوگئی۔ اگلا مرحلہ انہیں مقدس آگ میں ڈالنے کا تھا جس سے وہ سماجی جدوجہد کے مقدس دسترخواں کی مقدس روٹی بن گئے۔ وہ یسوع کی طرح ''زندگی کے دل کا ایک جزو'' بن گئے۔(2) مگر دلچسپ بھید دیکھئے کہ یسوع اپنے بارہ چیلوں کو اپنے ساتھ رکھ کر کھلانے پلانے کے باوجود انہیں ہارس ٹریڈنگ سے نہ بچا سکا اور ''زیتون کے باغ'' میں صرف 30 دینار پر اُس کا سب سے وفادار شاگرد بک گیا۔ مست یسوع نہیں، اُس کے لولا کی پیغام کا ایک بلوچستانی سیکریٹری جنرل تھا۔ کامیاب سیکریٹری جنرل، اس لیے کہ وہ دو سو برس بعد بھی دنیا سے منقطع پہاڑوں میں گھرے بلوچوں کو اپنا حامی بناتا جاتا ہے!۔

انھی پہاڑوں میں کاہنوں، فقیہ فریسیوں، ھیرودیس اور پیلاطوس کے خلاف اُس سماجی بغاوت کا جنم ہوا جس سے مروجہ سماج کی شاہ رگیں پھٹ جایا کرتی ہیں۔ انقلاب، جس کے پھڑپھڑاتے پھریروں بینروں پہ ''مہر انقلاب''، ''عشق انقلاب'' کے سنہرے حروف کندہ تھے۔ محبت کا یک نکاتی انقلاب۔ مہر و محبت جسے قبائلی رواجوں اور فتح و برتری کی کرخت و کھردری چٹانوں میں یرغمالی بنایا گیا تھا۔ مہر جو لب اور سیاہ کاری کی کال کوٹھڑیوں میں محبوس رہی تھی۔ محبت جو

زیرِ زمین، خفیہ اور شرم ناک سرگرمی گردانی جاتی تھی۔ اسی مہر، اسی محبت، اور اسی عشق کے نام پہ ایک انقلاب بپا ہوا تھا میرے ماوند میں، جسے نوٹ نہ کرنے والا مورخ ہاتھوں کے رعشے میں مبتلا ہوگا۔ ارے بھائی! محبت تو بغاوت کی احسن ترین صورتوں میں سے ایک ہے۔ تبدیلی کی ایک ایسی قوت جو بڑے سے بڑے خندق میں محفوظ سیاسی سماجی نظام کو چیلنج کر سکتی ہے۔

مست نے یک روزہ فرہادی نہ کی، یہ تو ایک مسلسل انقلاب تھا۔ وہ عشق کا لانگ مارچ کرتا کبھی دہلی ہوتا، کبھی مکہ، کبھی سہون، کبھی ڈیرہ۔ جلو میں سیکڑوں لوگ لیے ثقافتی انقلاب کے مظاہرے کرتے ہوئے چار دہائیوں تک وہ خود اس انقلابی لانگ مارچ کی قیادت کرتا رہا۔ ایک ایسا انقلاب جس میں خون کا ایک قطرہ نہ بہا، بلکہ وہ ہر سازش، ہر کھسر پھسر کو حاجیوں کے جہاز سے پہلے کعبے پہنچ کر بے نقاب کرتا رہا۔ اس انقلاب میں نہ پاسداران تھے نہ کیسار، ہر بشر کی شراکت کاری کا انقلاب تھا یہ، جسے دو سیلابی دریاؤں کے سنگم سے ''شاہ'' کے زور سے بچ نکل کر تزکیہِ نفس اور انتہا درجے کی کمٹ منٹ کی لازوال مثالیں قائم کرتے ہوئے سینچا گیا تھا۔ محبت کی زبان غلامانہ زبان نہیں ہوتی مگر یہ آمرانہ بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مست کے یہاں ہر انقلابی آرڈیننس کسی فرمان کی صورت نہیں بلکہ شعر کی صورت نازل ہوا، برملا، برمحل، بہ بانگِ دھل و دنبورہ۔ مست تیرے مجسمے، کولتار کی سڑکوں کے چوکوں پہ ایستادہ نہیں بلکہ احساس بھرے دلوں کی غزالی دھڑکنوں کے بیچ متمکن ہیں۔

حوالہ جات

1۔ سومرا نڑیں، بختیار خان.....انٹرویو۔

2۔ خلیل، جبران۔ النبی۔ 1977۔ آئینہِ ادب، چوک مینار۔ انارکلی لاہور۔ صفحہ 26

پیرک وگراں ناز

انسان بہت ہی عجوبہ اور شان دار جان دار ہے۔ ہر وقت تاریخ کے مطالعے میں خالی جگہوں کو پُر کرتے رہنے میں لگا رہتا ہے۔ تسلسل تسکین دیتا ہے۔ تاریخ کے گام گیژ میں کوئی وقفہ، کوئی ٹوپ ٹپہ اُسے گوارا نہیں ہوتا۔ نامعلوم گوشوں کی جستجو ہی انسانیت ہے۔ زبانی روایتوں کو چھانتے رہنا اور انہیں ثبوت بھری تحریر میں لانا.....۔

مستیں توکلی کے بھائیوں کی تعداد کے بارے میں باتیں بڑی تحقیق طلب ہیں۔ بہت سے لوگ انہیں سات بھائی قرار دیتے ہیں مگر وہ خود اپنے شعر میں ''چھ'' کی تعداد بتاتا ہے۔ (ہرشش ایں براثاں مس شتوا یکا سرا تکغاں)۔ اس لیے انہیں چھ بھائی ہی قرار دینا چاہیے۔

وہ آخر میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے پانچوں بھائی اُس کی اپنی موت سے قبل یعنی اس کی زندگی میں فوت ہوئے۔ وہ اپنے ''بنگویں'' بھائیوں کی موت کا غم جھیلنے زندہ رہا تھا۔ اُس کے تین بھائی چمبھڑی جنگ میں مارے گئے، ایک خدائی موت مرا۔ قبائلی فیوڈل زندگانی میں خدائی موت مرنا ایک نعمت ہوتی ہے۔ کسی کے ہاتھوں قتل ہونا پورے خاندان، پورے قبیلے بلکہ دونوں فریق قبائل کا قتل ہوتا ہے۔ پشتوں تک انتقام کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور دونوں قبائل میں سے ایک، شکار کی تلاش میں گوریلا بنا رہتا ہے اور دوسرا، اپنی حفاظت وسلامتی کے لیے خبرداری میں اپنی زندگی گزارتا رہتا ہے۔ کچھ عرصے بعد یہ دونوں اپنے رول باہم بدل لیتے ہیں مگر مقدر میں لکھا یہی دائرہ ہی ہوتا ہے.....خدائی موت ایک نعمت ہوتی ہے۔ (تہ خدائی، مارضائی)۔

مست نے اپنی شاعری میں اپنے دو بھائیوں کا نام لیا ہے؛ ایک ولنٹر جو کہ دو اور بھائیوں کے ساتھ چمبھڑی جنگ میں مارا گیا تھا۔ اور دوسرے کا نام پیرک تھا۔

پیرک ایک عظیم موسیقار تھا، گراں ناز کا پیرک، عاشق پیرک۔ سچ یہ ہے کہ اگر اُس کے اوپر مست توکلی کے عشق کا گھنا پیڑ نہ ہوتا تو پیرک خود ایک بہت بڑی مہری داستان کا ہیرو ہوتا۔

چار روزہ زندگی میں پیرک ہی وہ بھائی تھا جو مست کی زندگی کا ساتھ دیر تک دیتا رہا۔ وہ دونوں باقی بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ عرصے تک زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز رہے، اور زیادہ وقت تک ساتھ رہے۔ پیرک گرو، (نڑ) دنبیرو اور سریندا بہت اچھا بجاتا تھا۔ شاید اُسی کے زیر اثر مست کو بھی انسٹرومنٹس کا بڑا شوق تھا اور اس نے کئی دھنیں بنائیں بھی۔

پیرک بہت مہربان اور نرم دل کا مالک تھا۔ اور اس قدر آرٹسٹ کہ اپنا سریندا ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا اور جہاں کہیں فرصت ملتی تھی کسی پتھر پر کسی گھنے سائے میں، کسی جھیل کنارے بیٹھ کر زندگی کے کنسرٹ کا ساتھ دیتا۔ اور کوہستان کی ابدی خاموشی کو موسیقی سے ہارمنی عطا کرتا۔ بے آبادی والے علاقے میں سامعین انسان ہوتے ہی نہیں، وہاں تو عناصر و مظاہرِ کائنات تالیاں بجاتے ہیں، رقص کرتے ہیں۔ کبھی خاموشی کی گہرائی میں ڈوب کر تو دیکھیں۔ دل پاک وصاف ہو جائے گا۔

یہ محبت کرنے والوں کا خاندان تھا۔ اور بقول حضرت شاہ حسین، ان کے جسموں میں عشق کی ''پھانس کُھب'' گئی تھی۔ مست تو مست تھا ہی۔ مگر پیرک بھی اپنے اس خاندانی وصف میں پیچھے نہ رہا۔ پیرک روحوں کا سوداگر تھا، محبت کرتا تھا۔ اور بلوچ تاریخ میں یہ دلچسپ ترین بات ہے کہ پیرک وہ پہلا (اور آج کی تاریخ تک آخری) عاشق ہے جس کو خود اپنی منکوحہ بیوی سے پیار تھا.....ٹوٹ کر پیار تھا۔

اُس کی محبوبہ اور بیوی کا نام گراں ناز تھا۔ گراں ناز کون تھی، کس قبیلے سے تھی، ہم نہیں جانتے۔ بس یہ کہ پیرک گراں ناز کو چاہتا تھا اور گراں ناز بھی دل و جاں سے اُس پر فریفتہ تھی۔ دونوں کی اولاد تھی نہیں، واحد بھائی مست تھا جو اپنے ہوش اڑا دینے والی محبت کی عمیق وادیوں میں

غرق، مشاہدہ و دریافت کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ اس لیے یہ میاں بیوی اپنی ہی محبت کی دنیا میں غرق تھے..... نہ رقیب و قاصد کے مسائل، نہ فراق و وصال کا جھنجھٹ۔

مگر مہر تو خود غم کا صحرائے گوبی ہے۔ اِس ڈِش میں غم، کسک اور درد کی مرچی پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے۔ بقول میرا بائی، ''اے جوگی، محبت تکلیف کی جڑ ہے''۔ گو کہ میاں بیوی عشق کی بے کرانی میں مبتلا تھے اور زندگانی گزرتی جاتی تھی۔ مگر غم تاڑ میں ''بالاچ گورگیژ'' بنا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

پیرک کا پالتو گرانڈ (دنبہ) دونوں کو پیارا تھا بالخصوص پیرک کو۔ پالتو جانور اور وہ بھی بے اولاد جوڑے کے لیے تو اکلوتے بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔ اور وہ جانور اگر ہو بھی دنبہ!!..... دنبہ تو بلوچ کے لیے پیر بھی ہوتا ہے، باعثِ برکت بھی، نیک شگون بھی، بلائیں ٹالنے والا بھی، آبادی بھی آزادی بھی۔ یسوع مسیح کے بہت بڑے ایجنڈے میں بھیڑ تو محض ایک علامت، استعارہ اور وسیلہ تھا مگر پیرک کا سارا پیار، دولت، اولاد، محض یہی ایک دنبہ تھا۔ لہٰذا تصور کیا جا سکتا ہے کہ پیرک نے اُسے کس ناز اور خیال سے رکھا ہوگا۔ اس کے جسم کے بال تراش کر پشت پہ پھول کی طرح ایک چوٹی (جُوٹی) چھوڑی ہوگی جسے اُس نے ماں بلوچستان میں میسر' سب سے خوب صورت رنگ سے رنگ دیا ہوگا۔ ڈھونڈا ہوگا سریلی آواز کا ٹلہو، لٹکائے ہوں گے گردن میں بیٹوں والے پازیب اور گھنگرو۔ گراں ناز سے کس لجاجت اور نرم گفتاری سے ملتجی ہو کر دنبے کے لیے رنگین پھولدار پشمینہ رسی، گلے کے لیے خوبصورت کشیدہ کاری سے کنڈی بنوائی ہوگی..... المختصر یہ دنبہ اُس کے لیے، گراں ناز کے ساتھ اس کے بے پناہ پیار کی علامت بھی تھا، اولاد کی جان لیوا خواہش کا مظہر بھی تھا اور انسان کے فطرت اور کائنات سے اشرف المخلوقاتی تعلق کا اظہار بھی۔ وہ اپنی رزق روٹی کا آدھا اُسی کو دیتا ہوگا۔ اس کا ایک پیارا سا نام رکھا ہوگا۔ اُسے پکارتا ہوگا تو وہ جانور مانوس حرکتوں، شناسا آوازوں کو ریسپانس دیتا ہوگا۔ اپنی چوکڑیوں سے پیرک کا دل بہلاتا ہوگا۔ میاں بیوی کے قدح میں پانی پیتا ہوگا۔ ملائمت بھرے ہاتھوں میں نہاتا ہوگا.....

الغرض کل کائنات اور اُس کا پیار، اِسی دنبے کا تھا۔ پیرک جب ایک آدھ دن کے سفر پہ

گھر سے باہر ہوتا ہوگا تو اُسے گراں ناز کتنی یاد آتی ہوگی، اپنا دنبہ کتنا یاد آتا ہوگا۔ جسے اس کی غیر حاضری میں گراں ناز اُسی کا پر تو سمجھ کر اُس کے حصے کا پیار بھی دیتی ہوگی۔

ایک ایسا ہی دن ہے، پیرک گھر میں نہیں ہے۔ گراں ناز اپنا خالی مشکیزہ اٹھاتی ہے، پانی بھرنے۔ نہ نلکا، نہ گیزر، نہ ٹینکی نہ Purification Plant۔ خود ہی مشک بناؤ، خود ہی حفاظت سے رکھو اور خود ہی بھر کر، پیٹھ پہ لادے میلوں دور سے گھر لاؤ۔ گراں ناز نے دنبے کے گلے میں بندھی پشمینہ پھول دار رسی کا دوسرا سرا آٹا پیسنے والی ہتھ چکی کے دستے سے باندھی کہ دنبہ اس کے پیچھے پیچھے چل کر خود کو ہلکان نہ کرے۔ وہ اپنا خیمہ محافظ فرشتے (مائیکل) کے حوالے کر کے ننگے پیر پانی کے سرچشمے کو چل دیتی ہے۔ پانی..... پانی..... العتش، العتش۔ پانی کی نایابی نے علاقوں، شہروں، وادیوں، آدمیوں، عورتوں کے نام پانی پہ رکھوا دیے۔ بس چلے تو بلوچستان اپنا نام بھی پانی کی حسرت کی مناسب سے رکھے..... گراں ناز میلوں دور پانی ڈھونے جاتی ہے تو خورد و نوش کی چیزیں کتوں، لومڑیوں، گیدڑوں، چرند پرند کے خوف سے خوب ڈھانپ جاتی ہے، چھ آٹھ گھنٹے بعد جو گھر لوٹنا نصیب ہوتا ہے!۔ (گراں ناز! کاش تیرے پکے گھر میں میٹھے پانی کے نلکے لگے ہوتے.....!!)۔

گراں ناز جب جلتی سہ پہر کو بھرا مشکیزہ سر پہ اٹھائے واپس گھر پہنچتی ہے تو وہاں تو قیامت بپا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی دنیا اندھیر کہ دنبہ چکی کے دستے کے گرد گھوم گھوم کر اپنے گلے کی رسی تنگ کر کر کے دم گھٹ کر کب کا مرا پڑا ہے۔

قیامت، کہ محبوب کا محبوب دنبہ گراں ناز کے چارج میں مر گیا۔ پیرک کو جب پتہ چلے گا تو ایک لمحہ کو ہی سہی، غم ناک تو ہوگا۔ اور گراں ناز وہ سیاہ منظر اپنے محبوب، اپنے عاشق کے مقدس چہرے پہ دیکھنے کو زندہ ہی کیوں رہے؟۔ ایسی آنکھیں کیوں رہیں جو یہ منظر دیکھیں؟۔ ایسا دل کیوں رہے جو اس دکھ بھرے موقع پہ دھڑکے؟..... وہ ایک لمحہ بھی اسے زیوس کے ہاتھوں پیرومی تھیس والی زندگی بننے کیوں دیتی؟۔ گراں ناز کے لیے موسمی نظارے، قدرتی مظاہر کیا ہیں، محبوب کی آنکھوں کی چمک، اس کے مسکراتے لبوں کی کنج!!..... اور اگر محبوب کا وہی کنجِ

لب مسکان کی بجائے خفگی میں بدل جائے تو سارے مناظر، ساری دھرتی، کل کائنات ضحاک کے اژدھا بن جائیں ۔ چنانچہ وہ اپنا دوپٹہ لیتی ہے اور اُس کا پھندا بنا کر محبت کا بلیدان بن جاتی ہے۔.....بلوچستان ایک اور سسی کا مالک بن جاتا ہے۔

شام کو راحت کی تلاش میں تڑپتا پیرک، سکون کی جنت کو لوٹتا ہے تو اُسے شہید نظر آ جاتی ہے۔ کیا رہ گیا اس کا؟۔ ماورائی کی گھڑی تھی یہ.....ٹرانسفارمیشن کی تغیر پذیری کی ساعت تھی یہ۔ انت کے بے انت ہو جانے کا لمحہ تھا، متشکل سے معدوم ہو جانے کا امر تھا یہ۔ نقارہ بجا اور مہر کے پیغمبر کے سینے میں اپنی بندوق کی گولی پار ہو چکی۔ غمِ عشق تیرا شکر یہ کہ آخری سرحد بھی پار ہو گئی۔

عقل در شرحش چو خرد رگل بخفت
شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

دو بلوچ، سبز پریوں کی اُس سلطنت میں قبول ہوئے جہاں محبت کے سوا کوئی اور سکہّ نہیں چلتا۔ جہاں محبت کی نرم روشنی ابدی تاریکی پہ فاتح رہتی ہے۔ عشق نے اپنے شہیدوں کی فہرست میں دو ہندسوں کا اضافہ کر لیا.....میرا بلوچستان عشق کا، عشق کے وابستگان کا، عشق کے شہدا کا بہت ضخیم بہی کھاتہ ہی تو ہے!!۔

عاشور کا دن ہے یہ۔ ماں ڈک بند کلوری بن گیا، Muffled drum بجتا ہے۔ عشق کا کیوپڈ کنفیوز ہے، ماتم میں کبھی اپنا پرچم سرنگوں کرتا ہے کبھی پیرک کے سرینداپہ رقص والی دھن بجاتا ہے۔ میرا وطن آج تک جشن و ماتم کی اِسی کیفیت میں مبتلا ہے۔ پیرک اور گراں ناز، گراں ناز اور پیرک، جشن و ماتم، ماتم و جشن.....تین سو سالوں سے بلوچستان انھی دو کرداروں والے کاہان کو زندگانی کا محور بنائے ہوئے ہے۔ جب بھی ماں ڈک بند خود پہ فخر کرتے ہوئے مسکرا دیتا ہے تو نوروز، حمید، شورش، پہوال اور غوثی کی ساری جنم بھومی انبساط اور تمکنت کا سمفنی بن جاتی ہے۔ اور جب پیرک و گراں ناز کی قتل گاہ پہ غم کے بادل چھا جاتے ہیں تو پوری بلوچ دھرتی ''مونجھ استان'' بن جاتی ہے۔

اُس شام فطرت کی ہم آہنگی میں افراتفری مچ گئی۔ لفظ پریشان تھے کہ ٹالسٹائی کو اتنے بڑے ناول کی تخلیق کی خبر کس طرح کر دیں۔ شعریت جام کو تلاش کرتی تھی کہ دیوان تخلیق ہو گیا

پہاڑوں میں۔ بالشوائی تھیٹر کے ڈائریکٹر کو بلاؤ کہ اتنا بڑا Ballet کمپوز ہو چکا ہے نفسک کے دامن میں۔ رومی آن کر دیکھو کہ پیرک کی قربان گاہ پہ درویشوں کی دُھن پہ پوری دھرتی جھوم رہی ہے اور عشق سرگردان کہ ڈھونڈے عاشقوں کے قافلے کے انچارج مست کو کہ آؤ کس شان سے تمھاری صفوں میں دو اور سرفروش سج دھج کے ساتھ آن ملے ہیں۔

مگر ٹھہریے۔ یہاں مست محض عشق کا سرپرست اعلیٰ ہی نہیں تھا جس کی امت میں اضافے کی خوش خبری دی جا رہی ہے۔ ارے وہ تو بھائی بھی ہے جسے دل کے ٹکڑے پیرک کی موت کی خبر پہنچ رہی ہے۔ اور یہ کسی عام بھائی کی موت ایک عام بھائی کو نہیں دی جا رہی ہے۔ یہ دنیا کے بہت بڑے انسانوں میں سے ایک کی موت کی خبر اس کے ''بڑے'' بھائی کو دی جا رہی ہے (عشق کے شہید سے بڑا آدمی دنیا میں کون ہوگا!)۔ تو پھر یہ خبر کون دے؟۔ یہ خبر جائے گی کس کی طرف سے؟۔ قیامت برپا ہونے کی اطلاع والی چٹھی میں ''منجانب'' کے نیچے کس کا نام لکھا جائے؟.....یہ جائے گی قبیلے کے سفید ریش کی طرف سے، کمیون کے رکھوالے کی جانب سے، گزین خان کی جانب سے۔ وگرنہ ایسی جانکاہ خبر سنانے والے کو تو ایک ہی دل جلی آہ بھسم کر دے!۔

گزین نے مست کو ہوا کے دوش پہ چھٹی لکھی۔ اپنی طرف سے سلام اور پیرک کی موت کی خبر۔ آپ دلیل ڈھونڈتے رہیں مگر رومان میں، عشق میں، مائیتھالوجی اور عقیدت میں منطق نہیں چلتی۔ اس لیے یا تو دلیل وغیرہ ڈھونڈ کر اپنا موڈ بگاڑ لیں یا دو سو سال سے محظوظ ہوتی ہوئی خلقِ خدا کی طرح اس تخلیقی فقرے سے آپ بھی محظوظ ہو جائیں کہ اُسی وقت، اُسی آن مری علاقہ کے ماڑک بند سے سینکڑوں میل دور بغیر سڑک، بغیر بجلی کے کوہ سلیمان پہ زیتون کے جنگل میں خونی رشتہ کے بھی علاوہ ایک پیر بھائی کو اس کے دوسرے پیر بھائی کی موت کی یہ خبر پہنچ گئی۔ دل کی جڑیں اکھاڑ دینے والی اِس خبر پر مست کی طرف سے خبر دینے والے کو منحوس نہیں کہا گیا بلکہ کہا گیا:

سر تئی سو کاباث مس سیرو شاذہاں
(تم سکھی رہو شادیوں میں، جشنوں میں رہو)

گزین کی بات مست جانے اور مست کی بات گزین جانے۔ کتنے بڑے سینے چاہیے

ہیں اتنے بڑے دلوں کے لیے جن میں اتنی بڑی بات سما سکتی ہے۔ پیرک' مست کا آخری زندہ بھائی تھا۔ موسیقار بھائی، آرٹسٹ بھائی، عاشق بھائی..... پیارا بھائی.....جس کی محض بیماری پہ مست، مختارِ کل کے بیڈروم میں گھس کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر گڑگڑایا تھا؛

دراہ کنیں اللہ نیاذی مئیں کٹئے بانزراں

(صحت مند کردے اسے اللہ، بٹھادے اسے میری چارپائی پہ میرے ساتھ)

آج وہ شخص اس قریب ترین ہستی کی موت کی خبر پہ خبر رساں کو دعائیں دیتا ہوا ماں ڑک بند روانہ ہوا۔ اگر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونے کی صلاحیت حاصل ہو سکے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مست عصر کے وقت بیہو سے روانہ ہوتا ہے اور اُسی روز مغرب کی ملگجی روشنی میں ماں ڑک بند پہنچ جاتا ہے۔ اُس وقت جب کاندھی (جنازہ اور میت کو دفن کرنے میں شریک لوگ) عشق کے جوگی، پیرک مہاراج کو سپردِ خاک کر کے واپس آ رہے ہوتے ہیں۔ قیادت کوئی چھوٹا موٹا شخص نہیں، خود درویش سردار، گزین کر رہا ہے۔ (آج کا سرداری نظام کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے!!)۔

تو کلی مست کمال ضبط سے خود کو قابو میں رکھتا ہے۔ نہ چشم نم ہوتی ہے، نہ خاک بر سر۔ اس لیے کہ آج دو وجہ سے خود کو قابو میں رکھنا لازم تھا۔ ایک تو یہ کہ سارا شہرِ جاناں دیکھ رہا تھا۔ دوسرا یہ جتلانا تھا کہ اس کے بھائی نے، اس کی پارٹی کے پولٹ بیورو ممبر کامریڈ نے کوئی ڈھکی چھپی، چوری دزی کا کام نہ کیا تھا۔ اس نے تو عشق کیا تھا اور پوشیدہ عشق نہیں کیا تھا۔ بلکہ فطرت کی ساری نشریات روک کر تھری ناٹ تھری جیسی مست و رقصاں، وادیوں گھاٹیوں میں بندوق کی گولی جیسا انہونی دھماکہ، کر کے اس کی خبر کر دی تھی۔ بتا دیا تھا سب کو اس نے کہ محبت خاموشی میں ہو ہی نہیں سکتی اور جو شخص خیر خیریت میں محبت ڈھونڈتا ہے اُس کی تقدیر میں ابدیت نہیں گم نامی ہے۔ آپ مست کے بھاری فریضہ کا اندازہ لگائیں۔ اُس وقت (بلکہ آج تو مزید) بیوی کا ذکر کرنا تک معیوب تھا۔ نام لینا تو بہت ہی بے غیرتی کی بات تھی (اور اب بھی ایسا ہے)۔ اُس سے اپنے خاوند کے تعلقات معیوب ترین اور خفیہ ترین بات تصور ہوتی تھی (اور اب بھی ہے)۔ زال (بیوی) سے انڈرسٹینڈنگ کرنے والے شوہر کو ''زالو'' کہا جاتا ہے۔ بیوی کو تو بس پیٹتے رہنا ہے، گدھوں کی طرح اس سے

مشقت کروانا ہے، اُس کی خواہشات کو مسل دینا ہے، اس کے احساسات کو کچل ڈالنا ہے۔

صدیوں سے یہی کچھ جاری تھا۔ اب اگر ایک عام پیرک ''بیوی'' کی محبت کی بھاری صلیب کاندھے پہ اٹھائے، جبر سے نہیں رضا سے، پہاڑوں، گھاٹیوں میں گھسٹتا پھرے اور حتیٰ کہ خود کو قتل کر دے تو کتنی بڑی بغاوت ہے یہ مروج سے، ''سٹیٹس کو'' سے، سرقبیلوی نظام سے، اس کے ویلیو سسٹم سے اور رسم و رواج سے۔

ظاہر ہے کہ اُس کی اِس حرکت سے مری عوام میں اس کی بہت تذلیل بہت تہمت بازی ہوگی۔ اِس عمل کو اور لہٰذا اس عمل کے کرنے والے جوڑے کو نیچ اور پست سمجھا جائے گا، اور نئے نئے ضرب المثل جنم لیں گے، ایک بہت بڑی کامیابی کو بدنامی کے قعرِ مزلت میں ڈالا جائے گا..... اور پوری عالمی عاشق برادری اپنی عظمت کو قبائلی کھوکھلی غیرت میں دفن ہوتا دیکھے گی۔ لہٰذا، اُس محبت کا دفاع کرنا تھا (کرنا ہے)۔ اور یہ کام مست جتنے بڑے انسان اور عظیم دانش ور کے علاوہ کون کر سکتا تھا کہ وہی تو عشاق کی دفاعی افواج کا سپہ سالار تھا (ہے)۔ اسی نے تو بلھے شاہ کی طرح ''لوک ہسائی'' کا کلمہ پڑھ رکھا تھا۔ وہی اُس وقت وہاں موجود ہم سب کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے ہی تیرِ الزام کو ارادوں سے بھی پہلے سرد کرنا تھا، سنگِ دشنام کو نشانِ امتیاز بنانا تھا۔ اس لیے کہ وہاں (اور یہاں) دل فگاروں کا دم ساز وہی تھا (وہی ہے)۔

چناں چہ جب پیرک کا ''طبعی'' نیز ''روحانی'' بھائی مست سامنے آیا تو بہت سارے لوگ تمسخر اور تذلیل میں مونچھوں کے نیچے مسکرا دیے۔ تب بپھر گیا مست.....تحکم بن گیا مست۔ دھاڑ، چنگھاڑ کر دفاع کرنے لگا۔ وہ دفاع کرتا ہے محبت کا، اونچا قرار دیتا ہے پیرک کو، گراں ناز کو.....''گندنہ واں کندیں'' (دیکھو، ہرگز نہ ہنسو) کہہ کر ''نہی عن المنکر'' بن جاتا ہے ''دوزوان'' (منافقو) کہہ کر طبقاتی سماج میں ''کرو کچھ کہو کچھ'' کے رواج کو ننگا کر دیتا ہے اور ''براہندغ'' (ساتھی) کے نام سے انہیں مخاطب کر کے ان کے اندر رہ کر ان سے جدوجہد کرنے کا عزم کرتا ہے۔ اپنی ملامت بھری حرکات نہ کرو، تعظیم کرو، سر جھکاؤ اپنے کہ روزمرہ والا کام نہیں ہوا، انہونی ہوگئی ہے۔ وہ بہت خوب صورتی سے ''لوگ تو عام موت مرتے ہیں'' کا فقرہ استعمال کرتا

ہے۔لوگوں کے اس عام، بے نام، بے معنی موت کے پس منظر کے بعد ہی وہ پیرک کے مقتل میں جانے کی شان بیان کرسکتا تھا.....تم عام موت مرتے ہو،قضا تمھیں مارتی ہے،کھانسی نزلہ، بے نام ملیریا تمھیں مارتا ہے،ٹی بی یرقان کی حقیر موت تمھیں مارتی ہے.....مگر.....پیرک کی موت دیکھو،شان دار موت.....اُسے گراں ناز کا غم مار ڈالتا ہے.....

ذات پات سے ماورا،اور نام ایڈریس سے بے تعلق عشق آج پیرک وگراں ناز میں مجسم ہوگیا تھا کہ انہوں نے عشق میں سر دھڑ کی بازی لگادی تھی۔ جیت ہار والا ریفری اس کھیل میں ہوتا کہاں ہے؟۔اس میں تو کود پڑنا ہی میڈل وصول کرنا ہے۔میڈل بھی کیسا؟،ٹرافی بھی کونسی؟۔ جب حاضرین وتماش بین غیرت زدہ رجعتی قبائلی ہوں،وصول کرنے والا گُرّو پیرک ہو، اور عطا کرنے والا مہارشی توکلی ہوتو پھر عام ،اور دنیاوی انعام بانٹنے کا فوٹو سیشن بے معنی ہوگیا۔کوئی انٹلکچوئل کام،کوئی آرٹ فُل کام کرنا ضروری ہوگیا تھا،اور مست نے ویسا ہی کیا۔اس نے ایک اور منفرد ،اور لائقِ تقلید عمل کے تحت پیرک کی بندوق پھینک دی اور اس کا موسیقی کا آلہ،سریندا اٹھالیا۔یوں کر کے اس نے بلند کردیا ساز کو،سُر کو،تال کو،فن کو،فنونِ لطیفہ کو..... ہاں بلند کردیا، یہ کہہ کر سر بلند کیا کہ،''اب یہ سریندا عام شادیوں میلوں ٹھیلوں میں مراثیوں کے ہاتھوں میں نہ بجے گا۔'' بلکہ اب یہ عشق کا سٹڈی سرکل بنے گا،لٹریچر بنے گا،گواہی بنے گا۔

چنانچہ گراں ناز کے پیرک کو عشق ،قربانی ،کمٹ منٹ ،اور شہادت کا میڈل یوں عطا کیا جاتا ہے، کہ رہتی دنیا تک بیوی سے محبت کرنے والا،اُس کی عزت کرنے والا اور اُسے بلند مرتبہ دینے والا''پیرکی'' پیغام جاری وساری رہے۔تب اے شہیدِ عشق،اے پیرک! میں تمہارے سریندا کو اٹھا کر بلند ترین پہاڑ''کڑمی'' کی چوٹی پر رکھ آؤں گا کہ اس ناقابلِ رسائی چوٹی پہ وہ بھی نظر نہ آئے تم بھی نظر نہ آؤ،مگر تمہارا پیغام،تمہارا فلسفہ اور عشق کا نغمہ رہتی دنیا تک بجتا رہے۔اُسے فرشتے یعنی پاک لوگ ہی بجاتے رہیں گے،اور فرشتے یعنی پاک لوگ ہی سنتے رہیں گے.....اور عشق کے مریدو! مری عوام میں دوسو برس گزرنے کے بعد آج بھی یقین رکھا جاتا ہے کہ،''اہل اور شایانِ شان' کان'' کڑمی کی چوٹیوں سے آتی ہوئی سریندا کی دلکش لے سن لیتے ہیں..... ہر جمعہ کی شب۔

مس ژہ سندھڑی دیر پاندیں مژ و جھنگاں گڑ تغاں
جاہے گوں پاذاں جاہے گوں مرگی بانزراں
پاذ شفا ذیا پہ دلئے دوریں اندھاں(اندوھ)
یک شفے بیہو تربتا بھّما بیثغاں
کاغذے آتکہ گوں ہزاریں لکھ پڑھاں
پیرکہ موث و گونتی گزینہ سلام
(سردار)سرتئ سو باں باث مس سیر و شاذھاں
یا الٰہی تہ دے مناں مرگی بانزراں
بانزرابیڑاں شِکرہ ای شیمو شاں دیاں
روشے پیشنا کوہے بیہو آ سمبراں
دیغرے زڑدیں مانڑکی دامانا گزاں
سرنماشاما کانہلو شہرا آتکغاں
گوخ ڈِھکّنت کڑسواں روڑانہ دیاں
چندنیں ہینزاں گوانکھ ایناں کوہیں جنتراں
میشہ بانزنت وہیڑدغاں لوڑھو پروشتغاں
پلوے ماخو پلوے کاندھی آتکغاں
زوارینا گزیں گارینا پیرک پیاذغاں
مس دلا گوئشتہ کا نہلوآ بھوگے کناں
واہ و شاواشیں پلّشہ دلدارا مناں
پیرو پیغامبر اے دنائی آ کل رواں

در کانڑیں آنی ملامو ایں کاراَثاں
گند نواں کندیں دوزوانیں براھندغاں
کسے پہ سَوباں پیرک پہ گراں نازہ غماں
قادری خواجہ گار مخّناتئ آمانتاں
تئ دستہ وہژگوانکا تاں ڈیہی ڈومبے آ دیاں
ڈومبے وجّینا مں کئی سیرو شاذھاں
تئ دستہ نوذگوارا تاں دریا آ ڈھل دیاں
من براں کڑمی گورغیں درنگا ایر کناں
کس مہ غندیث و باجے ژہ بوریں کر گزاں
ملخ و جیناں کر گزے دِلگوشا کناں
موشہ روش بی چو بیارنت او پیداراں مناں
پیر سوالکھیں مئیں تواراں آمیں کناں
جنتا پُجیناں بہشتنا روزی کناں
(پیرک) نَیں ترا بچے مں ہمانہیا لیوکناں
نَیں تئ بانسکہ دستاں تئ بذلّاں پیداشہ کناں
ڈو برئے داراں ثی دلئے سِکّاں ایر کناں
یا الٰہی مں چے عذابے آ کپتغاں
چمبھڑی روشا گڑتغاں باری اے کناں
سئ نہ یثاں شئے وزت و جھوری آں کفاں
ہر ششیں براثاں مں شتو ایکا سراتکغاں

ترجمہ:

میں سندھڑی (سندھ) کی دھند اور جنگلات کی وسعتوں سے واپس لوٹا
کہیں کہیں پیدل اور کہیں پرندے کی پرواز (رفتار) سے
دل کے اندوہ ناک درد کے باعث ننگے پیر
میں نے ایک رات کوہِ بیہو (کوہ سلیمان) پہ واقع مزار پہ قیام کیا
(یہاں) مجھے ایک مکتوب ملا جس میں بہت باتیں لکھی تھیں
پیرک کے انتقال کی خبر تھی اور سردار گزین کے سلام لکھے تھے
(سردار) تم ہمیشہ فتح مند اور شادماں رہو
یا الٰہی مجھے پرندوں کی سی پرواز عطا کر
پنکھ چلاتا ہوا عقاب کی طرح جھپٹتا جاؤں
میں ظہر کے وقت کوہِ بیہو سے روانہ ہوا
سورج غروب ہونے کو تھا کہ ماں ڑک کے دامان سے گزرا
غروب آفتاب پہ کاہان شہر پہنچا
گائیاں آوازیں نکالتی بچھڑوں کو دودھ پلاتی ہیں
لسی بنانے کی آوازیں آ رہی ہیں اور چکی پیسنے کی صدائیں آ رہی ہیں
دنبیاں آوازیں نکالتی ہیں اور لیلے کود کود کر باڑھ گرا دیتے ہیں
ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے لوگ میت دفن کر کے آ رہے تھے
سردار گزیں گھوڑے پہ سوار ہیں، مگر پیادوں میں پیرک موجود نہیں ہے
میں نے سوچا کاہان شہر کو بددعا سے تباہ و برباد کر ڈالوں
احسان مند ہوں دلدار کا جس نے مجھے (ایسا کرنے سے) روکا
(کہ) مرشد اور پیغمبر تک اس دنیا سے چلے جاتے ہیں
میرے قبیلے کے لوگ جو کہ ملامت انگیز حرکتیں کرتے ہیں

خبردار اے میرے منافق بھائیو مذاق نہ اڑانا
لوگ عام موت مرتے ہیں (جبکہ) پیرک تو گرانا ز کے غموں سے مرا
(اے پیرک) قادری خواجہ تمہاری امانتوں کی حفاظت کرے
تیرے ہاتھ کے خوش الحان (سارنگی) کو کس میراثی کے حوالے کروں
اور وہ پھر کس کی شادی میں اسے بجائے گا؟
تمہارے ہاتھ کے میٹھی بارش برسانے والے آلے کو کس دریا میں پھینکوں
میں اسے لے جا کر کڑمی کی زرد چوٹی پہ رکھوں گا
(اس بلندی پہ) اسے کوئی نہیں دیکھے گا سوائے بلند پرواز بھورے کرگسوں کے
اسے فرشتے بجائیں گے اور بلند پرواز کرگس ہی سنیں گے
میری موت کے دن لا کر مجھے دکھلائیں گے
سوالاکھ پیر (پیغمبر) میری باتوں پہ آمین کہیں
تجھے جنت پہنچا کر وہیں تیرا بسیرا بنائیں
(پیرک) نہ تمھارا کوئی بیٹا ہے کہ جس سے میں کھیل سکوں
نہ تمھارا بدل پیدا کر سکوں گا
کہ جسے اپنے سینے سے لگائے تمھاری یادیں بجھا سکوں
یا الٰہی یہ میں کس عذاب میں پڑ گیا ہوں
جنگِ چمبھڑی کے دن لوٹا کہ سُکھ کی زندگی جیوں گا
نہ جانتا تھا کہ تم بھائیوں کے غموں کا شکار بنوں گا
ہر چھ بھائیوں میں سے اکیلا رہ گیا ہوں

کیا مست کی محبت یک طرفہ تھی؟

مہر، کا دوطرفہ یا یک طرفہ ہونا، ایسے معاملات ہیں جو ماقبل سرمایہ داری نظام میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں لطیفے، ضرب الامثال اور اصطلاحات اسی موضوع پہ وجود میں آتے رہے ہیں۔ اور آج بھی وجود پذیر ہیں۔ غم، درد، الم ناک شاعری، غم ناک گانے.....سب کی سب جاگیرداری نظام کی محبت کی علامتیں ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر محبت دوطرفہ ہے بھی، تو کیا دونوں طرف سے برابری والی ہے یا ایک جانب سے زیادہ اور دوسری جانب سے کم یا بہت کم ہے؟ محبت کے تبصرہ نگار ہر دور میں ترازو اور پیمانے لیے چوک میں برائے فروخت کھڑے رہتے ہیں اور عشق جیسے ماورائی اور پاک جذبے کو آلو ٹماٹر کی طرح ناپ تول جیسے حقیر عمل سے گزارتے رہے ہیں۔ مست کے بارے میں بھی یہ عمل ہوتا رہا ہے۔ اور ہمیں کچھ دانش وروں کے ان سوالات کو بھگتنا اور اُن سے نمٹنا ہی پڑے گا کہ آیا سمو بھی مست سے محبت کرتی تھی؟۔

ہمارا جواب ہے: ''جی ہاں۔ سمو مست سے محبت کرتی تھی''۔

اگلے سوال پر کہ کیا وہ بھی مست سے اتنی محبت کرتی تھی جتنی کہ مست اس سے کرتا تھا؟ ہم ترازو پر لعنت بھیجتے ہوئے، پھر کہیں گے: ''جی ہاں۔ سمو مست سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی''۔

اُن کے وصل کی پہلی ساعت سے لے کر سمو کی رحلت تک سمو نے معاشرتی پابندیوں، گردونواح کی عورتوں اور سنگی سہیلیوں کے طعنوں، اور اپنے خاوند اور سسرالی وقار کے خاک میں ملنے کے خطرات کے باوجود ہمیشہ مست کو اپنے دل کے عرش پہ سجائے رکھا۔ ہر وقت بادلوں سے اُس کی

جائے آوارگی کا، بارش کے قطروں سے ''انہیں کس نے بھیجا'' کا پوچھا۔ ہر وقت، مست کے لیے ''موٹے موٹے آنسو'' لڑی در لڑی بہائے.....

مست اور سمو کا عشق دو طرفہ تھا۔ یہ دو انسانوں کا عشق تھا۔ دو طرفہ، مقدس، ہم پلہ، ہم آہنگ۔ یہ بات البتہ صحیح ہے کہ، بے پناہ قوت والی محبت کی پہلی اینٹ مست نے رکھی۔ اور چوں کہ محبت کبھی بے بر بے ثمر نہیں ہوتی، اور محبت کی بے پناہ قوت محبت ہی کو جنم دیتی ہے، چنانچہ سمو کے اندر مست کے لیے محبت پیدا ہوئی اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے توسط سے ہر ایک انسان سے محبت کی۔ وہ پوری دنیا پر فدا ہوئے اور اس سے محبت کرنے لگے۔ نیز ایک دوسرے سے محبت کرنے کی صورت میں وہ اپنی ذات سے بھی محبت کرنے لگے۔

یہ الگ بات ہے کہ مست شاعر تھا چیخا بہت، مجسم آہ و فریاد بنا۔ مگر عورت سمّو ہلاکت آمیز طوفانی تھپیڑوں کو خاموش سہتی رہی۔ اُسے تو محبت نے وہ طاقت عطا کر دی جس نے اُسے تنہائی کے جان لیوا احساسات پر غلبہ حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی۔ مست پر البتہ عشق کے تعویز نے الٹا اثر کیا۔

محبت کرنے والے اپنی عزتِ نفس سے متعلق بہت حساس ہوتے ہیں۔ ہمارا مست بھی ایسا ہی خوددار عاشق تھا۔ ایک بار مست، سمو کے خانہ بدوش کارواں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت نے کہا: ''کمجات (کم ذات)، تم ہمارے قافلے کے پیچھے کیا مانگتے ہو؟''

تب مست نے یہ آفاقی فقرے کہے تھے۔

ہے ہمانہاں کہ دل زھیریں رنجیئنغاں
ہَے ہمانہاں کہ عاشقانی غیوہ کفاں

ترجمہ:

ہائے ان لوگوں کے لیے جو محبت بھرے دلوں کو خفا کرتے ہیں
ہائے ان لوگوں کے لیے جو عشاق کے معاملات میں پڑتے ہیں

یہ بات بالکل درست ہے کہ دنیا کے ہر عاشق کی طرح مست بھی سمو سے اُس کی جانب

سے کم محبت کی شکایت کرتا رہتا تھا۔ اور سمو ہمیشہ اپنی برستی آنکھوں سے اس کا جواب دیا کرتی تھی۔ ہم مست کی یہ شکایت بھی یہاں درج کرتے ہیں اور محبت کی دیوی سمو کا جواب بھی یہاں نقل کرتے ہیں تا کہ دو پاک روحوں کی باہمی وابستگی کی گہرائی کا اندازہ ہو سکے اور شکوک و فتوے بازی کے شعلے اپنی موت آپ مر سکیں.....نیز ہمارے دل بھی عشق کے زم زم سے دھل جائیں:

حوں منی او شیش ایں دلہ چکا مستغاں
(سمّی) تہ کہ مئیں تُنّی ایں دلہ حالاں سئ نیئے
نَیں کنے پولا نیں سَلامے دیمہ دیئے
(گوں) زہَر نیں ٹوکاں مئیں زہیراں نوخہ کنئے
کاشِذے کیث و دا وثی راستیں قصواں
پَیری گوں درچین ایں جنا گالی بیثغاں
موشریں سیماں دیثہ مں سمو لُڈّ غاں
گوں منی دیما او مری اقرارے کُثاں
گونڈلیں انژزِی گوں زہیرانی زارِہاں
زارِھے کُشتو دستے ماں سرزاناں جثاں
نَیں گنوخ گڑ دی نَیں کہ سہرابی چرّ غاں
سمو شی کایئے مں سرا قربانے کناں
سرترابشکیں دیم گوں درّیں دیذغاں
(تئ) میری ہتھیاراں مں لحیفے توخہ کناں
مں تئ بورا گوں سرہ مَشکاں آو دیاں
تئ حضرتی ریثاں چو قراناں زیارت کناں
استیں زالے آں ہچ ہورا پیلہ نہ یاں

ئیں گنوخ کایئے مں سرا قربانہ کناں
عہد ناں ذالی دست ماں گیوارہ پٹاں
مں تئ آن و تی گنڑا ہچ کسی نہ یاں
عہداں پاریزاں چو قرآنانی اکّھراں
ئیں نیایان و دوست مناں پیغاماں مخاں
باز مں تئ لڈانی پذ ا ڈّکی بیثغاں
(مئیں) پاذاں نال بستہ پہ ڈغارانی ٹیلغاں

ترجمہ:

میرے اجلے دل پہ خون جم کر رہ گیا ہے
سمو تم میرے پیاسے دل کا حال کیا جانو
نہ میرا پوچھتی ہو نہ کوئی سلام پیغام بھیجتی ہو
غصیلی باتوں سے میری چاہتیں تازہ کرتی ہو
(تب) ایک قاصد آتا ہے اور سچی روداد سناتا ہے
پرسوں اُس دُرچین خاتون سے مل کر آرہا ہوں
سرسبز چراگاہوں میں میں نے سمو کو مدھر چال چلتے دیکھا ہے
اس نے میرے سامنے اومری عہد و پیمان کیے
موٹے موٹے آنسو یادوں بھری فریادوں کے ساتھ
وہ فریاد کرتی جاتی اور رانوں پہ دوہتھڑ مارتی جاتی
(کہ) نہ دیوانہ لوٹتا ہے اور نہ پلٹ کر دیدار کراتا ہے
(اس سے کہو) سمو کہتی ہے آؤ میں تم پہ سر قربان کر دوں گی
میرا سر تمہارا ہے، چہرہ مع موتی جیسی آنکھوں کے

تمہارے امیرانہ ہتھیار اپنے لحافوں میں نزاکت سے رکھوں گی
تمہاری گھوڑی کو سر پہ مشک ڈھوڈھو کر پانی پلاؤں گی
تمہاری نورانی داڑھی کی قرآن کی طرح زیارت کروں گی
گو کہ عورت ذات ہوں کسی قابل نہیں
لیکن اب اگر ملو دیوانے، تو سر تم پہ قربان کروں گی
میں اپنی مانگ پہ ہاتھ رکھ کر عورتوں والا عہد کرتی ہوں
میں تمہاری ہوں اور کسی کی نہیں
میں اپنے قول نبھاؤں گی قرآنی الفاظ سمجھ کر
''اب نہیں آؤں گا محبوب، پیغام نہ بھیج
میں نے تمہارے قافلے کے پیچھے بہت تکلیفیں جھلیں
در بہ در ٹھوکریں کھا کر میرے پاؤں اونٹ جیسے بن گئے ہیں''

دل کرتا تھا کہ یہ آخری تین مصرعے نقل نہ کیے جائیں مگر ایک تو ہمیں اس کا حق نہیں پہنچتا اور دوسری بات یہ کہ مست کی نخرے بازی کا یہ خوبصورت اظہار اس کی محبت کے سارے سفر میں ایک نارمل انسانی عمل کا ثبوت ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ مست ان آخری تین مصرعوں کے لحاظ سے ہمیشہ بے قول ثابت ہوا۔ کہ آج تک عشاق ایسے دعوے کرتے چلے آئے ہیں اور پھر یہی قول توڑتے چلے آئے ہیں۔ محبوبہ ذرا نرم پڑ جائے تو عاشق کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر زخمی دل تادیر رہنے نہیں دیتا۔ عاشق واپس ''بندہ'' بن جاتا ہے۔ مست ''بندہ'' بن گیا۔ سمو جیسی چاہنے والی محبوبہ سے کون سنگ دل عاشق، دور رہ سکتا ہے۔ آیئے، ایک اور موقع دیکھتے ہیں جہاں مست کے لیے سمو کی محبت کا موجیں مارتا سمندر چھلکتا ہوا نظر آئے گا:

سمو من دوشی ، دیشہ گوں وہاو و شاد ہاں
سیر سالو کی کر ہ کنت بے دوشیں گذاں

بریخہ کاں چماں گوں ہزار لونیں سیر مغاں
(مں) ویس چریثو بولکئے مہماں بیثغاں
زانتغامن کہ نئیں دلہ بڑّاں گپتغاں
اشتہ مں تڈا گوں گنوخ شلی عقّلاں
شَد بلوچانی کنت ہر جاہے قصواں
بولکا دوستئے لنگھنڑی آ سرگپتغاں
ہے نویثہ کہ دوستہ کاڑداراں گپتغاں
اے گنوخیناں، گوئشتناں، میغانہ، نہ گیڑ
بیا ، نواں پوہ بئے ، تہ گنوخانی ، اٹکلاں
در کفی ، سمو ژہ ، وثی سیری ، حیمہاں
لال تاخانی بوئے پہ رنداں رتکغاں
(گوئشتی) پاذ ا ، او ، دیوانغ ترا درمانے کناں
گندغی اولی کل منی دستا بیثغاں
سوہوی چاٹاں الکہے چیاریں دیثغاں
سملا پرمں گمگمیں انڑزی رتکغاں
دوست منی گرے یئے وہش کنئے جوریں دژمناں

ترجمہ:

سموکورات کوخواب میں شاداں دیکھا
وہ بن سلے عروسی لباس میں ملبوس ہے
ہزارطرح کے سُرموں سے آنکھیں سجاتی ہے
بھیس بدل کر میں اس گھرانے میں مہمان بنا

سمجھ گیا کہ مجھے دل کے جنون نے آن گھیر لیا
پاگل پن میں، میں وہاں سے روانہ ہوا
بلوچ اخلاقیات ہر جگہ باتیں کرتی رہتی ہے
کہ میں دوست کے گھر سے بھوکا روانہ ہو گیا
ذراسی دیر میں دوست کے کارندوں نے آلیا
''یہ دیوانہ ہے ہماری باتیں نہیں مانتا''
آ، شاید تمہیں پاگلوں کو رام کرنا آجائے''
باہر نکلتی ہے سموا پنے خیمہ عروسی سے
لال تاخ کی خوشبو بکھیرتی ہوئی
کہا، رک جا اَے دیوانے تیرا علاج کردوں
پچھلی ساری خطائیں میرے ہاتھ سے سرزد ہو گئیں
عشق کے تھپیڑوں نے تجھے چاروں سمت دوڑائے رکھا
سمو نے میرے لیے موٹے موٹے آنسو بہائے
میری محبوبہ نہ رو، روکر دشمنوں کو مسرت کا موقع دے رہی ہو

پوری تین گواہیاں چاہئیں؟۔ لیجیے ہم ایک اور آفاقی گواہی لا دیتے ہیں۔ مست کی دلکش شاعری سے بڑا گواہ عشق کی وادی میں بھلا اور کیا ہو گا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سمو کتنی دل دار محبوبہ تھی، کتنی نرم دل اور وارفتہ محبوبہ تھی، کتنی باوفا اور مقدس محبوبہ تھی:

مں دہ گوں کڑدے کنگرا کایاں
سملئے لوڈاں زہرنہ گنداں
چے مراذ ے تئی بولکا نندا ں
مں وثی جانئے ولز ہاں بوژاں

ٹنگاں گوں سر لانبا کلیریغاں
گوں کہیرانی سوزتریں سولاں
سملئے لوغانی گُروگیغاں
بانگھاں دوست ودژمنے گنداں
دژمن اِش دیر دھوری دراسٹاں
چوروے شنگین انت منی سنجاں
دوستے پہ تنی ایں دلے زیراں
سنج منی پروئی ءَ سرہ بہایاں
جھٹہ کنت سمو زیری مئے سنجاں
داری گوں تنی ایں دلہ بنداں
مارہ گیر کاری کئے پہ مئے رنداں
گوئستغث مست پہ کلشنڑ وسنداں
تانگرَیں گڑدیں سملہ بیلی
گند نصیوا کہ تانگرا ٹلّی
شاہ بذی آنی بانہڑا بھیلی
مارا گوں لالیں سملا میلی
مہر ژہ دیذوخاں مہ رواثاں
آں دلی بندانہ مہ سنداثاں

ترجمہ:

میں چند دوستوں کے ساتھ آتا ہوں
سمو کی مستانی چال میں غصہ دیکھتا ہوں

کس امید پہ تمہارے پاس قیام کروں
میں اپنے جسم پہ سجے ہتھیار کھول دیتا ہوں
کلیر نامی درخت کی اونچی ٹہنیوں پہ ٹانگ دیتا ہوں
(اور) کہیر کے درخت کی سبز ترین شاخوں پہ
جو سمو کے گھر کے آس پاس اگی ہوئی ہیں
ہر صبح دوست دشمن انہیں دیکھیں
دشمن پوری طاقت سے دور پھینکیں
لڑکے بالے میری گھوڑی کا ساز وسامان تتر بتر کر دیں
اور دوست چاہت بھرے دل سے انہیں اٹھالائیں
میری گھوڑی کا ساز وسامان پروئی قبیلے کے سر کی قیمت ہیں
لپک کے سمو اٹھالیتی ہے میرا ساز وسامان
اپنے پیا سے دل سے لگا کر رکھتی ہے
مجھے یاد کرتی ہے میرے پیچھے پیچھے آتی ہے
''مست دلدلوں میدانوں سے گزرا ہے
کہاں ہے حسین سمو کا ساتھی
معلوم نہیں کہاں بھٹک رہا ہوگا؟''
شاہ بدخواہوں کا گھر اجاڑ دے
اور مجھے میری سمو سے ملا دے
محبت آنکھوں سے دور نہ ہو جائے
اور دل کو جڑوں سے نہ اکھاڑے

مست کی یونیورسٹیاں

مست نے اپنی ساری زندگی سموکی جدائی میں بتادی۔ ہجر کے ہول ناک غموں نے مست کا پوراوجود زخمی زخمی کردیا۔ اس نے طلب کی اندو ہناک راتیں آہوں اورفریادوں میں گزاردیں.....فراق کی تکالیف تھیں کہ ہرلحظہ بڑھتی جاتی تھیں۔مست نے اپنے دکھوں کے علاج کی بے شمار کوششیں کیں،مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔طبیبوں حکیموں،ملاّؤں کے پاس کوئی علاج نہ ملا۔ جب مقدار میں بہت زیادہ اور مدت میں بہت طویل رنج اورغم اس کے بس سے زیادہ ہوتے تو مست کوہستان کے دل گیر علاقوں سے باہر نکلتا اور دور دراز علاقوں تک بھاگتا پھرتا۔ یہ بے چین جوگی داخلی سکون کی تلاش میں چلتا ہی رہتا۔ چنانچہ،سفر وحضر اس کی زندگی کا مستقل مظہر بن جاتے ہیں۔اورعشق کا یہ ہول ٹائمر،سفر کا بھی ہول ٹائمر بن جاتا ہے۔

اب ہم ایسے گم ہوئے ، پریم نگر کے شہیر (شہر)
اپنے آپ نوں سودھ رہے ہیں نہ سر ہاتھ نہ پیر

ایک شاعر،ایک دانش ور کی حیثیت سے مست کو اپنے بے شمار سفروں کے دوران بہت اہم فوائد حاصل ہوئے۔ وہ اس جہاں گردی کے دوران فطرت کے مناظر دیکھتا ہے،ان مناظر کی مستقل متغیر نوعیت کو دیکھتا ہے، اورموسموں کے تغیر وتبدل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ ہر علاقے کے مخصوص حشرات،نباتات اورعلاقائی وجغرافیائی ساخت پہ حیران ہوتا ہے۔ بارشوں، میٹھے پانی کے چشموں،جنگلی میووں اور، شکار کی نوعیت اُسے اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی۔اس کے علاوہ اسے اپنی

طویل مسافتوں کے دوران ہرجگہ کے انسان کے مخصوص وضع قطع،لباس،موسیقی،شاعری،اوررسوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان کاری حاصل ہوتی رہی.....

شعوری پختگی کے لیے یہ بہت ہی اہم مدارس ہوتے ہیں !!ایک دانش ور، شاعر اور فلاسفر کے فکری ارتقا کے لیے یہ بہت ہی اہم مکتب ہوتے ہیں۔

ایک اور فائدہ مست کو یہ ہوا کہ ان کثیر اور طویل سفروں کے دوران اُسے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے دانش وروں،شاعروں،فلاسفروں،اورصوفی منش بزرگوں کی صحبت میسر آئی،ان سے بحث مباحثوں اور تبادلہِ خیال کے بے شمار مواقع ہاتھ آئے۔وہ گوشہ نشین عارفوں اور چلتے پھرتے سالکوں کی صحبت میں حال وقال اورشعرونغمہ کی محفلوں سے لطف اندوز ہوا۔وہ جنگل جنگل،صحرا صحرا وادی وادی بستی بستی گھوما اورقدرت کے بکھرے اوارق کا عمیق مطالعہ کیا۔اور پھر انھیں مفصل انداز میں شعری معیار کے ساتھ بیان کیا۔اس وسیع سیاحت نے اس کا مشاہدہ بڑھایا،اس کی بصیرت کو وسعت دی اوراس کی شاعری کو مالا مال کردیا۔

دلچسپ بات ہے کہ وہ بہت زیادہ ہم سفر ساتھ نہ لیتا تھا۔سموساتھ ساتھ رہتی تھی کہ وہ تو منزل بھی تھی اور ہم سفر بھی۔لیکن مجسم انسانوں میں وہ چتو اں ، بہار خان، درخان براہمانڑیں اورایک دودیگر لوگوں کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کرتا۔اس مجنوں کے ہمسفر بہت خال خال ملتے ہیں۔ظاہر ہے کہ مست کی ہمسفری کا اعزاز وہی پائے جواُس کا اہل ہو۔اوراہلیت کی سطح وہ ہے:

جہاں پہ عشق کی سرحد جنوں سے ملتی ہے

چنانچہ مست یا تو کونجوں کے ہم سفر رہا یا پھر نظاروں،خوشبوؤں اور بادلوں بارشوں کا ساتھی۔ان عجائباتِ فطرت کے ساتھ وہ ایک خاموش اورغیر فعال ہم سفر نہ رہا بلکہ مست ان کی ہم رکابی میں ان کے ساتھ سبک گامی کے مقابلے میں، مسابقت میں، رہتا۔اس طرح دورانِ سفر وہ زیادہ تر فطرت کے ساتھ ہم فکر، ہم آہنگ اورہم کلام رہتے ہوئے دوستانہ مقابلے بازی میں جتا رہتا۔مست بلاشبہ بلوچی زبان کا وہ پہلا اور بہت بڑا شاعر ہے جس نے وسیع سیر وسیاحت کے دوران پیش آنے والے سارے واقعات کو بہت باریکی سے موضوعِ سخن بنایا۔اُس کی شاعری میں

جس طرح سماجی اور مجلسی زندگی کی بھرپور عکاسی ہے، اسی طرح بلند و بالا پہاڑوں اور قدرتی مناظر کی خوب صورت منظر کشی بھی ہے۔

یوں اپنے پیروں کو ستانے سے محروم رکھنے والے مست کا انسانوں کے ساتھ بہت عمیق اور سیر حاصل رابطہ ہوتا اور زبردست دانش ورانہ لین دین ہوتی۔ مست کے ان بحث مباحثوں، مناظروں اور معلومات کے سرچشمے مندرجہ ذیل رہے تھے:

1۔خیر و خیرات گاہیں

2۔جشن و تقریبات

3۔وڈیرہ یا سردار کی اوطاق

4۔دانشوروں فلاسفروں کی درگاہیں

****

1۔خیر و خیرات گاہیں

دورانِ سفر کسی بھی علاقے سے گزرتے ہوئے وہاں کے خانہ بدوش لوگ مست کو مجبور کرتے کہ وہ اپنا سفر عارضی طور پر توڑ ڈالے اور ایک آدھ پہر کے لیے اکٹھ کا بندوبست کر کے اُس کے بیچ رہے۔ ایسے مواقع ایک تو اُس وقت آتے جب کسی کو مست راہ چلتے نظر آئے، اور اس نے اسے رکنے کی درخواست کی کہ اپنے مقدس ہاتھوں سے ایک آدھ مویشی پہ خدا کے نام خیرات کی چھری پھیر دے۔ اپنے بابرکت ہاتھوں سے اُن کے لیے دعا کر دے۔ اور چند لمحے ان کے خیمے اور ان کے علاقے کو اپنے قدموں سے برکت بخشے۔ جب مست بالآخر راضی ہو جاتا تو آس پاس سے دوسرے خانہ بدوش لوگ بھی کندھوں پہ اپنا سب سے موٹا تازہ مویشی اٹھائے اس جگہ پہنچ جاتے اور مست کی نورانی موجودگی میں خیرات کرواتے۔ فیض و سرخوشی کا ایک قسم کا میلہ منعقد ہو جاتا۔ جنگل کے اس منگل میں گوشت خوری کے علاوہ موسیقی ہوتی، حال حوال ہوتے، جھگڑوں تنازعوں کے فیصلے ہوتے، سمو کے لیے توصیف و ثنا بھری مست کی شاعری سنی جاتی اور خیر، برکت، بارش،

امن، نرینہ اولاد اور رزق کی فراوانی کی دعائیں منگوائی جاتیں۔ دشمنوں، بھیڑیوں، اور بدروحوں کا صفایا کرنے کی مناجات کرائی جاتیں۔

دلچسپ اور دانش بھرے اس انسانی اشرف اجتماع کے بعد مست پھر اپنا سفر جاری رکھتا، اور خانہ بدوش لوگ پھر اپنی زندگانی کے روز و شب میں لوٹ جاتے۔

اسی طرح اگر خود اُسے کوئی خواب، کوئی آگاہی ہوتی تو وہ میلہ منعقد کرواتا۔ یا وہ کہیں پہ اچانک رک جاتا، پتھروں کو لائن میں رکھ کے ایک ''مسجد'' بنوا لیتا۔ کسی درخت کے گھنے سائے میں فراق کی اپنی دا سوز شاعری الاپنے لگتا۔ بارشوں کے لیے ترستی سرزمین کو سیراب کرنے کی تمنا میں خدا کے تئیں اپنے لاڈلے ہاتھ اٹھاتا۔ محفل تو خود بخود بن جاتی۔ عوام تو فوراً رنگ جاتے ہیں اپنے من پسند اور معتبر رنگ ساز کے رنگ میں۔ اس کے علاوہ ''سمو کی شادی ہے'' جیسا مستقل موضوع تو موجود ہی تھا۔ لوگ رضا کارانہ اپنے مویشیوں کے گلے مست کی ''نو گیز'' نامی چُھری کے حوالے کرنے حاضر ہو جاتے۔ الغرض ہزاروں محرکات ایسے ملتے جہاں فی الفور اور فی البدیہہ انسانی اکٹھ کا بندوبست کر لیا جاتا۔

دانش ور کے لیے اس طرح کے اجتماعات کتنے ضروری ہوتے ہیں، یہ کسی دانش ور کسی شاعر سے پوچھیے۔

2۔جشن و تقریبات

مخصوص و متعین تاریخوں اور مقامات پر منگنی، شادیاں، ششغان، اور تھور جیسی تقریبات میں مست کو ضرور بلایا جاتا۔ اور بہت بار تو مست کی موجودگی ہی کو ایسی تقریبات کی تاریخ گردانا جاتا۔ اکٹھ میلے پر تو بلوچ عاشق ہے۔ آبادیوں سے دور، تنہا، خانہ بدوش گھرانہ انسانی اجتماع کے لیے ترستا رہتا ہے۔ بس ایک بہانہ چاہیے وہ میلوں دور سے چل کر اجتماع میں جائے گا۔ اور ثقافتی تبادلے کی اپنی مخصوص انسانی ضرورت کی تشفی کرے گا۔ چنانچہ مست پہ مرکوز ان میلوں اور تقریبات میں بھانت بھانت کے لوگ دور و نزدیک سے جمع ہوتے۔ حال حوال، قبائلی

رقص، کھیلوں کے مقابلے، موسیقی اور شاعری، ایسی تقریبات کی جان ہوتیں۔ ثقافتی سرگرمیاں عروج پر ہوتیں اور مست زبردست صحت مند فکری لین دین کرتا۔ دے بھی بہت کچھ جاتا اور اخذ بھی بہت کچھ کرتا۔

3۔ وڈیرہ یا سردار کی اوطاق

مست توکلی کے زمانے میں قبیلے کا سردار ابھی تک بچے کچھے قدیم کمیونزم کے کمیون کا سربراہ بھی ہوا کرتا تھا۔ آج کا موجودہ فرسودہ اور گلا سڑا سرداری نظام، اُس وقت کی سرداریت سے بالکل متضاد اور متعفن ہے۔

سردار کے ہاں ہر علاقے اور قبیلے کے لوگ آتے۔ بالخصوص فریقین اپنے جھگڑوں اور تنازعات کے لیے عدالتی چارہ جوئی کرنے سردار کے پاس آتے، اس کے علاوہ رات پڑ جانے پہ مسافر شب بسری کرتے، بیوپاری لوگ گھوڑے، تلواریں، اشیائے خورد و نوش اور کپڑے فروخت کرنے آتے، اسی طرح قاصد آتے جاتے اور سردار کے ''اوطاق'' کی چہل پہل کا سبب بنتے۔ ان کے علاوہ تفریح طبع کے لیے کوئی نہ کوئی شاعر، داستان گو، اور موسیقار ضرور موجود ہوتا۔ قبائلی جنگی امور سے وابستہ لوگ ہمہ وقت موجود رہتے۔ اسی طرح سردار کے ہاں مشیر، ماہرینِ موسمیات، شانے کی ہڈی پڑھ کر پیش گوئی کرنے والے دست شناس، چراگاہوں کے کھوجی، تاریخ دان اور فہمیدہ لوگوں کا ہر وقت آنا جانا رہتا۔ مست جیسے دانش ور کو تو اپنی فکری خوراک کے لیے ایسے اجتماعات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے تو مست نے اس ٹیچنگ مٹیریل کو خوب خوب استعمال کیا۔ اُس کا ایک طرف تو اپنے قبیلے یعنی مری کے ہر سفید ریش کے پاس آنا جانا تھا، تو دوسری طرف وہ دیگر قبائل مثلاً بگٹی، لیغاری، مزاری، کھیتران اور گشکوری قبائل کے سرداروں کے بھی گھر کا معزز فرد شمار کیا جاتا۔

مست کے زمانے کے چیدہ چیدہ سردار، معتبرین اور سفید ریش ہم عصروں کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے:

قادر بشک کھیتران

کھیتران قبیلہ مری قبیلے کا مشرقی پڑوسی ہے۔ مست کے زمانے میں اس قبیلے کا سفید ریش قادر بشک تھا۔ سارے سرداروں کی طرح یہ بھی انگریز کا یار تھا۔ قادر، مست کا بہت عزیز دوست تھا۔ بلکہ وہ مست کو ''اڈا'' (بڑا بھائی) کہتا تھا۔ جب مست روزے رکھتا تو قادر بھی روزے میں ہوتا۔ مست جب بھی لیغاری، مزاری، اور بزدار قبائل یا سخی سرور کے دربار آتا جاتا تو کھیتران قبیلہ راستے میں پڑتا۔ یوں قادر کھیتران کا گھر مست کا پڑاؤ ہوتا۔

کوہِ جاندران پہ ''مستہ تل'' نامی ایک جگہ ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا غار ہے۔ اس میں مست نے بلیاں کاٹ کر کھڑی کر دیں اور کہا کہ ''اب یہ غار نہیں، سمو کا گھر، سمو کا خیمہ ہے''۔

آیئے مست و قادر بشک کی بابت مائتھالوجی میں رنگی کچھ باتیں ہو جائیں:

ایک بار قادر نے مست سے کہا: ''دشمن میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ لوگ میری سرداری چھین لیں گے، میرے لیے دعا کرو''۔ مست نے اس سے کہا: ''پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تمھاری سرداری کو خطرہ ہے۔ چلو چل کر سمو کو خبر کرتے ہیں۔ وہ ہر روز مغرب کے وقت اِس خیمے میں آتی ہے۔ تم اسے فریاد سنا دینا''۔

الغرض مغرب کے وقت وہاں ایک خاتون آئی، قادر نے اپنی فریاد سنائی۔ سمو نے کہا، ''جاؤ، تمھاری سرداری جاری ہوگی''۔

اس گھرانے کی سرداری اب تک جاری ہے اور مرحوم حاجی بختیار خان سومرانڑیں نے زور دے کر مجھے کہا تھا کہ ''یہ سرداری قیامت تک جاری رہے گی''۔

مجھے مست کی دعا کے برحق اور مقبول ہونے پر رتی بھر بھی شبہ نہیں۔ مگر میں یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ کھیتران قبیلے کے سرداروں کو اپنی سرداری برقرار رکھنے کے لیے خود میں کس قدر تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ یہ ادارہ نہ صرف ختم ہوگا بلکہ اس کا نام بھی میوزیم کی الماریوں کے حوالے ہو جائے گا۔ ہاں مست کی دعا والی بات حقیقت ہے تو اس خاندان کے چشم و چراغ عوامی بہبود کے کارواں کے سربراہوں کی صف میں ضرور ہوں گے۔ لازم ہے کہ بلوچستان کی ساری

سرداریاں اِس طرح ڈھل جائیں کہ وہ عوام الناس کے خیرو برکت کے سرچشمے ہوں۔ وگرنہ تو ''ویبقی وجہ ربک''۔

اے میرے معزز قاری! سمو کے نام کا یہ خیمہ آج تک موجود ہے۔ جب بھی لکڑیاں پرانی ہوجاتی ہیں تو عوام نئی بلیاں لاکر وہاں لگا دیتے ہیں۔ بھلا سمو کا خیمہ بھی کوئی پرانا ہونے دے گا!!۔ بھلا عشق کا ٹھکانہ بھی کوئی برباد ہونے دے گا!

ایک دن قادر کھتیر انڑ نے کہا: مست دعا کرو کہ میری کنڈھی (خمدار گردن والی) نیلی گھوڑی ہمیشہ گھڑ دوڑ کے مقابلوں میں سب سے آگے نکل جایا کرے''۔ مست نے کہا ''لاؤ میں اس پر ہاتھ پھیر دوں گا''۔ اُس نے اس پہ ہاتھ پھیرا اور یوں کہا:

قادرئے کنڈھی شلوخیں
سملئے بیلی گنوخیں

ترجمہ:

قادر کی کنڈھی تیز رفتار
سمو کا دوست مجنوں

اور کہتے ہیں کہ پھر قادر کی گھوڑی کبھی بھی گھر دوڑ میں پہلی پوزیشن سے نیچے نہ آئی۔ ہمیشہ نمبر ون۔

سڑدار امام بشک مزاری

مست کا مزاری قبیلے کے اس سردار کے پاس بھی بہت آنا جانا رہتا تھا۔ سردار امام بشک مزاری انگریزوں کا بڑا خیرخواہ تھا۔ انگریز اُس کے بہت شکر گزار تھے کہ اس نے 1870 کی دہائی میں خان قلات اور اُس کے سرداروں کے بیچ مصالحت کرائی تھی، اس نے مری بگٹی کو انگریز کے ساتھ جنگ نہ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ سنڈیمن اُس کے قبیلے کو ملیشیا میں بھرتی کر چکا تھا۔ امام بشک اس کے لیے گھیر گھیر کر سردار لاتا۔ وہ بلوچ سرداروں کے بین الصوبائی ٹرائبل جرگہ کا صدر تھا اور پنجاب لجسلیٹو

کونسل کا ممبر تھا۔ یہ عہدہ اُس وقت کوئی معمولی عہدہ نہ تھا۔ 1888 میں اسے Knighthood عطا ہوا۔ بعد میں وہ نابینا ہوا اور 1904 میں اس کا انتقال ہوگیا۔

دیگر بلوچ سرداروں کی طرح اس سردار کی مہمان نوازی بھی مشہور تھی۔ کہتے ہیں کہ روجھانڑ میں مہمانوں کے لیے دو سو بستر بہ یک وقت تیار رکھے ہوتے تھے۔ لیکن پھر بھی بسا اوقات اس قدر ہجوم ہوتا کہ مہمانوں کے لیے خیمے نصب کرنے پڑتے۔ مست اس کی روایتی بلوچیت اور اُس ساتھ اپنے تعلق کا یوں ذکر کرتا ہے:

مست مروشی مس باغچیں سندھ ئیں
واڑہئے سلطانیں سرہ جندیں
گوئر امام بشک پوترویں رندئیں
مہڑاں دور مانڑیں مزاریاں
درستاں مس تعظیماں بلوچی آں

ترجمہ:

مست آج سرسبز سندھ میں ہے
اس کا مالک خود خدا ہے
وہ رند کی اولاد امام بشک کا مہمان ہے
مالی طور پر خوش حال مزاری معتبرین کے پاس
سب بلوچی روایات کے مطابق مست کی عزت کرتے ہیں

ایک بار مست جب روجھانڑ میں نواب امام بشک مزاری کے ہاں تھا تو اُس نے فرمائش کردی کہ مہمان خانے کے دروازے کے سامنے سیمنٹ کی دو کرسیاں بنادی جائیں۔ ایک کرسی سمو کی ہوگی اور دوسری اُس کے لیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ مست اور سمو کی ان دونوں کرسیوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ (مزاری قبیلہ کے ہمارے دانش ور دوست کوشش کریں تو یہ کرسیاں اب بھی مرمت و تعمیر ہوسکتی ہیں!!!)۔

سبی میلہ یا شاہی دربار ہر سال سردیوں میں منعقد ہوتا تھا اور پانچ سات دن جاری رہتا۔ بلوچستان کے تمام سردار، معتبرین یہاں جمع ہوتے۔ مویشیوں کی منڈی لگتی، گھڑ دوڑ، نشانہ بازی، اور کھیلوں کے مقابلے ہوتے۔ اور ایک جشن و میلہ ہوتا۔ مست بھی انھی دنوں یہاں آ نکلا تھا۔ نواب امام بشک مزاری بھی اپنے قبیلے کے معتبرین کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ نواب کے ہاں رات کو محفل ہوا کرتی تھی۔ ایک رات ایک ایسی ہی محفل میں مست چند اشعار سنانے کے بعد کہنے لگا: ''میں زیادہ نہیں سناؤں گا۔ میرے اشعار کہیں قبر میں سمو کو بے چین نہ کر دیں''۔ مست اسی وقت مجلس سے اٹھا اور سبی کے بہت بڑے جنگل کے راستے سے شیہہ کٹی کی قبر پہ گیا جو کہ سبی کے شمال مغرب کی جانب بیجی دریا کے کنارے پہ واقع ہے۔

بلوچی کے ممتاز گلوکار تاج بلیدی مزاریوں کے علاقے میں رہتا ہے۔ اور وہاں مست کا آنا جانا ہوا کرتا تھا۔ اس لیے وہاں اُس سے متعلق بہت ساری عوامی روایتیں ہوں گی، اُس سے منسوب بہت ساری کہانیاں ہوں گی، یا اُس کا ایک آدھ گم گشتہ شعر یا مصرعہ ہوگا۔ میں نے اُس سے درخواست کر رکھی تھی کہ ایسے موتی اگر ملے تو ہمیں اپنی کتاب کے سلسلے میں عنایت کرے۔ ہمارے ہر روای کی طرح وہ بھی بے شمار باتیں، جمع کر کے لایا۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جو دوسرے علاقوں سے بھی منسوب تھیں، اور جنھیں ہم پہلے کتاب میں جگہ دے چکے تھے۔ ایک خوب صورت روایت وہ لایا جو ہمارے علاوں میں موجود نہ تھی۔ آپ بھی پڑھیے:

ایک بار مست سردیوں کے موسم میں امام بشک مزاری کے ہاں مہمان تھا۔ وہ رات کو کھلے میں سوتا تھا اور کوئی لحاف وغیرہ نہیں اوڑھتا تھا۔ رات کو جب وہ سویا ہوا تھا کہ سردار کے ملازموں نے آپس میں گفتگو کی اور اس سخت سردی میں مست کی حالت پہ ترس کھا کر ایک رضائی اُس پر اوڑھا دی۔ کہتے ہیں کہ ذرا سی چیر میں مست تھر تھر کانپنے لگا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ سب لوگ جاگے خود سردار جاگ کر اُس کے پاس آیا۔ ملازمین اور دیگر مہمانوں مسافروں سے پوچھ گچھ کی تو سوائے اُس رضائی اوڑھانے کے اور کوئی بات نہ تھی۔

سردار نے مست سے پوچھا تو اس نے کہا کہ سردار میں تو آرام سے سویا ہوا تھا۔ پھر کسی

نے مجھ پہ رضائی ڈال دی۔ کچھ ہی دیر میں سمو آئی۔ اس نے بہت ہی غصہ سے کہا، ''مست تم تو کہتے تھے کہ تمہارا میرے بغیر کوئی نہیں۔ میں ہی تمہاری دوست، بہی خواہ اور ہم درد ہوں۔ میرے بغیر تم بے کس ہو..... مگر آج معلوم ہوا کہ تم تو وارث والے ہو، تم بے کس نہیں میرے علاوہ بھی تمہارے ہم درد موجود ہیں۔ لہٰذا میں میں اپنے سر کی چادر واپس لے جا رہی ہوں۔

یوں سردار وہ اپنی چادر مجھ پر سے اتار کر لے گیا اور سردی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ تمہاری رضائی وغیرہ اس سائبیریائی سردی کو بھلا کیا روکتی!!

محمد خان گشکوری

گشکوری صاحب سردار نہ تھا، شاعر تھا۔ اُس کے ساتھ بھی توکلی مست کے بڑے سلام و نیاز والے تعلقات تھے۔ محمد خان سبی میں ''مل'' نامی مقام پر رہتا تھا۔ وہ 1920 میں ایک سو بیس برس کی عمر میں فوت ہوا تھا۔ وہ خود بھی بہت بڑا شاعر تھا۔ اور مست کے اشعار بھی اُسے خوب یاد تھے۔ دو شاعروں کا اکٹھ۔ (سبی سے لے کر ڈیرہ غازغان میں محض دو شاعر!! کتنے قیمتی اور خال ہوتے ہیں لعل و جواہر!!)۔

بھنگاں پہ ہنر پاریزیں
(کہ) بھنگ پئے کوہ سراں نایا تاں

سڑدار مرتضےٰ خان بگٹی

توکلی مست کا ہم عصر نواب مرتضےٰ خان، اُس قبیلے کا سردار تھا۔ مرتضےٰ خان، سردار سلام خان کا بیٹا تھا۔ وہ 1858 میں سردار بنا۔ امام بشک مزاری کے ہاتھوں یہ نواب بھی سنڈیمن کے دربار پہنچا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔

گوئستغاں کڑ دے روش اوو نیا ما
گوئرا میر گند یں مرتضےٰ خانا

ذات زر کا نڑ یں تنگویں خانا
سرمہ شفا ثا ں عا قلیں دانا
مارا ماناتکہ اژ وثی جانا

ترجمہ:

اس درمیان کچھ دن گزرے
میں وجاہت بھرے مرتضٰی خان کے پاس تھا
جو کہ بگٹی قبیلے کا پیارا سربراہ ہے
خدا کرے عاقل ودانا لوگ کبھی غلطی نہ کریں
اس نے اپنی جان سے زیادہ مجھے عزیز رکھا

سڑ دار گزیں

گزیں، مست کے زمانے میں مری قبیلے کا سردار تھا۔ظاہر ہے ایک روایتی بلوچ سردار، جہاں کا سماج ابھی ابھی قدیم کمیونزم سے ارتقا کر رہا تھا۔ وہاں اب سردار کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر متحرک وسرگرم ہونے کی بہ نسبت اُسے روحانی طور پر بزرگ اور ولی سمجھا جانے لگا۔

انگریز نے آکر اس معمر شخص کی مزاحمت کا مزہ بھی چکھا۔مگر آخر میں سردار گزین خان خوداوراس کے 20 گھڑ سوار انگریز کے ملازم ہوگئے۔

گزیں سردار نور محمد کا بیٹا تھا۔وہ بیمار اور کم زور شخص تھا۔گزین کا انتقال 1876 میں ہوا۔چوں کہ وہ لاولد تھا، اس لیے سرداری اس کے بھائی مہراللہ خان نے سنبھالی۔

سردار گزین کے ساتھ مست کا رابطہ روحانی تھا۔بلوچ مائتھالوجی کے مطابق مست کے بہت ہی عزیز اور پیارے بھائی پیرک کی موت کی اطلاع بھی تو گزین ہی دے سکتا تھا اور وہ بھی ایسے Air mail کے ذریعے جس میں نہ کمپیوٹر کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فائبر آپٹک کی۔

کا غذے آتکہ گوں ہزاریں لکھ و پڑھاں
پیر کہ موث او گون انتی گزینہ سلام

ترجمہ:

ایک خط آیا بہت تفصیل والا
پیرک کی موت لکھی ہے اس میں اور گزین کے سلام

سڑدار مہر اللہ (اول)

سردار مہراللہ خان بھی، مست کا ہم عصر تھا۔مہراللہ خان سنڈیمنی دور کے عروج کے وقت مری کا سردار تھا۔اس کا بڑا بھائی گزین خان زندہ تھا۔اصل سرداری تو اُسی کی تھی مگر اس نے بیماری اور کم زوری کے سبب خود کو قبائلی امور تک محدود کر رکھا تھا۔سردار مہراللہ خان کو 1889 میں نواب کا خطاب ملا۔

مست ہر سردار کی طرح مہراللہ سے بھی نہایت دوستانہ تھا۔پُرامن بقائے باہم۔

چیارمی روشا کانہلو شہرا آتکغاں
مہر اللہ خانا گوانک جثو گڑ دینتہ مناں

ترجمہ:

چوتھے دن میں کاہان شہر پہنچا
مہراللہ خان نے مجھے بلا کر اپنا مہمان بنا دیا

سڑدار دوداخان

طبقاتی سماج میں داخل ہونے کے وقت مری قبیلہ (بلکہ سارے قبیلوں) کے سردار کی ایک حیثیت درویش اور ولی اللہ کی بھی تھی۔جیسے کہ سارے بادشاہ اللہ کا سایہ ہوتے تھے، اسی طرح قبائل کے سربراہ بھی خدا کی طرف سے معزز ومقرر کردہ تصور ہوتے تھے۔چنانچہ مست کے ہم عصر سارے مری سردار، درویش اور ولی اللہ ہوتے تھے۔دوداخان بھی۔

کاہان پر انگریزوں کی چڑھائی کی خبریں آ رہی ہیں وطن سے دور ہوں، کس سے پکی خبر پوچھوں۔تب:

مار ماں وہاوا آتکغہ دودا درمیاں
زیث کن وگڑد کہ گپتغا کاہاں کافراں

ترجمہ:

تب میرے خواب میں دودا خان آیا اور کہا:
''جلدی جلدی واپس آ جاؤ، کاہان پر کافروں کا قبضہ ہو گیا''۔

ڈیوا پوادی

مری قبیلے میں مست کا ایک اور معتقد ڈیوا پوادی تھا۔ یہ سردار نہ تھا۔مست اُس کے ہاں اکثر قیام کرتا۔اُس نے پیار سے اُس کا نام ''کوکین'' رکھا تھا۔ایک بار اس نے مست کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کے رزق میں برکت کے لیے دعا کرے۔مست نے کہا، ''ایک بڑی میخ لاؤ''۔ میخ لائی گئی، کہا، ''اس کو اپنے گھر کے احاطے کے وسط میں ٹھونک دو''۔ چنانچہ میخ گاڑ دی گئی۔مست نے کہا کہ ''جب تک میخ زمین میں گڑی رہے گی تم بھوک وافلاس نہیں دیکھو گے''۔روایت ہے، اُس دن کے بعد ڈیوا کے کنبے میں رزق کی کمی کبھی نہیں ہوئی ہے۔

(پتہ نہیں لوگ ایسی باتوں پر کیوں یقین کرتے ہیں؟۔اور ایسی روایتوں کو مقدس امانتوں کی طرح سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں تک کیوں پہنچاتے ہیں۔اور اگلی نسلیں تمام تر سائنسی نقطہ نظر رکھنے کے باوجود ان سے لطف اندوز کیوں ہوتی ہیں؟۔ان پر کتابیں لکھ کر دوسرے لوگوں میں کیوں پھیلاتی ہیں؟)۔

شاذی ھاں، اور، وزیر سومرانڑیں

یہ دونوں سردار نہ تھے، بلکہ ماوند کے دستار بند وڈیرہ تھے۔شاذیہان اور وزیر سومرانڑیں مست کے بہت قدردان اور ماننے والے تھے۔مست بھی ان سے اپنی ساری مدد امداد، فرمائشیں اور

دوستانہ احکامات دینے میں نہیں ہچکچاتا تھا۔

شاذ یھاں شاروءَ لوغ اث دھیغ اُشش مس گُرا
مٹے پہ دیما ہژل اث گوں ہذائی قدرتا

ترجمہ:

شاذیہان دانش کا گھرانہ ہے ان کے سر پہ ذمہ داری ہے
دشمن ان کے سامنے ہمیشہ شکست کھاتا ہے خدا کے حکم سے

اسی شاذیہان سے مست نے کٹھن چٹانی راہوں میں سے پیدل چلنے والوں کے لیے شارٹ کٹ راستے بنوائے:

مئیں سلاماں دئے توپہ ماڑی آ
شاذیھاں نشتی اے قراری آ
پیاذغاں دگ گوئنڈیں شکاری آ

یوں دکی اور ماوند کے درمیان ''شکاری'' نامی چٹان پر کدالوں کے ذریعے راستہ بنایا گیا تھا۔(مست اپنے تمام دوستوں بہی خواہوں پہ پیار کے نام رکھتا تھا۔شاذیہان کو وہ ''توپہ ماڑی'' کہہ کر پکارتا تھا)۔

بہت ہی لحیم شحیم اور فربہ، وزیر خان کو مست نے ایک میلے میں زبردستی دوڑ کے مقابلے میں شامل کروا دیا اور کرامت کے زور سے جتوا کر ''کھڑا تھڑا ئیں پائے'' (پوری چونی) انعام دے دیا۔آج بھی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مری قبیلے میں دوڑ کے مقابلے میں جیت ہمیشہ وزیر کے آل اولاد کی رہے گی۔(وزیر کا نام مستیں توکلی نے 'گڑ ریش' یعنی گول داڑھی والا، رکھا تھا)۔

بہار خان سومرانڑیں

بہار خان کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔وہ مست کا بہت گہرا دوست تھا اور اکثر موقعوں پر مست کے ساتھ سفر میں ساتھ ساتھ رہا۔

تریٹشہ مسکانی ملنگ ہوتیں
زی بہارخاں ما چرّ غادیشہ
اغ ترا مڑدی کینغے مانیں
بیاکہ تئ دوستئے پُل پیغامیں
سمل تئ سُر چمیں پریشانیں

ترجمہ:

مجھے خوشبوؤں بھرا، جری اور بہادر ملنگ ملا
(کہ) کل ہم نے بہارخان کو پھرتے دیکھا
اس نے کہا اگر تم میں مردانہ وقار موجود ہے
تو تمہیں تمہاری محبوبہ کا پھولوں جیسا پیغام دوں
تمہاری سرخ آنکھوں والی سمل تمہارے لیے اداس ہے۔

بہارخان اُس کا لنگوٹیا دوست تھا۔ باہم رازدان و رازدار دوست۔ نوجوانی اور نوجوانی کے کاموں کے دوست۔ یہ وہی بہارخان ہے جو ہر آڑے وقت مست کے کام آتا تھا:

کارکنّیں تئیں گوں گنوخ شلّی ہلمہاں
نیم شفی پا سے مس کچھیں ماونداروان
حالہ داں کوٹی زہر نیں ورنائے براں
میر بہارخانئے سوڈھی یہ ڈکّیں لُڑاں

ترجمہ:

ہم نے اپنی مجنونانہ حرکتوں سے کام بگاڑ دیا
میں آدھی رات کو ماوند جاتا ہوں
یہ خبر مکان میں رہنے والے غصہ ناک نوجوان تک لے جاتا ہوں
میر بہارخان کی کاٹ ڈالنے والی تلوار تک

یا.....

ھیر گوئر بہارخانئے لڑیں تیغاں
سُورہابر جاہ بی ہمو گیغاں

بلوچاں سومرانڑیں

مست توکلی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بچپن میں ہی ماوند آیا۔ بلوچان نامی سومرانڑیں ایک غریب پرور انسان تھا، اس نے ہی مست کی پرورش کی۔ مست اپنے محسنوں کو اپنی شاعری میں اس طرح یاد کرتا ہے:

گوئر بلوچانا دعائیں ملخانی
آسر و اومیشے گریوانی
سرجمیں شاذیھاں کلاتانی
تامیناں باشیل بور بناتاتی

ترجمہ:

بلوچان کو فرشتوں کی حمایت حاصل ہے
وہ غریبوں کے لیے آسرا اور امید ہیں
(وہیں) قلعہ اور فصیل کا مالک شادیھان بھی ہے
جواں مرد باشیل بھی وہیں ہے

کرم خان قلندرانڑیں

مست نے اپنی شاعری میں ایک جگہ شکایت لے کر کرم خان کے پاس جانے کا کا تذکرہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قبیلے میں اثر ورسوخ کا مالک تھا۔ غالب امکان یہ ہے کہ کرم خان، قلندرانڑیں مری تھا۔

سڑدار جمال خاں لیغاری

جمال خان، لیغاری قبیلے کا سردار اور حالیہ فاروق لیغاری کا دادا تھا۔ انگریز کا دور تھا۔ امام بشک مزاری کی طرح مشرقی کوہستانی بلوستان میں جمال خان بھی سنڈیمن کا بہت بڑا مہرہ تھا۔ اور اُسے اس نے خوب خوب استعمال کیا۔ دونوں سرداروں کو انگریز نے ''نواب'' کا بدصورت خطاب دے دیا۔ مگر کیا کیا جائے بلوچ معاشرے میں اس بدصورتی کا احساس نہیں ہوتا، اور اب تو اِس غیر موروثی اور غیر عوامی لفظ کے ساتھ ''زادہ'' لگا کر اس پر فخر کیا جاتا ہے۔

مست سے جمال خان کی بہت گہری دوستی تھی۔ مگر وہ مست کو تنگ بھی بہت کرتا تھا۔ غالباً وہ اُسے کرامت والا کبھی بھی نہیں مانتا تھا۔ ہر وقت آزمائشیں کرواتا تھا۔ مست کی زندگی کے بہت اہم واقعات اسی سردار کے ساتھ پیش آئے اور مست کی شاعری کا کچھ حصہ اسی سردار اور اس کے ساتھ ہونے والے اپنے حادثات وواقعات پر مشتمل ہے:

پیری ژہ بیوانے من ءَ کاتکاں
رستانی ئے کوہ بُن و کوڑاں
داں دمے ترنپاں مہرکشہ اوذاں
سانوڑیں بیگھا بستغیں نوذاں
گوئرمن و لالیں سملہ لوغا
بر، دیم بنت چو بیدہ (1) ای سِیراں (2)
تیمر (3) و گر گُوناں (4) گیا فیناں
پہم کشہ شکرایاں شتاویناں
قول کشہ چاریاں چیارینا ں
مادِہ پہ لعلہ تازہ ایں رَ نداں
پکغنت باغ پہ طالح و بختا

بادشاہ معلیم بیشہ مں تختا
ہر کذیں جائز بنت مہیمانی (5)
پوژ مں درائی جاگہاں بیایاں
پُشت جنوں دروغانی دنیائیا
بیا گروں اویثا خذائیا
مارا اللہ او یاعلی یاتیں
اژپذا دوست و دژمناں تاتیں
تانگریں گڑدیں سملئے بیلی
ئیں گنوخ پار و اسپہاں گوئستہ
ئیں کہ مں قیذانیں پلنگ ئیغاں
سمووث حال و بوذناں سئی ایں
''مست مر وشی مں باغچیں سندھ ئیں
قادرو سلطانیں سرئے جندئیں
گوئر امام بشک پٹھریں رندئیں
یا گورے چوٹی ئے دِ ہ و دَنگاں
مہتراں دور مانڑ یں مزاری آں
(یا) میر جمال خانہ پو ترویں رِ نداں
دوستاں مں تعظیماں بلوچی آں

[حاشیہ: 1۔ بیاباں، 2۔ شادی، 3۔ بہت بلند، 4۔ بہت گہری کھائی، 5۔ فوج کشی]

ترجمہ:

پرسوں میں بیابان کی طرف سے آ رہا تھا
رستانی پہاڑ کے دامنوں میں سے
ایک لحظہ کے لیے بارش کی بوندوں نے وہاں محبت برسائی
ساون کی شام کے بنے بادلوں نے
مجھ پہ، اور لالین سمو کے گھر پر،
بیابان پر، جیسے صحرا میں شادی ہو
بلند چٹانوں پر، گہری گھاٹیوں پر،
توجہ دی برق رفتار عقابوں نے
چاروں چوکیداروں نے عہد کیا
میں بھی لال کے قدموں کے تازہ نشانوں کے پیچھے پیچھے نکلا
طالع اور قسمت کے لیے باغ پک گئے ہیں
بادشاہ اپنے تخت پر باخبر ہے
جس وقت لشکر کشی مناسب ہو
فوجیں معین مقام پہ آن پہنچیں گی
(آؤ) دروغ بھری دنیا کی طرف پشت کر دیں
آؤ خدا پر بھروسہ کر لیں
ہمیں تو اللہ اور حضرت علی یاد ہیں
پیٹھ پیچھے دوست دشمن تذکرہ کرتے ہیں
(کہ) گول چہرے والی سمو کا محبوب کہاں ہے
نہ تو وہ دیوانہ پارس و اصفہان سے آگے گزرا ہے
نہ ہی وہ فرنگی کی قید میں ہے

سمو کو ہی اس کی حالت اور ٹھکانوں کا پتہ ہے
''مست آج سرسبز سندھ میں ہے
قادر اور سلطان کی چوٹی پہ (سخی سرور میں)
امام بشک رندزادہ کے پاس،
یا پھر چوٹی کے علاقے میں
متمول مزاری معتبرین کے پاس،
(یا) میر جمال خان رندنژاد کے ہاں
سب اس کی عزت تعظیم کرتے ہیں بلوچی روایتوں کے مطابق''

یہ ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ مست صرف اُن سرداروں اور سفید ریش لوگوں کا ہی پیرو مرشد نہ تھا بلکہ وہ تو اُن کی ماؤں، بہنوں اور بیگمات کا بھی مرشد تھا۔ وہ سردار زادیاں اپنے ہاتھوں سے اس کے کپڑے دھوتیں، اُسے پکا کر کھلاتیں، اور سمو کے لیے تحفے دیتیں۔ مست کے پاس بھی سفر کے دوران جو خوب صورت پتھر، کپڑے کا جو ٹکڑا، کوئی برتن ہاتھ آتا، وہ سمو کے لیے اٹھائے پھرتا اور ان خواتین کے پاس امانتاً رکھوا دیتا۔ اور ظاہر ہے وہ تحفے وہیں پڑے رہتے۔ اس لیے کہ وہ تو دائمی سفر میں رہتا تھا۔ اور ویسے بھی سمو سے اس کی طبعی ملاقات شاذ و نادر ہی تو ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ سردار جمال خان کی بھی ایک بہن تھی۔ اسے بیٹا نہ تھا۔ وہ مست کی قدر دان تھی۔ وہ اس کے کپڑے دھوتی تھی، کھانا کھلاتی تھی، اور ہمیشہ عرض کرتی تھی کہ دعا کرو خدا مجھے بیٹا دے۔ سمو کا محبوب پورے بلوچ سماج کی خواتین کا بھائی، بیٹا، چچا اور ماموں تھا، وہ ان کا چہیتا عزیز تھا، پیر تھا، ہم درد تھا۔ وہ بلوچ سماج میں عورتوں کے حقوق کا اولین فکری مرد چیمپیئن تھا۔

جمال خان مست کی پیری، بزرگی کو ٹیسٹ کیا کرتا تھا۔ وہ اُسے آزماتا رہتا تھا۔ اس لیے کہ یہ تو سرداروں کی عادت ہے، اُن کے مزاج کا حصہ ہے، درباروں کا ایک مستقل مظہر ہے۔ آزمائشیں دیکھیے:

بانگہے سڈّ وصا حوئے بیشہ
مہثراں پیشینی کمربستہ
سمبراناں پہ مزلیں رائے
کاتکوں کچی لدریں شہرے
دیروہ بازارا گروں بہرے
گپتغاں چوٹی ئے دفہ دِنگاں
یا ہوانہانی پوترہیں رِنداں
زور مناں کوٹیآں بہ تزّیناں
دلگریں کیفانہ ورائیناں
کنجھری آں ژہ مہتر یں موراں
کئے رذاناں چو چاڑ دہی ماہاں
گھمراں جنت چوتانہی نوذاں
چاٹ دا خوشبوآں زروخیناں
عطر و ہمبوئیں کتوریاں
گوں وثی سھنڑائیں سر و ڈیلا
(گشی) ''مس تئ آن و تی نیاں کسّی
مس فقیرانی گپتغاں چسی
مہر ژہ مولایا درہ وسّی
میخ و تئ دڑدی آں ھذا دھسّی

اے منی سرساں گراں بہائیناں
نیم شفی پاساں لیو روائیناں
دل گریں بنگانہ ورائیناں
اژپذی رندانہ رہائیناں''
او منی سرداراں قویہہ ایناں
زور مناں کوٹی آں مہ تّرین ایں
دلگریں کیفانہ مہ کھاواریں
بیامنی مولا کار خراو بیشہ
(کہ) ہردوئیں کو رانی میل اوار بیشہ
یار ہوانہنت کہ جائیذا یاراں
سومری چیار روثی نہ پاذاراں
گپتغاں کیفاں شر خمارینا
سملئے سجی آں دودیمیناں
کنجھری آنی چیار شفی ذونکاں
دیروئے گندہ عادتیں رناّں
سملئے عہداواں نہ بھورینا
مس وثی قولاں عومری سچیا ریثغاں
بیثغاں سچیار چو جہانی آ دیثغاں

ترجمہ:

ایک صبح ایک حاکم کا بلاوا آیا
معتبرین ظہر کے وقت کمر بستہ ہوئے
راہ کی منزلیں طے کرتے ہوئے
ہم کچھی کے پُر رونق شہر میں داخل ہوئے
دیرہ (ڈیرہ غازی خان) کے بازار کی سیر سے لطف اندوز ہوئے
مجھے چوٹی کے لوگوں نے پکڑ لیا
رندوں کی آل اولاد نے
زبردستی مجھے کمرے میں بند کر دیتے ہیں
کیف آور (بھنگ) پلاتے ہیں
طوائفوں میں موراں سب سے سربرآوردہ ہے
وہ مہِ کل کی طرح ابھرتی چلی آتی ہے
دور دراز سے آنے والے بادلوں کی طرح غٹرغوں کرتی ہوئی
فضا میں بہترین خوشبو چھڑکاتی ہوئی
مہک بھری کستوری عطر
اپنی حسین وجمیل قامت کے ساتھ
(کہتی ہے) ''میں تمہاری ہوں بس، کسی اور کی نہیں
میں فقیروں سے لطف اندوز ہوئی ہوں
مہر (محبت) تو مولا کے دربار کی میں بستی ہے
میرے اور تمہارے بدخواہوں کو خدا خود غارت کرے گا
یہ جو گراں بہا سردار ہیں
یہ نیم شب کی ساعتوں میں ہوش اڑوا دیتے ہیں

پُر کیف بھنگ پلا دیتے ہیں
دنیا و مافیہا سے بے نیاز کرا دیتے ہیں''
''اے میرے زور آور سردارو!
مجھے جبراً کمروں میں بند نہ کر دو
اندوہگیں نشہ نہ پلاؤ
مدد کو آ میرے مولا (علی؟) کہ کام خراب ہو رہا ہے
کہ دونوں سیلابی دریاؤں کا سیلاب باہم مل چکا ہے
یار تو وہی جو، ابدی یار ہیں
حسینائیں (پیشہ ور) تو چار دن تک بھی وفادار نہیں رہتیں
مجھے (تو ایک اور) خمار آلود نشے نے مدہوش کر دیا
(میں تو) سمو کی دوطرفی آگ (یاد) سے سجی ہو گیا ہوں
رنڈیوں کی چار راتوں کی عیاشی کے لیے،
ڈیرہ کی بدعادت عورتوں کے لیے،
میں سمل کے ساتھ کیے گئے عہد نہیں توڑوں گا
(اور) میں اپنے عہد پہ اومر کی طرح سچا نکلا
اس طرح سچا نکلا جس کی گواہی پورا جہان دے گا

آیئے جمال خان کی ایک اور شرارت بھری کاروائی دیکھیں، اور مست کا ریسپانس بھی۔ اور اِس واقعہ کے بیچ جو حسین تصورات اور تخلیقی جمالیات کے ٹکڑے آئیں گے اُن سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

ایک بار جب جمال خان لیغاری نے حج کرنے کا ارادہ کر لیا تو مست کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ قاصد اور گھڑسوار مری علاقے بھجوا دیے گئے اور بالآخر مست کو تلاش کر کے اس کا پیغام پہنچایا گیا۔ جب مست اس کے ساتھ ہو لیا تو اس نے مست کو سواری کے لیے گھوڑی پیش کی۔

مگر مست نے جواب دیا،'' میں گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گا۔ کیوں کہ سمو نے اپنی زندگی میں ہمیشہ مجھے پیدل چلتے دیکھا ہے اور زمین پر میرے نقش قدم دیکھے ہیں۔ لہٰذا میں اب بھی پیدل چلوں گا تا کہ سمو اپنی قبر سے مجھے پیدل چلتا دیکھ لے اور پاؤں کے نشانات سے میری سمتِ سفر کا پتہ لگا سکے۔ وگرنہ وہ زمین پہ میرے پیروں کے نشانات ڈھونڈتی رہے گی اور جب میرے پیدل چلنے کے نشانات نہ ملیں گے تو وہ پریشان ہوگی''۔

جمال خان لغاری اُسے حج پر لے گیا۔ سمندری سفر تھا۔ معلوم نہیں کہ سردار نے مست کی درویشی بزرگی کا ایک بار پھر امتحان لینا چاہا، یا واقعی مست کو قتل کرنا چاہا۔ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ مست کو بہلا پھسلا کر عرشے پر لے جائیں اور سمندر میں دھکا دے کر پھینک آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مست کو پانی میں گرا دیا گیا۔ مست ڈوب گیا۔

مگر جب جمال خان کا بحری جہاز عربستان پہنچا تو دیکھا کہ مست وہاں پہلے سے موجود ہے۔ مست نے کہا: '' دیکھو! سمو بیلی (سمو کا دوست) تم سے کافی دن قبل ہی یہاں پہنچ گیا ہے۔ تم لوگوں نے اپنی طرف سے مجھے بے عزت اور عریاں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر خدا نے اپنے فرشتے اور شہباز قلندر و غوث الاعظم میری مدد کے لیے بھیجے اور میں یہاں لایا گیا ہوں۔ جمال خان! اب تم زندہ بچ نہ پاؤ گے۔ ہاں، یہ تمہاری چوائس ہے کہ یہیں مرنا چاہو گے یا اپنے علاقے 'چوٹی' پہنچ کر۔''

کہتے ہیں کہ تب جمال خان کو یقین ہو گیا کہ مست واقعی صادق و سچا عاشق اور ولی ہے۔ اس نے درخواست کی کہ وہ یہاں کی بجائے اپنے وطن میں مرنا چاہے گا۔ چنانچہ مست نے گڑگڑا کر خدا سے مقامِ موت کی جمال خان کی خواہش پوری کرنے کی سفارش کی۔ مست نے طے کر دیا کہ، '' واپسی پہ اپنے گاؤں کے درخت دیکھتے ہی مر جاؤ گے''۔

سردار نے واپسی کے وقت اپنی آنکھوں پہ رومال باندھ دیا تا کہ چوٹی کے درخت نظر ہی نہ آئیں اور وہ موت کی شرط سے بچ پائے۔ کہتے ہیں کہ واپسی پہ جمال خان کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ آنکھوں پہ رومال بندھا تھا۔ لیکن جب چوٹی کے قریب پہنچے تو اس کے کسی نوکر نے خوشی کے مارے

چیخ ماری: آنہاں چوٹی درشک! (وہ دیکھو چوٹی کے درخت نظر آ رہے ہیں)۔ اس طرح عین بددعا کے مطابق جمال خان کا انتقال ہو گیا۔ یہ 1881 کا سال تھا۔ اس پورے واقعے کا، مست کی خوب صورت شاعری میں تذکرہ یوں ہے:

حال مناں ہندی مڑدماں داشہ
اگھ تئ جوریں دژمناں بستہ
ہا وَ ہُل (1) بیشہ مار ٹیلشہ (2) یاراں
بی خبردارژہ بہنٹر (3) وسیساراں
جھل سمندر تئ گرند و زمبھاراں
تئ دھشذہ تاں ڈولیں مزار داراں
مں ہماں ڈکی ایں دمہ نیاما
قذرتاں سنہڑائیں نبی دیشہ
دوست مں نورئے چادرہ توخا
مں دہ گوں مہرانی نظر دیشہ
خوش و بھونش این وہر دمے دراہیں
خوب و چاندی او چاڑدہی ماہیں
یا علی اللہ او اناگاہیں
شاہِ مرداں مار کوفغا شیردے
جھاگشو (4) ساوی ایں (5) دریاپار اں
(مناں) شاں بھرا جلد ی جھٹشہ یاراں
ما اژے ربہ قذرتاں دیشہ
مارا شاہا گوں حکمتاں کشتہ
ژہ پلنگانی جہاز و بیڑی آں
میر جمال خاں ایملاں (6) گپتہ

مزّلیں سڑدارئے ہمے بیٹاں
مزل و جوانیں بوذنے (7) الیش ایں
اشیا درّیں (8) واژہے مانیں
میر پہ چوٹی آ پریشانیں
یاھذامستئے سنّتاں راست کس
اکھریں مِنّت اے مناں لائیے
ملکمیث موثا مہلتاں (9) بہر کاں
شمبری مارا نووتاں (10) بہر کاں
میرا داں چوٹی ئے دہا سرکاں

[حاشیہ: 1۔شور ، 2۔دھکا دیا، 3۔سمندری جان دار ہیں، 4۔تیر کر ، مسافت طے کر کے، 5۔سبز،6۔بیماری،مرض،7۔رہائش کا علاقہ،8۔موتی جیسا پیغمبر،9۔مہلت،فرصت،10۔فتح]

ترجمہ:

مقامی لوگوں نے مجھے خبردار کیا
کہ تمھارے دشمن گھات لگائے ہوئے ہیں
شور بلند ہوا اور مجھے پھینک دیا (سمندر میں)
کہ ''خبردار رہو مگر مچھوں سے، سمندری آدم خوروں سے''
سمندر تیرا گرج اور شور کتنا زوردار ہے!!
تمھاری دہشت سہنے کے لیے شیر کا دل چاہیے!!
میں نے اس دکھ بھری گھڑی میں
نبی پاکؐ کو دیکھا
محبوبؐ نور کی چادر میں لپٹے تھے

میں نے محبت وامید کی نظروں سے آپؐ کی طرف دیکھا
آپؐ بہت خوش اور خرم ہیں
چاندی کی طرح چمک دار، چودھویں کا چاند
''یاعلی مشکل کشا
شاہِ مردان میری مدد کو آ!''
میں نے تیر کر نیلگوں سمندر پار کیا
اس پار مجھے ان بزرگوں نے جھپٹ کر لے لیا
میں نے رب کی قدرت دیکھی
مجھے شاہ نے اپنے کرم سے نکال دیا
فرنگ کے جہازوں، کشتیوں سے
میر جمال خان بیمار پڑ گیا
اِس سردار کا منزلِ مقصود تو یہی ساحل ہونا چاہیے تھا
اصلی منزل اور اچھی جائے قیام، تو یہی مقدس مقام ہے
(کہ) یہیں پہ تو لعلیں آقا (رسول اکرمؐ) کی آخری آرام مگاہ ہے
(لیکن) میر جمال خان چوٹی جانے کے لیے بے تاب ہے
یا خدا، مست کا کہنا سچ کر دے
اتنا احسان مجھ پر کر دے
(کہ) ملک الموت کو ذرا سا ملتوی کر دے
اس بار میری داڑھی کی لاج رکھ لے
میر جمال خان کو چوٹی کے علاقے تک پہنچا دے

******

توکلی مست کی تربیت ،شہرت ،شاعری سب کچھ مری قبائلی پہاڑوں میں ہوئی ۔لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اس علاقہ اوراس کے باشندوں کا ذکر مست کی شاعری میں سب سے زیادہ موجود ہوگا۔ایک جگہ مری قبیلے کے اپنے بزرگوں کو وہ اس طرح یاد کرتا ہے:

مس کسا نیا شِنز شہ نوخی نووتاں (1)
مئے دلا ہَوسیں پہ شکارانی سیلہاں
بانگہے سیمانی شکاراں پہ سمبراں
سیماں چڑا ناں سند ھڑی ریخاں ایر کفاں
پیلویں سالے باغچیں سندھا گارکناں
اژدریا ءَ مس شاں بھرا ڈکّوے (2) دیا ں
چِر کُشہ لوکان و کچاوا او کونتراں
سَر بُرا دورمانڑیں جنے جھونٹایاں وراں
بادشاہ زادی گوں ہزار ویسیں ولزہاں
دل منی پسّندہ نہ خت زنزیر مہپراں
پول و گند یکے انگھ چو سمو دروشماں
پولغا سموئے بذل پیداشہ نواں
جی پہ شوئے چماں نئیشہ شوا سمو لڈغاں
سملئے لوڈ گوناں گوں کہنی کونتراں
تنگویں بچی رُستہ گوئر آریفیں پٹاں
زراں چاندی ایں تنگویں سُہریں اشرفی
درشکاں کول میریں بوئے چومسکی ءَ زری
کوفغ و کنٹر سانا دیاں سندھئے چھوکری
بوئے مس جا داں بستغاں لونگا نی بھری

دیروئے زالاں مان اشت دُر گوشیں پری
سملئے عہداں مس نہ بھورنیاں امبری
کس نہ ییے کوہا کہ دلی احوالے گراں
مارا ماں وہاوا آتکغہ دودا درمیاں
زیث کن و گڑدکہ گپتغا کاہاں کافراں
مارا ماں میلاں ہردمے گیراراں مری
کمترا دوست او گیشترا براث و برادری
زہمی کانجھوئے گارناں مستیں توکلی
گارناں مست و گارانتی شیرانی رلی
ڈھور پہ ریزا مڑد پہ قولانہ اڑی

[حاشیہ:1۔داڑھی،2۔چکر لگا آؤں گا]

ترجمہ:

جوانی کی میری ذرا ذرا داڑھی نکل رہی تھی
دل میں شکار کا شوق
ایک صبح شکار کے علاقے روانہ ہوتا ہوں
سرحدوں سے گزرتا ہوا سندھ کے ریگ زاروں تک آیا
پورا سال سرسبز سندھ میں گزار دیا
شہزادیاں ہیں ہزار طرح کے ملبوسات میں
دریا کی دوسری جانب چکر لگاتا ہوں
کچاوں پر مرغن عورتیں، جھولتی تھیں
اونٹوں، کچاوں اور حسیناؤں کی قطاریں

میرا دل ان زنجیر زلفوں کو پسند نہیں کرتا
دیکھو، ڈھونڈو، اگر سمو کے ایک عضو کی بھی ہم شکل ملے
ڈھونڈھنے سے بھی سمو کا ثانی نہیں ملے گا
تمہاری آنکھوں کے قربان جاؤں تم نے سمو کا خرام نہیں دیکھا
سمو کی چال تو صرف کبوتروں سے ملتی جلتی ہے
بیٹے کی طرح مہربان باپ کے زیر سایہ بڑی ہوگئی
خالص چاندی ہے سونے کی سرخ اشرفی جیسی
کول میر کے درخت کی طرح مسک کی سی خوشبو دیتی ہے
سندھ کی دوشیزائیں ٹیک لگائے محو خرام ہیں
ان کے پراندوں میں خوشبو بندھی ہے، لونگ کے انبار بندھے ہیں
ڈیرہ کی عورتوں میں موتی کی بالیاں پہنی حسینائیں شامل تھیں
سمل سے کیے گئے عہد نہیں توڑوں گا
کوئی کوہستان سے نہیں آتا کہ علاقے کی خبر مل سکے
(البتہ) دودا خواب میں آئے
(کہا) جلد لوٹ آؤ، کاہان پر کافروں نے قبضہ کرلیا
ہمیں جنگی جتھوں میں ہر وقت مری یاد کرتے ہیں
دوست بھی یاد کرتے ہیں مگر بیشتر بھائی اور برادری والے
تلوار کی دھار ہے، مست کہاں گم ہے
مست گم ہے، گم ہیں اس کے اشعار کی لڑیاں
مویشی رسی سے مگر مرد تو اپنے قول سے بندھ جاتے ہیں

****

گوں نہ ینت اباّنچ مری آنی
مہر اللہ خان و شہذاذ شیرانڑیں
لاکھا وڈیرہ سر جُلوّانی
میر حسن خان و یار حمد نوتانڑیں
گوں نہ یث شہباز خان جُلوّانڑیں
دیروہ راہیجو منڑایانی
کو چوآ سہراب ڈومبکی آنی
کوہلی میراں میوہ نوتانڑیں
ہیوتاں باثیل خاں مسورانڑیں
برکھمہ قادر خاں مزارانڑیں

ترجمہ:

(افسوس) میرے باپ جائے مری، یہاں موجود نہیں ہیں
مہر اللہ خان اور شہداد شیرانی
یلغار کرنے والوں کی صف اول والا' وڈیرہ لاکھا موجود نہیں ہے
میر حسن بھی نہیں ہے اور یار محمد نوتانی بھی
حملہ آور شہباز خان بھی میرے ساتھ نہیں ہے
ڈیرہ بگٹی کے معزز راہیجہ بھی نہیں ہیں
کچھی کا سہراب خان ڈومبکی بھی موجود نہیں ہے
کوہلی میر ساتھ ہے نہ میوہ نوتانی
نہ مسوری کے ہیوتان اور باثیل خان ہیں
نہ ہی بارکھان کا قادر خان مزارانی موجود ہے

******

شوران میں رند قبیلے کا سربراہ سردار خان رند بھی مست کے عقیدت مندوں میں تھا۔ جھل مگسی میں نواب قیصر خان مگسی اس کا ہم عصر اور عقیدت مند تھا۔ لہڑی کا سردار سہراب خان ڈومبکی اور اس کا مہمان خانہ مست کے لیے چشم براہ ہوتے۔ اسی طرح بولان کے علاقے تک اُس کا آنا جانا رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار وہ درہ بولان میں تھا۔ قرب وجوار سے خانہ بدوش آپ کی زیارت سے فیض یاب ہونے آجا رہے تھے۔ مست کے دل ودماغ اور رگ رگ میں سمو، سمائی ہوئی تھی۔ سمو تو اس کا تکیہ کلام تھی۔ وہ بات بات پر سمو کا نام دھراتا رہتا۔ بار بار سمو کی توصیف کے شعر سناتا۔

دورانِ قیام جمعے کا دن آیا۔ مست نے کہا: ''آج نماز میں پڑھاؤں گا''۔ یہ کہہ کر وہ پیش امام کی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بلوچوں کی صفیں پیچھے کھڑی تھیں۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ مست کی امامت تھی، لہٰذا نہ خطبہ پڑھا گیا اور نہ کوئی وعظ ہوا۔ مست رخ بہ کعبہ کھڑا ہوا اور ''اللہ اکبر'' کہا۔ کچھ لمحوں کے بعد مست نے منہ پھیرا، اور کہنے لگا: ''یہ نماز نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میں نے جس طرف منہ کیا ہوا ہے سمّو تو اِس طرف نہیں ہے''۔ اُس کے بعد اس نے شمال کی طرف منہ کر دیا اور امامت کروانی شرع کی۔ مگر ذرا دیر میں منہ پھیر کر فرمانے لگا کہ ''یہ نماز بھی غلط رہی، سمّو اس سمت بھی نہیں ہے''۔ پھر صفوں کو جنوب کی طرف آراستہ کیا گیا۔ چنانچہ اس جانب بھی مایوسی کے عالم میں آپ نے وہی فقرے دہرائے۔ آخر صفوں کا رخ مشرق کی جانب پھیر دیا گیا۔ مگر فوراً ہی یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گیا، ''میں نماز نہیں پڑھتا۔ تم جانو تمھاری نماز۔ میری سمو مجھے کسی جانب دکھائی نہیں دیتی''۔

توھیوں ہیں ، میں ناھیں سجنا!
سانوں قبلہ تے کعبہ، سو ہنا یار دسیندا
ذات مذھب ! یہ عشق نہ پچھدا
عشق شرع دا ویری

4۔ دانش وروں فلاسفروں کی درگاہیں

مست اچھا شخص ہے۔ وہ ہر نیک انسان کو پیر مانتا ہے۔ جہاں عوامی مرکز بننے والا مزار دیکھا، وہیں سرِ تعظیم خم کر دیا۔

پیر ہمانہاں کل مقامانی
دعا ترا ریلی ایں پخیرانی
گیشترا اولیا او ولیانی

آج سے دو سو برس قبل دانش ورانہ مباحث کی ایک اور بڑی جگہ درویشوں، ولیوں، فلاسفروں، اور دانش وروں کی درگاہیں تھیں جہاں اُس زمانے کے چوٹی کے دانش ور، ملنگوں مجاوروں کی صورت موجود ہوتے تھے۔ اسی لیے تو ہمارا دانش ور توکلی، پیروں فقیروں اور بزرگوں ولیوں کے درباروں کی زیارتیں کرنے کا بہت ہی شوقین تھا۔ آفاقی محبت کا ہمارا یہ شاعر انھی لوگوں کے پاس آتا جاتا تھا جو محبت کی راہوں سے خوب واقف تھے۔ اس راہ میں چٹان کہاں ہے، پانی کہاں ہے، سراب کہاں ہے؟۔ وہی لوگ تو عشق کے راہروؤں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ مست کبھی شہباز قلندر کے دربار میں حاضر تھا تو کبھی سخی سرور کا دامن تھامے ہوئے ہوتا، وہ کبھی وہارو کے در پہ حاضری دیتا تو کبھی بہاالحق کی درگاہ میں کوکتا۔ وہ کبھی سوھری کی زیارت پہ ہوتا تو کبھی شیہہ کٹی کی قبر پہ جاتا۔ کبھی سید جلال کے علاقے میں کبھی غوث بہاؤالحق کی پائنتی، کبھی شمس سبزواری کی درگاہ میں ہوتا تو کبھی نصیر خان کے قلات میں۔

نانا صاحبؒ

معلوم نہیں میاں عبدالحکیم کا نام ''نانا صاحب'' کیسے پڑا۔ اس لیے کہ میں اس کے آبائی علاقہ خانوزئی میں ایک سال تک ملازمت کرتا رہا ہوں، جہاں وہ 1679 میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں کی پشتو میں ''نانا'' کا لفظ تک موجود نہیں ہے۔ سکندر شاہ کاکڑ کے اس بیٹے کا بچپن بڑا دکھوں بھرا تھا۔ اس

لیے کہ اس کی اپنی والدہ تو شیر خواری ہی میں فوت ہوگئی تھی اور وہ سوتیلی ماں کے حوالے ہوگیا تھا۔

آس پاس کے گاؤں میں علم حاصل کرتے رہنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا اور وہیں سے علم کے زینے پھلانگ کر، اور بہت ساری روحانی غذا لے کر قندہار پہنچا اور وہاں لیکچر دینے شروع کر دیے۔ بہت کم وقت میں وہ علاقہ بھر میں مشہور ہوا۔ حاکمِ وقت شاہ حسین ہوتک اس کی مقبولیت سے اس قدر گھبرا گیا کہ میاں صاحب کو قندہار بدر کر دیا۔

وہ واپس خانوزئی آیا۔ ایک برس تک وہاں رہا۔ شاہ حسین کے خوف سے اسے یہاں بھی حتیٰ کہ اپنے دوست رشتے داروں تک کی سرد مہری کا سامنا رہا۔ تب وہ وہاں سے مشرق کی طرف نکلا اور بہت بڑے کاکڑ قبیلے میں کہیں بھی جگہ نہ پائی۔ بالآخر چوٹیالی میں ترین قبیلے نے اُسے زمین دی۔ وہ چھ سال تک یہاں رہ کر 1740 میں وفات پا گیا۔

اس کا مزار پشتون قبائل اور مری قبیلہ کے افراد کی جائے دعا رہی ہے۔ مست توکلی بھی اس آستانے پہ کئی بار حاضری دے چکا۔

سخی سرورؒ

کوہِ سلیمان کے مشرقی دامان میں حضرت سخی سرورؒ کی مشہورِ زمانہ درگاہ ہے۔ وہ مشرقی بلوچستان کے بلوچوں کا روحانی بزرگ تو ہے ہی لیکن سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے دیگر علاقوں سے بھی بے شمار لوگ اس کے عقیدت مند ہیں۔ سخی سرورؒ کا اصلی نام سید احمد تھا۔ وہ سید زین العابدین کا فرزند تھا۔ لوگ اُسے ''سکھ داتا'' ''لعلاں والا'' اور ''سخی سرور'' کہتے ہیں۔ اُس کی شہادت 1174 عیسوی میں ہوئی۔ ہر سال اس کے مزار پر بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے جس میں شرکت کے لیے دور دراز سے زائرین آتے ہیں۔

سخی سرور کے نام گرامی کو بلوچ شاعری اور بلوچ موسیقی میں ڈال کر امر کر دیا گیا ہے۔ مشرقی بلوچستان میں ''نڑسُر''، موسیقی کی بہت ہی مشہور اور مقبول صنف ہے۔ جس میں تین تین سو مصرعوں پر مشتمل شاعری بہت تیزی سے مگر موسیقی کے اصولوں کے عین مطابق گائی جاتی ہے۔ اس مقبول صنف میں مقبول ترین داستان ''پیرانی دستان'' ہے۔ ''پیرانی داستان'' اپنے الفاظ، ادائیگی

اور دھن کے لحاظ سے اس قدر محو کر دینے والا ہے کہ محفل میں موجود سامعین میں سے ایک آدھ ضرور ''وجد'' میں آجاتا ہے۔ اس کے بول ہیں:

سخی سرور مناں دربر
مناں گوں سنگتاں دربر
اے مُچی مڑدماں دربر

ترجمہ:

سخی سرور مجھے پار لگا دے
مجھے ساتھیوں سمیت پار لگا دے
محفل میں شریک سب لوگوں کو پار لگا دے.....

واضح رہے کہ دوسری مشہور پیرانی دستان خود مست توکلی کا ایک ''شیر'' ہے جس میں لوگ وجد میں آتے ہیں۔ لمبی اور تیز سانسیں لیتے لیتے وہ بے ہوشی کے قریب پہنچتے ہیں۔ نڑسُر کی محفل سجائیے اور تیز دھن میں مست کا یہ کلام سنیے، کچھ نہ کچھ تو آپ کو بھی ہوگا۔

سمو کایئے تہ برانے
بچی دراں نہ دیانے

مست مشرقی بلوچ قبائل کی طرف جب بھی سفر کرتا، حضرت سخی سرورؒ کے دربار میں ضرور حاضری دیتا۔ جاتے ہوئے بھی اور واپسی پہ بھی۔ سخی سرورؒ گویا اس کی حاجات کی تکمیل کا واسطہ تھا۔ وہ اپنا ہر جذبہ اُس کے حضور پیش کرتا، اپنی ہر درخواست وہاں ڈال آتا۔ اور ظاہر ہے مست کی ہر حاجت، ہر درخواست سمو سے متعلق ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مست جب سمو سے خفا ہوتا ہے تو بھی شکایت لے کر سرورؒ کے دربار جانے کی دھمکی دیتا ہے:

تئ زہیر نیلاں سرورئے دربارا رواں
سرورئے دربارا ضرور دانہی ءَ رواں
سرورئے دربارا منہہ غیتیں عاشقاں

دانہہ منی ماں بئے سمبراں ہول پوشاں کناں
مس ہذیں گڑداں چو جیغ بی جنگانی کواں
چاڑ منی جیغا چو چاڑشئے بالاچہ کواں

ترجمہ:

تیری یاد چین سے نہیں رہنے دیتی، میں سرور کے دربار جاتا ہوں
میں وہاں تمہارے خلاف فریاد لے کر ضرور جاؤں گا
سرور کا دربار جہاں عشاق کے جانے پہ کوئی بندش نہیں
میری دعا قبول ہو تو زرہ بکتر پہنوں
میں اُسی وقت لوٹوں گا جب کمانِ جنگ سج جائے
میرے کمان کو بھی ایسا ہی سر بلند کر، جیسے تو نے بالاچ کی کمان بلند کیا تھا

مست نے اپنے کلام میں کئی بار حضرت سخی سرورؒ کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ اُس کے عالی دربار سے رخصت لیتے وقت کس قدر مودب ہوتا ہے:

ما اژے سلطانا سلام گپتہ
سرورہ دربارا دریائینا

ترجمہ:

ہم نے سلطان کو الوداعی سلام کہا
سخی سرور کے سمندر جیسے وسیع دربار سے

شاہ محمد سلیمانؒ (1770تا1850)

یہ تونسہ کا پیر ہے۔ ''خواجہ پیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اولاد کو ''خواجگان'' کہتے ہیں۔ موسیٰ خیل سے لے کر بارکھان اور بزدار ولیغاری سے لے کر ملتان تک اس کے مرید پھیلے ہوئے ہیں۔ گو کہ میرے پاس کسی طرح بھی یہ استحقاق نہیں ہے کہ میں ولیوں، پیروں کے بیچ

پڑوں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ یہ روایت میں نے کہاں پڑھی یا کس خاص راوی سے سنی۔ لیکن بہر حال مجھے یاد ہے تو یہاں نقل بھی کرتا ہوں کہ مست کے سوانح کی کوئی کڑی بیان سے رہ نہ جائے:

تونسہ آ کر وہ خواجگان کے ہاں ضرور حاضری دیتا۔ ایک بار حضرت مست کہیں سے آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں باریک چھڑی تھی۔ مست کیا دیکھتا ہے کہ خواجہ صاحب بیٹھا تعویز لکھ رہا ہے۔ اب کیا معلوم مست کے جی میں کیا آیا، اس کی اس حرکت میں کیا حکمت تھی کہ اُس نے چھڑی خواجہ صاحب کی پشت پہ دے ماری اور کہا، ''سمو کے منشی! سمو کے نام خط لکھو!''۔

اُس دن کے بعد جب بھی خواجگان کا نام سنتا ہوں یک دم مجھے انہیں مست کے عطا کردہ خطاب کا خیال آتا ہے اور ان کے لیئے عزت واحترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر خواجہ صاحب کے پاس اپنی کرامتیں نہ بھی ہوتیں تو سمّو کا منشی بننا کوئی کم درجہ ہے کیا؟۔ سمو، سمو بیلی اور سمو کا منشی۔

(ہاں، یہ روایت مجھے وڈیرہ بختیار خان سومرانڑیں نے سنائی تھی، جو مست کا سمجھو بایوگرافر تھا)۔

غوث بہاء الحقؒ

کبھی کبھی شعری ضرورتیں بہت دشواری پیدا کرتی ہیں۔ کتنے برس سے یہ عام بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ مست اپنی شاعری میں 'ہاول' کس درویش کو کہہ رہا ہوتا ہے۔ ابھی یہ مضمون لکھتے لکھتے جب میں پھنس گیا تو اپنے بڑے بھائی سے پوچھا تو انہوں نے نہایت اعتماد سے کہا، ''ملتان کے غوث بہاالحق، عام بلوچ بہائالحق کو 'بھاول' کہتے ہیں۔''

پیر ملتانئے کل مدتاں گوں بھاولا
شمس تبریز واژ ہیں کیث مئے واہراں

ترجمہ:

ملتان کے تمام پیر، بمع غوث بہاالحق مددگار ہیں
شمس تبریز آقا ہیں میری مدد کو آتے ہیں

پیر سُوھریؒ

پیر وزانڑیں بگٹی شاخ کا یہ درویش، بگٹی علاقے کے ایک پہاڑ کی چوٹی پہ مدفون ہے۔ وہ ہم سب مشرقی بلوچوں کا محترم پیر ہے۔ مست کے، سخی سوھری کے ساتھ تعلقات عجیب کھٹے میٹھے رہے ہیں۔ بحیثیت پیر وہ اس کی حد سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ مگر تھا تو وہ مری۔ اور مری بگٹی کی قبائلی جنگیں تو چلتی رہتی تھیں۔ ایسی صورت میں بگٹی لوگ سخی سوھری کے دربار جا کر مری کی شکست کی منتیں مانتے تھے۔ اور مری لوگ مست کے پاس فریاد لے کر جاتے۔ اس طرح یہ دونوں بزرگ آفاقیت سے نیچے اترتے اور اپنے اپنے قبیلے کی فتح کے لیے اپنی کرامتیں خرچ کرتے۔ مگر چھوڑیے، یہ بہت بڑی بات ہونے کے باوجود چھوٹی بات ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ مست، سخی کی بہت تکریم کرتا تھا۔ وہ اُسے کوہستان کا بادشاہ کہہ کر پکارتا تھا:

بادشاہ کوہئے پیر سُہری گوانک جناں
(میں کوہ کے بادشاہ پیر سوہری کو پکارتا ہوں)

یا.....

پیر سُہری آ داثغاں شہبازا لقا
(پیر سُہری اور شہباز قلندر نے مجھے کرامتیں دی ہیں)

یا.....

آتکو کوہئے ننگریں دیثہ
ننگرئے قربانی سلام بیثہ

میں آ کر پہاڑ کے ننگر یعنی سخی (سوہری) سے ملا
اس کے پاس قربانی کی اور اس کا سلام کیا

شہباز قلندرؒ

حضرت شہباز قلندر کے بارے میں تفصیل دینے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ بس مست کے اشعار کا نقل کرنا ہی کافی ہے۔

ئیں کہ داں سیوانڑہ شتاں اوذا
اوذا گوئر تمبھوآ امام ئیغا
بیرک وشوشنگاں فقیرئیغاں
دوسریں واسنگاں قزاق ئیغاں
سنگتیں یاراں ہر چیارئیغاں

ترجمہ:

اب جب وہاں سہونڑ جاتا ہوں
وہاں امام (حسینؓ) کے کھمبے (معتمدِ خاص) کے پاس
اس درویش کے لہراتے جھنڈوں اور علموں کی طرف
قزاق (صخاک؟) کے دو سینگوں والے اژدھوں کی طرف
وہ جو چہار یار کا سنگت ہے

مست اور سندھ، سندھ اور مست ..... سندھ اور بلوچ، بلوچ اور سندھ..... جدا نہ کیے جا سکنے والے مظاہر ہیں۔ اور سندھ کا مطلب لال شہباز قلندر کے سیہونڑ کے علاوہ بھلا اور کیا ہے؟ معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ مست کے کلام میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ذکر موجود نہیں ہے، اور شاہ کی عدم موجودگی کا مداوا قلندر کی وافر موجودگی کیسے کر سکتی ہے۔ مست وہاں بے شمار بار جاتا رہا اور ہر بار دیر تک وہاں قیام کرتا رہا۔ قلندر کے مجاوروں سے موسیقی میں، شاعری میں، فلسفہ میں کیا کیا کچھ سیکھا ہوگا اُس نے!! ۔ بلا شبہ ان بڑے بزرگوں کی درگاہ کے خاکروب مجاور، مست کے بہت بڑے اتالیق تھے۔

آیئے ایک مزیدار عوامی قصہ پڑھتے ہیں:

ایک بار حضرت توکلی شہباز قلندر کی زیارت پہ حاضری دینے جا رہا تھا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ۔ اُدھر سے ٹرین آ رہی تھی۔ یہ ایک نئی چیز تھی۔ اس کی ہئیت وصورت، تیز رفتاری ،شور ہنگامہ، دھواں کوئلہ.....سب کچھ نیا تھا مست کے لیے۔

اب مست ہے نا! اس نے پٹڑی پر کھڑے ہو کر سمّو کو اور ٹرین کو اور ٹرین کے موجدر چرڈ ٹریوی تھک کو ابدی بنا دیا۔ ٹرین کا ڈرائیور خواہ کتنا ہی سیٹیاں ہارنیں بجا تا رہے، مست نے اُسے ڈرائیور نہ جانا، ٹرین کو ٹرین نہ جانا۔ اس کے لیے تو یہ سمّو کا بار برداری والا گدھا تھا۔ اور گدھے کا، اپنی مالکن بغیر اس طرح بھاگ جانا مست سے کہاں برداشت ہو سکتا تھا؟۔ چنانچہ ''ھِش، سمو لاغ'' کا نعرہ مارا۔ دونوں ہتھیلیوں سے آتی ٹرین کے خلاف زور لگایا۔ ٹرین رک گئی۔ انگریز عملہ تھا۔ مست پٹڑی سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ ٹرین کا عملہ خواہ ٹریڈ یونین میں منظّم تھا یا نہیں، مست کے ساتھ مذاکرات البتہ بہت ہی مشکل تھے۔ مطالبات میں سے ایک یہ تھا کہ اِسی جگہ علامت کے بطور ایک مستقل سٹیشن بنایا جائے: مطالبہ منظور۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیشہ کے لیے قلندر بادشاہ کے ملنگوں سے ٹکٹ نہ لیا جائے: مطالبہ منظور..... تیسرا، اُس نے ایک زرد رنگ کا برنج کا گلاس اُن سے مانگا۔ گلاس، قدح، جام، پیالہ، صراحی .....عشاق زادِ راہ کا بندوبست کیے بغیر کہاں رہ سکتے ہیں؟۔ یہ گلاس ابھی تک اُس کی قبر پہ رکھا ہوا ہے۔

مست نے ریل گاڑی کو جس خوب صورتی سے بیان کیا۔ اس کے محض صوتی زیر و بم ہی آپ کو محظوظ کریں گے:

جی خدا قدرت و کمالانی
دیشہ ما دھود ہوئے دھمالانی
قدرتی رنگے بادشاہانی
اے چیں اسبابے قیل وقالانی

ھُگّواں دونہوآں شمالانی
ژل گراناں کئے لسّویں نالاں
کر کٹاناں گوں سانوڑیں سروفاں
واچڑہ بی گوں لشکری گروہاں
دہم دہماناں کئے بانزرو بالاں
کئے رڑاناں گوں مسّویں نالاں
کئے دھماناں چوسیہ گُریں زالاں
اربذاناں کئے سانونٹریں سیراں
سر رشاناں چو تانہی نوذاں
دئی تلی اے پہ حکمت و ڈھالاں
اژوثی سلطانیں سرہ ٹالاں
دستہ لایان و زورہ پالانی
جکشہ ریل گوں اسپر س بالاں

ترجمہ:

قدرتوں اور کمالات کا خدا، تمہیں جی ہو
ہم نے دھمال ڈالتا دھواں دیکھا
یہ بادشاہوں کے کمالِ فن کا نمونہ
یہ عجیب آوازوں والی مشین
اس کے بند بند سے شرار آمیز دھواں بلند ہوتا ہوا
وہ صیقل شدہ نعلوں پہ پھسلتا ہوا آتا ہے
ساون کی بارشوں کی طرح جھوم جھوم کے آتا ہے
فوجی دستوں کی طرح جھپٹتا ہے

بڑی تیز رفتاری سے پنکھ چلاتے اڑتے امنڈتا آتا ہے
اپنے نپے تلے پہیوں پہ لڑھکتا آتا ہے
سیاہ پستان عورت کی طرح تیز تیز چلتا آتا ہے
ساون کے بادلوں کی طرح امڈتا آتا ہے
دور دراز سے آتی بارش کی طرح چھلکتا آتا ہے
حکمت سے ڈھال بنا کر دونوں ہتھیلیاں آگے کرتا ہوں
اسے اپنے سلطانی سر سے ٹال دیتا ہوں
ہاتھ لگا کر اس کا روز آزمالیتا ہوں
رک گئی ریل مع اپنی ایکسپرسی اڑان کے

دلچسپ ہے کہ مست کی شاعری میں ٹرین کی جو خاصیتیں بتائی گئی تھیں، یورپ نے اسی مناسبت سے اِس کو Puffing Eagle کا نام دے رکھا تھا۔

وھارُوؒ

وہارو مری قبیلہ کے مہکانڑیں طائفہ کا نامی گرامی ولی ہوگزرا ہے۔ مست اس کی زبردست عقیدت میں تھا۔ وہ اکثر اُس کے دربار آتا جاتا تھا، اُس کی قبر کی زیارت کرتا تھا:

یات کناں شاہا کلّے پیرانی
حاضرا وہارو شیہہ کلامانی
تنگویں تمبھواے مری آنی
آسرو اومیشے گریوانی
کاتکاں سوالی بے حساوی آ
کاتکاں مڑدم جاہ پہ جاہی آ
پُجناں مراذو گڑتاں راضی آ

دستغیر سرتاج کلّے پیرانی
چھبوے پشت اَیں مار مزارانی
مئے دلا سوزاں حرف قرانانی
گوناں پڑزائے کتابانی

ترجمہ:

توصیف کرتا ہوں شاہ (علی؟) کی جو سب پیروں کا شاہ ہے
اِس وقت کرامات بھرے وہارو کی توصیف کر رہا ہوں
جو مری قبیلے کے لیے سونے کا بنا ستون ہے
جو غریبوں کا آسرا اور امید ہے
بے شمار سوالی آتے رہتے ہیں
جگہ جگہ سے
ان کی مرادیں بر آتی ہیں اور وہ خوش خوش لوٹتے ہیں
دستگیرؒ سارے پیروں کا سرتاج ہے
شیروں نے میری پیٹھ تھپکی ہے (کرامت بخشی ہے)
میرے دل میں قرآنی لفظ سرسبز ہیں
میرے پاس کتابوں کا ایک ٹکڑا ہے

محبوب شاہؒ

اس درویش کے پس منظر اور اس کی زیارت گاہ کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ مست نے ایک دو جگہ بڑے احترام سے اس کا تذکرہ کیا ہے، جو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

پیر محبوب شاہ تربتا مہماں بیثغاں
پیرہ مہماناں دامناں شیر و شکلاں

ترجمہ:

پیر محبوب شاہ کے روضے کا مہمان بنا
میں پیر کا مہمان ہوں، وہ مجھے کھلائے دودھ و مصری

ایک اور جگہ مست محبوب شاہ کا ذکر یوں کرتا ہے:

پیر محبوب شاہ مشکل آسانیں

ترجمہ:

پیر محبوب شاہ جو مشکلات کو آسان بنانے والا ہے

نصیر خان نوریؒ

میر نصیر خان نوری اٹھارہویں صدی میں بلوچوں کے نشاط ثانیہ کا علم بردار تھا۔ قلات کے حکمران کی حیثیت سے اس نے اپنی (بلوچوں کی) ریاست کو بہت وسعت بخشی ۔ایرانی بلوچستان سے لے کر ڈیرہ غازی خان تک اور افغانستان کے بلوچستان سے لے کر جیکب آباد تک اس کی حکمران قائم تھی ۔اپنے مذہبی رجحانات، یا سیاسی ضرویات کے تحت اس نے اپنی تقریباً تمام جنگوں کو مذہبی رنگ دیا تھا۔

نصیر خان بلوچوں میں آج بھی ایک بزرگ اور ولی کا درجہ رکھتا ہے۔مست بھی خان بلوچ میر نصیر خان کی بہت عزت کرتا تھا۔ چنانچہ وہ تمام دعائیہ اشعار میں میر نصیر خان کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

''بادل اور بارش خراسان کی خوبصورت وادی سے چلتے ہوئے میر نصیر خان کے بلند وبالا محل پر سائے کی چادر پھیلائیں''۔

کور بولانا ایر کفاں مشکافہ دہاں
میر نصیر خانہ تنگویں محلاں آتکغاں

ترجمہ:

میں دریائے بولان سے مشکاف کے علاقے میں آتا ہوں
وہاں سے میر نصیر خان کے طلائی محلات تک آ گیا

سید جلال (الدین)

لال شہباز قلندر (حضرت سید عثمان مروندی رحمتہ اللہ علیہ) کے ساتھ جن تین درویشوں نے پنجاب اور سندھ کے علاقوں کے سفر کیے، ان میں حضرت سید جلال سرخ بخاری علیہ الرحمتہ بھی شامل تھا۔ یہ چار دوست حضرت بہاؤ الدین زکریا، شیخ کبیر فرید الدین گنج شکر، حضرت سید جلال سرخ بخاری اور حضرت لعل شہباز قلندر پاک تھے۔ ان چاروں دوستوں نے کئی مرتبہ اکٹھے ایک ساتھ سفر کیے۔ ان سفروں میں انہوں نے پنجاب اور سندھ کے دور دراز علاقوں میں اپنی تعلیمات کو عوام الناس میں روشناس کروایا۔ اُس کی ولادت 1198 میں تاریخی اہمیت کے شہر بخارا میں ہوئی۔ اس کے والد ماجد کا نام سید علی ابوالموید بن جعفر تھا۔

حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور وہ 635ھ میں ملتان آیا۔ ملتان میں اس نے حضرت غوث العالم بہاؤ الدین زکریاؒ کی بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

اوچ شریف میں قیام پذیر ہونے کے بعد بھی سرخ بخاری اکثر ملتان آتا رہتا۔ ملتان میں قیام ہمیشہ اپنے مرشد کے پاس ہوتا، حضرت غوث العالم کی وفات کے بعد وہ ملتان آتا اور صدر الدین عارف سے ملاقات کرتا۔ حضرت صدر الدین عارف نے اس کو حکم دیا کہ اب اوچ میں مستقل سکونت اختیار کرو اور وہاں کے لوگوں کو فیض پہنچاؤ۔ چنانچہ اُس نے اوچ شریف اور اس کے مضافات میں اصلاح کا کام پوری توجہ سے شروع کر دیا۔(1)

سید جلال سرخ بخاری علیہ الرحمتہ نے نوے برس کی عمر میں 1291 میں وفات پائی۔
مدفن وہیں اوچ شریف میں ہے۔

ہر کسی تنی ایں دِلا میلی سید جلال
برکتی دیواں چاکرا میرینہ کُثاں
جنگ ہوانہہ انت کہ ہوں گریں بالاچہ کثاں
شیر ہوانہاں کہ ننگریں بیورغہ جثاں
قول ہوانہہ انت کہ عومرو جامہ پالثاں
داذ ہوا نہاں کہ زرزوالہ (1) ننگہ کثاں
عشق ہوانہاں کہ لیلو و مجنایا کثاں
من دے گوں گپتاراں حدیثاں گونہ دیاں
پڑتہ چو میناں چوکہ پہ حانیا مریذ
چو کہ پہ برّاں اخترہ پولث گلڑی
مں تہ شاں سموتہ ہواں درشکانی برئے
(ژہ گوہر ئے در گوشیں مہیری آں سستغئے
وش گشیں لوڑی بیااو گرھلکہ سر گرُا
وش ِگلا ساز کن ِگر سروزو دَ بنیر وا
مروڑ وثی ڈالشاہیں (2) بروتاں پہ جنیہرا (3)
چوسمیناں شل، مارہ چو سالو کی سمار
کوڑی بے بختاں (کہ) عاشقانی غیوہ کفاں

[حاشیہ:1۔سخی نوذ بندغ،2۔بڑی بڑی،3۔شاعری گانا]

ترجمہ:

سید جلالؒ ہر پیاسے دل کا ملاپ کرادے شالا
محفلیں وہ تھیں جو میر چاکر منعقد کیا کرتے تھے
لڑائیاں وہ تھیں جو انتقام لینے والا بالاچ کیا کرتا تھا
شاعری تو وہ تھی جو بیورغ کیا کرتا تھا
قول تو وہ تھے جو عمرو جام پورا کرتے تھے
بخششیں وہ تھیں جو سخی نوذ بندغ کیا کرتا تھا
عشق وہ تھا جو لیلیٰ مجنوں نے کیا
میں بھی اپنی شاعری میں کمال کرتا ہوں
تم پہ ایسا فریفتہ ہوں جیسے حانی پہ شہ مرید تھا
جس طرح اختر گلڑی کو صحرا صحرا تلاش کرتا تھا
میں تو کہتا ہوں سمو! تم انھی درختوں کا میوہ ہو
گوہر کے در گوش مہیریوں میں سے ہو
خوش نوا مغنی آ اور محبوب کے گھر کے بالائی کنارے
اپنے آلاتِ موسیقی کو ٹھیک ٹھاک کردے
موسیقی شروع کرنے کی علامت کے بطور اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دو
بادلوں کی طرح برس، دلہا کی حیثیت سے ہماری توصیف کر
بدبخت ہیں وہ لوگ جو عشاق کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں

جام و مرید

مست اپنے دانش وشعور کے گھونسلے کے لیے جو تنکا تنکا جمع کرتا ہے، اُن میں اپنے اکابرین سے استفادہ شامل ہے۔معرفت،شعروفلسفہ،اور بلوچی زبان کے اکابرین.....مست کو جہاں سے بھی بصیرت کی رمق ملی،اٹھا کر اپنے دستار میں رکھ لی۔

مست جب شعر سناتا تو جام کا نام ضرور لیتا کہ یہ آگ جام ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ مست کی شاعری میں بے شمار مقامات پر جام کا ذکر ہے؛ بحیثیت استاد کے،بحیثیت متاثر کرنے والے کے۔

شہ مریذ تریٹے گوں چیاریں سنگتاں
ٹپٹو دستے اشتئی گوں راستیں چمبواں
من نہ بھلاں کہ عاشقاں راہ پیش داشتغاں
دُر ک و کرموا و مریدا سجیں تغاں

حوالہ

1- شاہ محمود علی لعل شہبار قلندر، 2013، روشنی پبلی کیشنز، کنڈیارو، صفحہ 113,112

مستی،مستالائی

خطے کے نام ور عارفوں فلاسفروں کے درباروں میں حاضریاں دے دے کر،اور اس زمانے میں ان درباروں میں موجود گدی نشینوں،مریدوں اور ملنگوں کی صورت میں موجود دانش وروں سے علم ودانائی اور فلسفے کی باتیں سن کر، اُن کے مرشدوں کی شاعری سن کر، دربار میں موجود یا پھر عرسوں میلوں میں شرکت کرنے والے بڑے بڑے موسیقاروں سے موسیقی کی باریکیاں سیکھ کر،مست اسی کلچر کا حصہ بن جاتا۔فلسفہ کے اُن کل وقتی اکابرین کی ساری عادتیں اور اطوار قریب سے دیکھتا،ان کے خورد ونوش میں حصہ لیتا،ان کی بود وباش کو سراہتا اور حبِ مال وجاہ ونام کو نفرت سے دیکھتا، اور اُن کی امن پسندی، انسان دوستی اور انٹرنیشنل ازم کو دل میں بسا کر اپنے وطن لوٹتا اور اگلے ریفرشر کورس تک یہی تعلیمات پھیلاتا۔مست نے مقامی اتھارٹی سے براہِ راست بالکل بھی ٹکر نہیں لی۔اُس کی کھٹی میٹھی اَن بن صرف نواب جمال خان لیغاری سے رہی۔باقی سرداروں سے اس نے دوستی دوستی میں عوام کے مفاد کے کام لیے۔مست نے ملاّ کے خلاف ردِعمل دکھایا،اُسے کبھی پسند نہ کیا مگر اُس سے بھی کوئی بڑی معرکہ آرائی نہ کی۔شاید ملاّ کا ادارہ نہ ہونا اُس کا بڑا سبب ہو۔

مستیں توکلی ایک عجوبہ شخصیت کے بطور دلوں دماغوں میں ابھی دو صدیوں تک دائم وقائم رہا۔وہ اگلی کئی صدیوں تک بھی ایسا ہی سرسبز اور سدا بہار ہی رہے گا۔اس لیے کہ وہ عوام کی خیر،خوش حالی اور بہبود کے لیے کام کرتا رہا،وہ امن اور بارشوں کی تمنا بھری شاعری کرتا رہا اور دعا کرتا رہا۔ غور وفکر کے لیے بلوچ وطن کے بلند وبالا پہاڑوں کی وسیع خاموشیاں،ان پہاڑوں میں موجود زندگی

کے تمام پہلوؤں پہ مشتمل مشاہدات اور عملی ریسرچ ورک، فلاسفروں درویشوں کی درباروں کی دی ہوئی تعلیمات پہ مہرِ تصدیق ثبت کرنے کا سامان مہیا کرتے تھے۔

نتداں مس کوہا داراں ششماہی روشغاں
واڑ تغیں سیٹا ں داتغیں دیمی توشغاں
ما لکئے ذکرا مس شف و روشی ءَ کناں
زارہے جواناں کہ گنا ہاں معافہ کناں

ترجمہ:

میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ششماہی روزے رکھوں گا
کھانا پینا بھی سودمند ہوتا ہے، (مگر) راہِ خدا میں دیا ہوا تو آخرت کے لیے توشہ ہے
میں مالک کا ذکر شب و روز کرتا ہوں
آہ وزاری اچھی ہے کہ گناہ معاف کراتی ہے

توکلی کی مستی، مستانگی ایسی کیفیت ہے جو اُسے دوام بخشنے میں اہم ثابت ہوئی۔ آپ دنیاوی نہ ہوں اور پھر بھی دنیاوی خیر و بھلائی کے لیے کام کریں تو عوامی عزت تو امڈ امڈ آئے گی۔ وہ انسان کی بہبود کے لیے تڑپتا تھا۔

هرنـاله كه عـا شـق بـه سحر گاه كند
ازنـالـه زاهـد ان سـا لوس بـه است

(خیام)

مست عام سی بات کرتا ہے مگر غور کریں تو ذہن میدانِ فلسفہ پہ دوڑتا ہی چلا جائے:

بھنگاں پہ ہنر پاریزیں
بھنگ پئے کوہ سراں نایاتاں

ترجمہ:

بھنگ بہت بچا بچا کر استعمال کرو
بھنگ ہمارے کوہستانی علاقے میں ناپید ہے

خسارے میں ہیں وہ لوگ جو بھنگ کو صرف بھنگ کے معنوں میں لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایک غیر آباد اور غیر منظّم قبائلی زندگی میں مست کے فلسفہ کو محض اُس کی دیوانگی میں دیکھا اور محسوس کیا گیا۔ اُس کے فلسفہ کو سمجھنے کے لیے نہ وہ وسائل تھے اور نہ معروض۔ کاش وہ پریس اور اشاعت کے گنجان آباد علاقے میں ہوتا، تو ہم اُس کے یوٹوپیائی سوشلزم سے بہت فیض یاب ہوتے۔

ہم میں سے کتنے ہوں گے جنھوں نے اس فلاسفر کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش تک کی ہو۔ یوٹوپیائی اشتراکیت کے کتنے دعوے دار ہوں گے جنھوں نے خیر و بھلائی کے اپنے اس مرشد کو غور سے پڑھا ہو۔ آیئے ذرا ہم آپ اُس کے اشعار کو چبا چبا کر پڑھیں، کیا خبر ہمیں ہی کچھ عطا ہو!!

اوذا دا حُکّا ما حکا میغا
چریں دا کا چو آ گیا فینا
شہ کہیری ئے باغچیں گو را
کوچوا بازارہ رِذوحداں
رِندی دور مانڑیں بو لکے دیشہ
آف داں سالے آ شریخ بیشہ
ہر دو گو رانی ہا ر (1) وہار بیشہ
مارا شاہا ژہ آورواں (2) کشتہ
(مئیں) جندے ژہ عیواں بے میار بیشہ
پاذماں پوڑی آں اڑائینتہ
دست جوانیاّ تنگویں گو آں (3)
گرہواں ضامناں صحیح ایناں
گِر ہواں چی آں کس ندیشیناں

سُہراں چو زیتونی براں لالاں
اژ بہشتانی رتکغیں محلاں
شراں چو سینگھاراں سمین ئیغاں
شر ہجیراں گوں شکلیں نیاذاں
زوار ہوانہاں کہ دائما زواراں
حیدری گپتاراں خوڑ داراں
مانٹر (4) ئے ژہ سُہریں تنگواں باراں
تنگواں عرشی پریشتغ اے کاراں
پارساں خواجہ ئے رِذئے جوڑاں
(آں) بے خبرانت کے اُجڑّہ رُمباں
ئیں کہ گاڈو پہ کوفغاں جُنباں
گاڈوں آں جلدیں نوکرے چکّاں
نوکراں سرکارئے حکم چوشیں
شف پرے لالاں ہر دمے روشیں
مومن و دیں داراں دل و گوشیں
تی جنے صابونٹر شوذمخاں پاغا
بئیث و مئیں بِرّانی (5) سرا بوشتی
چومنی قہرانی خذا مہر بئے
قید و باندی ایں بندغاں بوژی
چو کہ میرال ژہ کافراں بوتکئی
اُودو بُودانی (6) ظالمیں زواراں
سر جمی آ مس دیروا کاتکاں
میڑوے سڑدارئے نصیو بیثئی
دوست شوذی گوں لیلویں دستاں

گوں وثی گلبوغاں ملُوکی آں
حج گوں حاجی آں حضور بنداں
جِند گوں یاراں اختیار باثاں

[حاشیہ: 1۔سیلابی پانی، 2۔سیلابی پانی کا راستہ، 3۔سر یندا یا دمبیر و کی وہ لکڑی جس سے تار بندھے ہوتے ہیں، 4۔برتن، ناپنے کا برتن، 5۔جذبہ، 6۔جاہل، کافر]

ترجمہ:

وہیں مجھے حاکمِ مطلق کا حکم ملتا ہے
وسیع وعریض کچھی جانا ہوا
سید کہیری کی باغوں بھری ندی تک
کوچو کے بازار کے حدود میں
رندوں کا ایک متمول گھرانہ دیکھا
ایک سال تک آب ودانہ شریک رہا
دونوں ندیوں کے سیلابی پانی باہم مل گئے
ہمیں شاہ (علی؟) نے اس سیلابی رو سے نکال ڈالا
میں عیبوں سے پاک رہا
میں نے پیر سیڑھیوں پر رکھے
ہاتھوں سے طلائی زیور پکڑے
ضامن وہ لو، جو کامل ہو
وہ چیزیں خریدو جو کسی نے نہیں دیکھیں
جو زیتون کے لالین پھلوں کی طرح سرخ ہیں
جو بہشت کے رنگین محلات سے لائی گئی ہیں

جو نسیمِ سحر کے سنگھار کی طرح دلکش ہیں
بہت خوب صورت ہیں میٹھے وصل کے ساتھ
سوار وہ جو دائمی سوار ہیں
حیدری گفتاروں سے باخبر ہیں
ان کے پیمانے سرخ سونے سے بھرے ہیں
سونا عرشی فرشتے لاتے ہیں
امیدیں خواجہ سے جوڑتے ہیں
وہ بے خبر ہیں جو کہ اجاڑ میں دوڑ لگاتے ہیں
نہ ہی چھکڑے کندھوں پہ اٹھا کر دوڑائے جاتے ہیں
چھکڑوں کو تو سبک رفتار نوکر کھینچتے ہیں
نوکروں کو سرکار کا حکم یہی ہے
رات منتخب لوگوں کے لیے ہر وقت روشن رہتی ہے
مومن و دین دار ہمیشہ توجہ میں رہتے ہیں
کوئی اور عورت پگڑی کو صابن شود نہ کرے
(کہ) آئے اور ہمارے تصوف کے اوپر کھڑی ہو جائے
قہروں والا میرا خدا، مہر میں آ
قید و بند میں پڑے ہوئے بندوں کو رہائی دے
اسی طرح جیسے میرال کو کافروں کی قید سے چھڑا لیا
جو ظالم و بے رحم کی قید میں تھے
امن و سلامتی کے ساتھ گھر لوٹے
(اسے) اپنے قبیلے کے سردار کا دربار دیکھنا نصیب ہوا
محبوبہ اپنے نازک ہاتھوں سے دھو ڈالے

اپنی ملوکانہ انگلیوں کے ساتھ
حاجی حج پر جاتے ہیں
میں بھی اپنے یاروں کے اختیار میں رہوں

مست ساری زندگی روحانیت کے گیت الاپتا رہا، الوہیت کے نغمے گاتا رہا اور عرفان و آگہی کے جوت جگاتا رہا۔ اس نے اپنی شاعری میں فلسفہ اور معرفت کے ایسے رنگین پھول کھلائے، جن کی مہک آج بھی دلوں کو معطر کرتی ہے۔ مست نے فلسفہ کے نازک مسائل کو ایک مستقل موضوع کے طور پر متعارف کرایا۔ اس نے بلوچی زبان کے ادب میں ایسے لافانی نقوش چھوڑے جن کی آب و تاب آج بھی نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ وہ آفاقی سچائیاں یوں بیان کرتا ہے:

ایک و یکی آ وث خدا جوانیں
بادشاہیں کہ نامے سبحان ایں
اغ قہاربی تہ زورو زور مانیں (1)
مہرواں بی تہ رحیم و رحمانیں
قہر و مہرانی قادریں ستار
مارہ غرضیں تئ روشنیں دیدار
مارہ ماں روشے قیامتا پیدار
مس دِہ چو مجنایاں گنوخ ساراں
باز وثی بالاذا (2) گہنگاراں
رحمتاں ربیغاں امید واراں
پہ تئ دیذارا ہوا داراں
پل صراطیں گوں بارغیں زیلا (3)
پارتے باث مئیں کانہلیں ڈیلا
گوئستغاں پیغامبر سوا لکھیں

ہڑ دو ہندانی عہد گوں یکّیں
بازمس راستیں پلوا سکّیں

[حاشیہ:1۔جوش،2۔قد،3۔دھار]

ترجمہ:

واحد ولاشریک خود خدا ہی اچھا لگتا ہے
وہ بادشاہ ہے جس کا نام سبحان ہے
قہار بن جائے تو اس کی قوت وزور بے حد وحساب
مہربان ہو تو رحیم رحمان
اے قہر ومہر پہ قادر ستار!
ہمیں تیرا روشن دیدار درکار ہے
جو روزِ قیامت ہمیں کرادے
میں مجنوں کی طرح دیوانہ ہوں
اپنی قد وقامت میں گنہ گار ہوں
رب کی رحمتوں کا امیدوار ہوں
تیرے دیدار کا طالب
پل صراط اپنی تمام تر باریکیوں کے ساتھ
میری کم زور جسامت کا خیال رکھیو
سوا لاکھ پیغمبر گزرے ہیں
دونوں جہانوں پہ ہمارا عہد استوار
کئی لوگ اس کے دستِ راست میں محفوظ ہوں گے

ایک ایک جگہ یوٹو پیا کے موتی، ایک ایک مصرع انجیل کی توضیح، ایک ایک لفظ میں فلسفہ کی موشگافیاں۔ یہ باب تو واقعی کسی بڑے عالم کو لکھنا چاہیے۔ میں تو بس عظمت کی بے کراں روشنی میں سے محض ایک کرن کے ایک ہی ویولینگتھ کو ناپ سکوں گا۔ آگے پر جلتے ہیں کم شعوری کے، شعور کے۔

یوٹو پیا اور بالخصوص مشرقی یوٹو پیا خدا کے وجود کے بغیر ممکن نہیں۔ اور خدا کے ساتھ یوٹو پین کے بہت گہرے، بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ کہیں اُس سے فریاد کرتا ہے، کہیں اُس کی اپنی شکایت کرتا ہے اور کبھی کبھی تو مان میں آ کر حکم چلاتا ہے۔

مست کے فلسفے میں خدا، رسولؐ، چہار یار، علیؓ اور اس کا خاندان، اور برصغیر کے اولیا آپس میں یوں پیوست ہیں کہ ایک دوسرے کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پتہ نہیں مست کیا ہے، موحد بنتے بنتے نہ بنا، شیعہ بنتے بنتے رہ گیا اور شاید یہی گنجلک صورت حال راہِ حق کے کھوجیوں کو اصل منزل کے قطب نما کی راہ سجھا دے۔ آیئے ایک دو مثالوں سے دیکھیں کہ وہ کس حد تک خدا، محمدؐ، اور آل محمدؐ سے وابستہ تھا۔

ہرکسہ روث او وث خدا کوشتی
یہ وشہ بیٹو تی کئے ءَ گندی
دوستہ نورانی چادرہ توخاں
گوں وثی مہراں نیخ نظر گندئے
کارژہ ڈاڈایا کڑو بیشہ
گیشتر اَژ درگاہا خذائیا
مس ہواں روشا مِنّاں مَنّاں
(کہ) شاہ پرے اظہارا بڑ تئ بڑزا
آڑتغا پریشتغاں دو رنگیناں
داثیش عمّایا اَمُلّ ئیغا
چکشہ گوخانی نریں روڑاں
زڑتغا لوکاں دل مہ چنڈیناں
کم طمع زونگاں دڑ دوندیناں

آں ِکرا بیڑی آں رووخیناں
مزلاں بارکشاں اوو ملکاں
آں دے مں با غاناں بہشت ئیغاں
چی ئے ژا ڈاتانی درا بیاری
او اذا گوئرلالہ پتنڑا داری
مست پر بہنڑہ اُچھّل و لاہاں
لہر لیٹنتی تربتی واہاں
عرش و کرشی و اکبری شاہاں
تریٹھوں پیر مڑدے اُراں جاہاں
باغلاں باث شہر کہیوانی
یکّ تہ پاکئے بازگناہ ٹالیں
بادشا ہے کہ بڑزو بے سیالیں
قدرتاں و ستاذو ہمو تالیں
پارتے باث کہ بے کساں پالیں
جنگیں گوں حونی آں حسین ئیغاں
گوناں گوں ٹولی آ امام ئیغاں
مست گوں معصوماں اَمُل ئیغاں
شاھہ اسباب و گہنوری تیغاں
حضرتی دیم وتنگویں رِیشاں
شاہ تئ ابروآں دو گلئیاں
مسک مندیل مں بیر مَیں پاغا
شَرّہ پیچی مں زامریں جُبّاں
اسپرے پلّیں مں سرے داراں
رَذ کناں کاٹارا جزیدئیغا
سنگتی آ گوں جانلہ جھونٹاں

وہش دلی آ گوں لالنڑا گھوٹاں
دوست تئ نیخیں نیتاں لوٹاں
اے دنیائی ئے حرفت وہَچّاں
کوڑوئے چیار روشی جن وبچاں
جی پرے جواں مڑداں اوو سچّاں
قدرتاں اوساراں اِلاہیغاں
قدرت وپرموذاں لقائیغاں
دادن وبشکیشاں سخی ئیغاں
نُزبتاں وہشیناں صمدئیغاں
پکغیں باغاں بادشاہی آں
بادشاہ جواں مڑدیں نوی ہیشہ
سانگ سیرانی گوئے گوں ہیشہ
سوب اِن وشیرارا مڑاگاہیں
خوش وبھونش ایں کہ ہردمے دراہیں
خوب چاندی و چا ڑد ہی ماہیں
جنگ گڑدانی پہلواں شاہیں
عہد مڑدانی شان برجاہیں
یاعلی اللہ و اناغاہیں
مشکلاں حاضر بنت حضور جانی
نووتے نازل بنت دلیلانی
گنجیں دلی آ داں حراسانا
دو قلندر پہ ربہ فرمانا
ہڑدوئیں یاراں یاعلی شانا
مست جالی مں کوہ سلیمانا
پارت و حب ئے حید ری دھیانا

ترجمہ:

ہر کوئی فنا ہو جائے گا، فقط خدا رہ جائے گا
وہی رہ جائے گا، دوسرے کو گنتا ہی نہیں ہے
دوست کی نورانی چادر میں ہوں
تو اپنی محبتوں سے، نیک نظر سے ہمیں دیکھیو
معاملہ دادا آدم سے شروع ہوا تھا
زیادہ تر خدا کی درگاہ سے
میں اس روز کا احسان مند ہوں
جب اس نے رسولؐ کو اظہار کے لیے معراج پر بلایا
انھیں دو طرح کے فرشتے لائے تھے
اپنے محبوب کو سونپ دیا
گائے کے نوجوان بچھڑوں نے انھیں کھینچا
توانا اونٹوں نے انھیں اٹھایا
کم طمع اونٹوں ہم درد اونٹوں نے
اس پار تیز رفتار کشتیوں نے
بوجھ اٹھا کر ملکوں ملکوں تیز رفتاری سے چلتے ہیں
وہ بھی بہشت کے باغوں میں ہیں
بخشش کی درگاہ سے کچھ لائے
وہاں لال کے پتن پر لا کر نچھاور کر دی
مست کیفیات میں بدمست ہے
اس پہ لہر در لہر کیفیات طاری ہوتی ہیں

عرش و کرسی اور اکبری عنایتیں ہیں
وہاں ایک بزرگ سن مجھ سے ملا
اداؤں کا شہر شاداں رہے
ایک تم پاک ہو گناہ دفعان کرنے والے
بادشاہ ہو بلند اور بے نظیر
قدرتوں کے مشاق ہو بسیار ہنر ہو
تمہیں پارت ہو بے کسوں کو پال لینا
ہماری جنگ ہے حسینؓ کے قاتلوں سے
میں شامل ہوں امام کی ٹولی میں
مست محبوب کے معصومین کے ساتھ ہے
شاہ کے اوزار اور تیغ ہائے آبدار کے ساتھ ہے
نورانی چہرہ اور سنہری داڑھی
شاہ کے دونوں پھول جیسے ابرو
خوشبودار خود اور دستار مبارک
زامر جیسے دستار کو تہہ در تہہ باندھ کر
پھولوں سے بھری ڈھال اس کے سر پہ سایہ فگن رکھوں گا
اسے یزید کے خنجر سے بچا کر لوں گا
میں اس محبوب کی سنگتی کروں گا
خوش دلی کے ساتھ اس لال کا ساتھ دوں گا
اے دوست میں تیری خوش نودی مانگتا ہوں
اس دنیا کے حرص اور لالچوں سے غرض نہیں
چار روزہ زندگی میں بیوی بیٹوں سے غرض نہیں

شاباش ہوا چھے انسانوں پر صادقوں پر
جو الٰہی کی قدرتوں کی تعریف کرتے ہیں
اس کی قدرت اور فرمانوں کی توصیف کرتے ہیں
(اس) سخی کی نعمتوں عنایتوں کی توصیف کرتے ہیں
(اس) بے پرواہ کی میٹھی نعمتوں کی توصیف کرتے ہیں
(اس) شاہ کے پکے ہوئے باغات کی توصیف کرتے ہیں
بادشاہ تو ''اچھا شخص''، یعنی نبیؐ ہو گزرا ہے
جو شادمانی کا علم بردار ہے
فتح اور بہادری شیر یعنی علیؓ کی ہے
(علیؓ) خوش مسرور اور ہر دم سلامت ہے
(علیؓ) چاندی جیسا چمک دار چودھویں جیسا چاند ہے
جنگ بازوں کو پچھاڑنے والا پہلوان ہے
جواں مردوں کا قول وشان ہمیشہ قائم ہے
حضرت علی انا گاہ ہے
مشکل وقت پہ آن موجود ہوتا ہے
آپ پر دلیل بھری فتوحات نازل ہوتی ہیں
پر گنج دلی سے لے کر خراساں تک
دو قلندر ہیں خدا کے حکم سے
دونوں حضرت علی کے یار ہیں
مستؔ کوہِ سلیمان میں رہائش پذیر ہے
اس کے دیہان میں علی کی حُب، علی کا خیال ہے

****

شیئر

یار کڑ بنت ژہ جاگہ او لیناں
ژہ خمارا او رتکغیں عیناں
سیبتی آ گوں داثغیں دیناں
دئے ہواں چی آں کہ منے میناں
پکغاں باغ و بر ہموذاتیں
سیرن و گھوٹاں را مُلاخاتیں
یا علیؓ شیرے بہادری ہاکیں
امتئے والی ئے ہمے تاتیں
مُلک منی ایں کہ خاوندئے ڈاتیں
توکلی مستئے عاشقی گوانکیں
ابلیسا را جھیڑو وجھاکیں
پاغ محمدؐا لکھ موارکیں

ترجمہ:

یار اپنی جگہ سے جدا ہوتے ہیں
خمار سے اور آنکھوں میں سرخی لا کر
صحیح سلامت اپنی سخاوت کے زور سے
مجھے وہ کچھ دے جس پہ میں فریفتہ ہوں
ہر قسم کے باغ و بر تیار ہیں
دولہا دلہن میں ملاقات ہے
حضرت علیؓ کی بہادری کا شہرہ ہے
امت کے والی کا یہی ارشاد ہے
ملک میرا ہے کہ خدا کا دیا ہوا ہے
توکلی مست کی عاشقانہ صدا ہے

ابلیس کو جنگ و جھگڑا درپیش ہے
دستار محمدؐ کو مبارک ہو
****

شیئر

تڑساں ژہ زور کاراں قہاریغاں
چی اے تئ کارانی ازل گیراں
چی اے تئ مہرانی فضل گیراں
دوست مناں پڑدہ اے نقل داری
چم اژہ مہرانی درا گواری
شربتاں پاک ایغاں منہ لوٹاں
ہردورنگانی شیشغاں لالیں
نوشِشت شاہئے جگنغیں بچاں
پیالوے نوشاں کاغذیں رکاں

ترجمہ:

میں قہار کی زورکاری سے ڈرتا ہوں
میں کچھ تو تمھارے کاموں کا ازل سے تابع ہوں
اور کچھ تمھاری محبتوں کی امید رکھتا ہوں
محبوب نے پردہ حائل کر رکھا ہے
آنکھ محبت کے در پہ برستی ہے
پروردگار کی شربت کا طالب ہوں
جو ہر دو رنگوں کے شیشوں میں ہے
جو شاہ کے فرزند نوش کرتے تھے
میں باریک ہونٹوں سے ایک جام پینے کا آرزومند

****

یا محمد شیر سخن سچیار
تنگویں تاج و بے گریں ڈاتار

ترجمہ:

محمدؐ، گفتار کا شیر اور سچا ہے
اس پہ طلائی تاج ہے جو بے مثال سخی ہے

****

مار اللہ او یا علی یاتیں
اژ پڈا دوست و دژمناں تاتیں

ترجمہ:

ہمیں اللہ اور علی یاد ہیں
دوست و دشمن بیٹھ پیچھے باتیں بناتے ہیں

****

بی بی ئے بچا ں ڈسشہ راہ پہ امتی
دژد وندا ں راسوب ژہ درگاھہ ڈھی
مستہ بیڑا پار بھیڈی وڈبری

ترجمہ:

بی بی فاطمہ کے بیٹوں نے امت کو راہ دکھادی
اہلِ درد کو درگاہ سے فتح نصیب ہوئی ہے
مست کا بیڑا پار ہوگا، پانسہ پلٹے گا

****

ہم کتاب کے آخری حصے میں ایک بار پھر لفظ ''مست'' کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بلوچی اورل پوئٹری میں تخلص موجود نہیں ہوتا۔ ہمارے دانا اور باشعور شعرا تین چار سو مصرعوں پر مشتمل ''شَیر'' کے کسی حصے میں اپنا مشہور شناختی آبائی نام اڑس دیتے تھے. ''مست'' نہ تو توکلی کا اپنا نام تھا، نہ اس کی برادری اور قبیلے کا، اور نہ ہی تاریخ میں کسی اور کا نام رہا تھا۔ توکلی والا مست تو لوگوں (چرواہوں، کسانوں، عام انسانوں) کا عطا کردہ لقب تھا۔ ایسا ٹائٹل تھا جو لوگوں کا، عوام کا دیا ہوا تھا۔ (1) اور عوام کے اندر کسی کا آبائی نام کی بجائے دوسرا نام پڑ جانا بہت غیر معمولی، دوررس اور گہرے اوصاف کی بنا پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ مست کو تونسہ شریف سے لے کر تربت تک، لسبیلہ سے لے کر لاڑکانہ تک اور کندھار سے لے کر کندھ کوٹ تک اسی نام، اسی وصف سے پہچانا جاتا ہے۔ اور یہ وصف ہے دیوانگی والا، مجنونیت والا۔ اور یہ بات صرف مست تک محدود نہیں، گوئٹے کے بقول دنیا میں جتنی بھی عظیم ہستیاں گزری ہیں وہ ہمیشہ مدہوشانہ اور مجنونانہ القاب سے یاد کی گئی ہیں۔ (2) جس کسی نے بھی مروج سے ہٹ کر بات کی، رواج سے ہٹ کر کام کیا وہ ساحر بنا، یا مجنوں قرار دیا گیا۔ چنانچہ مست کا مست مقطع اور تخلص والا مست نہ تھا (مقطع بھی بلوچی اورل پوئٹری میں نہیں ہوتا)۔

سوچیے، اگر ایک قبائلی سماج میں کوئی شخص ایک شادی شدہ خاتون سے محبت کرے، اس محبت کا اعلانِ عام کردے، اس خاتون پر شاعری کرے، اس شاعری کو موسیقی کے ساتھ گائے، شادیوں، کچہریوں، جرگوں، اجتماعوں میں سنائے تو لوگ اسے مست نہیں تو عقل مند (زمانہ ساز) کہیں گے کیا؟۔ اگر کوئی شادی، خانہ آبادی، دنیا، دنیا داری، رسم، رواج، ثقافت، غیرت اور بلوچیت نامی تمام قیود سے ماورا سلوک کرے اور کرتا ہی چلا جائے تو لوگ اُسے پاگل نہیں تو کیا مسلم لیگ والا کہیں گے؟۔ اگر کوئی شخص برادر کشی کی قتل گاہ، بلوچستان میں بندوق پھینک کر موسیقی کا آلہ تھامے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دوڑے، مرد ہو کر آنسو بہائے، بے چینی میں سندھ و ہند پاٹے، ابدی آفاقی اچھائی بولے مگر نماز نہ پڑھے، ماتمیں بخشنے کی بجائے برکتیں بانٹے، وطن وطن چنگھاڑے مگر زمین کے کسی ٹکڑے تک کا مالک نہ رہے۔ سردار کا اوطاق برت کر عوامی فلاح چلائے یا سمو کا موڈ

ٹھیک کرنے بادل بلائے مینہ برسائے، پیاسے پہاڑی جنگلی جانوروں کو سیراب کرے.....ایسا آدمی ہی عوام کی جانب سے مست کا لقب پا کر رہے گا۔ سو یہ لقب تھا، تخلص نہ تھا۔

اور یہ لقب عطا کرانے والا فیکٹر تو محبت ہی تھا۔ اور محبت وہی انسان کر سکتا ہے، جسے محبت ہو چکی ہوتی ہے۔ محبت کا ادراک، اس کی تفہیم ہو چکی ہوتی ہے۔ مست نے جب محبت کا ذائقہ چکھا، جس لمحے وہ سمجھ گیا کہ محبت کیا ہے، تو پھر وہ محبت ''بن'' گیا۔ تب اسے محبت کیے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ نہ ہی اسے محبت کرنے کی کوئی ضرورت ہوئی۔ محبت اس کا سادہ، خودرو، وجود بن گیا، وہ صرف محبّ بن گیا۔ اسے انعام میں بھی محبت کرنا ملا۔ محبت حاصل کرنے کا انعام اس نے تلاش ہی نہ کیا۔ اب ایک سراپا محبت والا وجود مست کا لقب نہ پائے تو بھلا اور کیا کہلائے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''مست'' کا لفظ شعری ضرورت نہ تھا۔ شاعری سے بہت قبل وہ یہ نام جیت چکا تھا۔ ایک سماجی بات کہہ کر، اس سماجی پیغام کو پھیلانے کے لیے ایک مخصوص صورت اپنا کر، اُسے عمل میں برت کر ہی وہ مست بن چکا تھا۔ اس سماجی پیغام کے بارے میں ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ اسی سماجی پیغام کے ابلاغ کے لیے کوئی تو میڈیم چاہیے تھا۔ اور وہ ممکنہ میڈیم اُس زمان و مکان میں شاعری کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔

مگر خیالات کہاں پہ جلا پا سکتے تھے، نیا آکسیجن کہاں سے مل سکتا تھا، خیالات کا تبادلہ کہاں ہو سکتا تھا۔ مست کی سماجی تحریک ایک ایسے معاشرے میں بنی چلی جہاں رسل و رسائل آلات والے نہ تھے، آبادیاں منتشر تھیں۔ کوئی اکٹھ، کوئی مشاعرے، کوئی ادبی تنقیدی نشستیں، قراردادیں، سیمینار، شامِ غزل، اخبار نہیں تھے۔ سکول، ماسٹر، مکتب نایاب تھے اور سارا وطن بے خواندگی، لاٹھی بھینس اور بھوک افلاس والا تھا۔ لے دے کے اپنے علاقے سے بہت دور واقع پیروں ولیوں کے درباروں کے دانش ور (فقیر سجادہ نشیں اور خلیفہ وغیرہ) ہی تھے۔ اور مجھے امید ہے کہ ہمارے سندھ کے قاری مست کے عہد (1831-1896) میں شہباز قلندر اور بھٹائی صاحب کے گدی نشینوں کے کوائف، اور اسی طرح جنوبی پنجاب کے قاری ہمیں سخی سرور اور ملتان کے اولیا کے مجاوروں، ان کے اقوال، ان کے کلام وغیرہ کی تفصیل مہیا کریں گے۔ اس سے ہم سب کو مست کے شعور اور تخلیقی

ارتقا کے ادراک میں مدد ملے گی۔اسی طرح پھر قبائل کے سربراہوں، ان کے مصاحبین اور وہاں آنے جانے والے فہمیدہ مسافروں کے ساتھ نئے نئے خیالات پہ گفتگو اور تبادلہ خیال ہوسکتا تھا۔

دانش کے انھی میسر مراکز میں مست کے خیالات کو بڑھوتری کے مواقع ملے۔یہیں اس کے شعور کی اٹھان ہوئی۔تفکر اور غور کا سامان لیے وہ پھر جنگلوں، غاروں، ریت کے ٹیلوں، سمو کے قافلوں کے رہ گزاروں میں استغراق پانے نکل جاتا۔واقعات کا تسلسل دیکھیے ایک عام چرواہا عشق میں کودا، اپنی ساری حیات کے ساتھ سب کچھ وہیں رہن رکھ کر مجنوں بنا، اس جنون میں جہاں گردی کی، اہلِ دانش سے شناسائی ہوئی، ان کی دانائی پہ اپنی تفکر کے خزینے انڈیلے اور فکرِ مست تخلیق ہوا۔یوں ایک بے خواندہ، عام قبائلی چرواہا، مفکر بن گیا۔تخت و تاج کے جاہل وارثوں سے زیادہ معتبر، جاہ وحشمت کے خاوندوں سے زیادہ مکرم۔مفکر مست، مجنوں مست، محترم مست۔

توکلی، تو مست پہلے ہی تھا۔مہر کی تجلیوں نے اس کے سارے اعصابی خلیوں کو جام کر کے اپنا مطیع بنا ڈالا تھا، سماج کے ٹیڑھ پن کی وجہ سے کثرت یافتہ جنون نے عشق کو مزید بھڑکا دیا اور عشق جنون کو تیز کرتا رہا۔ایک جدلیاتی روانی چلتی رہی۔پھر اسی نیم جنونی کیفیت کو یہ نابغہ اپنے پیغام کے لیے خوب خوب استعمال کرنے لگا۔

ویسے بھی ایک ابتدائی فرسودہ سماج میں اس قدر بلند آدرشوں کی تبلیغ کسے نارمل رہنے دیتی ہے۔ایک نارمل توکلی، اُس وقت کے سٹیٹس کو والی اقدار اور اُن اقدار کی زور آور قوتوں کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔جنون سماجی پیغام دے گیا اور سماجی پیغام جنون کے درجے بڑھاتا گیا۔جان کی سلامتی اور مشن کی وسعت دونوں متقاضی تھیں کہ یا تو خود توکلی اپنی زندگانی کی ہیئت بدل ڈالے یا پھر مروجہ اسباب وعلل اسے ابنارمل بنا ڈالیں۔مست نے یہ عقل مندی کی کہ مہم جوئی کر کے خود کو اگلتی بندوق سے خاموش نہیں کروایا بلکہ 'مجنا' بنتا گیا، مستالائی اس پہ طاری ہوتی گئی۔وہ مستالائی پہ طاری ہوتا گیا۔

عاشقی ئے ترھغه حده بے هوش کڑم

چه نه هوش لرم نه سرا و سامان

رحمٰن

ترجمہ:

عشق نے اس حد تک مجھے بے سدھ کر دیا ہے

کہ نہ مجھے ہوش ہے، نہ سر ہے نہ سامان ہے

جنگ باز معاشرہ میں امن کی بات بیورغ جیسا شیر ببر نہیں کر سکا تھا، شہ مرید جیسا بہادر نہ کر سکا تھا مگر، ہمارا توکلی کر بیٹھا۔عشق کی نجات اور مہر کی آفاقیت کا پیغام سردار بن کر، مارشل لا والا بن کر، ملاّ مولوی ہو کر، زندگی کی ساری سہولتوں میں غلطاں ہو کر نہیں دیا جا سکتا تھا۔یہ وقتی کام بھی نہ تھا۔جدائی کی سچّی بناتی آنچ ضروری تھی، انتظار کی موت سی شدت رکھنے والا ایندھن چاہیے تھا۔سو، دن گھسٹتے چلے گئے، مست ہزاروں منصوبے وصل کے بناتا رہا، اپنے آپ سے، ویرانے سے، اتھاہ خاموش فطرت سے باتیں کرتا رہا، اپنے رویوں کے بدلنے کے ہزار قول کرتا رہا.....عشقِ ناتمام، مہرِ ناانجام اُس کی بے قراری بڑھاتا رہا، اس کی تڑپ بڑھاتا رہا۔مست اپنے محبوب میں، اپنے معبود میں، اپنے مخدوم میں، اپنے مقسوم میں مدغم ہوتا گیا۔خود ہی پیغام، خود ہی پیغام رساں، خود خطیب خود مخاطب۔سکون بے سکونی بن گیا تھا، خوف بے خوفی میں ڈھل گیا، بے خوفی ذمہ داری بن گئی، ذمے داری حیا، شرف اور انسان دوستی کی صورت اختیار کر چکی۔جنون اور کیا ہوتا ہے، مستی اور وارفتگی اور کیا ہوتی ہے، توکلی پن اور کیا ہوتا ہے؟۔ہمارا اُسے سلام ہے۔

چه په مینه کی مجنون غوندے صادق وی

رحمٰن وائی په هغو باندی سلام

ترجمہ:

جو محبت میں مجنوں کی طرح صادق ہوں

رحمٰن ایسے لوگوں پر سلام بھیجتا ہے

اور اگر یہ مستی خداداد نہ بھی ہوتی تو اسے تو ایسا کرنا ہی پڑتا۔اتنی بڑی نعمت ملنے والی ہو اور آپ رسک نہ لیں تو کدّ و کہلائیں گے آپ۔بتایئے عشق ایجاد کس نے کیا، عشق کو سنوارا سینچا کس

نے، عشق کو حسن بخشا کس نے، عشق کی تکریم کی کس نے، عشق کو تکمیل عطا کی کس نے؟ جنون نے، جنونیوں نے، پتونی نے، مایا کوفسکی نے، چے نے، مست نے۔ ایسے لوگ جنونی اس لیے کہلائے کہ انھوں نے صرف محبت کی ہی نہیں، اُسے سمجھا بھی ہے، اُسے بانٹا بھی ہے۔ اور سائیں! محبت کی تفہیم آپ کو قراۃ العین طاہرہ بنا ڈالتی ہے، آپ کے پرزے اڑا دیتی ہے۔ آپ سے بلوچستان، سندھ، جنوبی پنجاب، دھلی حتیٰ کہ عربستان تک امن، خیر، برادری، برکت اور مہر کا الہامی پیغام رسانی کرواتی ہے۔

سمو تو بہانہ تھی، حسن تو بہانہ ہے (مہرباں بیثو بہانغے سموئے کتئی)۔ مگر عشق دیوتا نے دیکھ بھال کر، ٹھونک بجا کر، اپنی مکمل تسلی کر کے عامل اور معمول کا انتخاب کیا تھا۔ بلاشبہ سمو مست پہ پاگل پن کا پہلا وائرس پھینک گئی مگر اُسے ''مجنون آباد'' کی مکمل شہریت دلاتے دلاتے خود بھی چیخوف کے ''وارڈ نمبر چھ'' میں داخل ہوگئی۔ وہ حسن بنی، حسن عشق میں ڈھلا، عشق امن بنا، امن نے خیر چاہا، خیر نے عشق کی آزادی چاہی۔ سمو درمیان میں کہاں رہی۔ سمو تو خود اس محلول میں حل ہوگئی اور پھر جب فلسفہ کو ابلاغ کی ضرورت پڑی، تو سمو ذریعہ بننے آن حاضر ہوئی۔ وہ آن حاضر ہوئی تو پھر وہی موجود رہی۔ وہی مجسم شکل بن گئی ہر اچھائی کی۔ سمو مجسم فلسفۂ آزادی۔ مست دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنا فلسفہ اپنا پیغام تک تج سکتا تھا سمو کے لیے کہ وہی تو اس کے فلسفے کا مظہر بن چکی تھی۔ تو کلی جو کام تو کلی پن میں نہیں کر سکتا تھا، وہ اس نے ''مستی'' میں کر دکھایا۔ خود امر ہو گیا، اپنی سمو کو امر کر گیا اور اس سماجی پیغام کو بھی کل عالم تک پہنچایا جس کے لیے روح القدس نے اُسے چنا تھا۔ اور گو کہ اُسے اس راہ میں سخت جسمانی تکالیف بھگتنا پڑیں اور بہت بڑے نفسیاتی گھاؤ کھانے پڑے مگر عشق کے سٹاک ایکسچینج کی کم سے کم شرح یہی ہے، وہ تو بکتا ہی اسی بھاؤ ہے۔

ابھی ٹھہریے میرے محترم قاری! کہ آپ کو ثبوت چاہئیں اور میں نے کچھ محنت کی ہے آپ کی تسلی کے لیے۔ اور آپ کو تسلی ہونی چاہیے کہ سماجی انصاف چاہنے والوں کے قافلے میں ''چٹی چادر لاہ'' کے بغیر، ''پہن فقیراں لوئی'' کے بغیر، شامل ہی نہیں ہوا جا سکتا۔ اور تو کلی مست نے سب سے پہلے اپنا آئیڈیل چنا:

عشق ہوا نہاں کہ لیلو و مجنا یا کتاں
(عشق وہ جو لیلیٰ مجنوں نے کیا تھا)

پھر خود اعلان فرمایا:

سملئے بیلی گنوخیں
(سمو کا محبوب پاگل ہے)

اولین مرحلہ طے ہو گیا ناں کمٹ منٹ (جنون) کا؟ کوالیفائی کر گئے ناں اس میدان میں اترنے کو۔ اب پھر عمل میں دیکھیے:

تام مناں نیتیں مس وراں درشکانی براں
پلیں ہنجیران او پتریکانی سُر براں

ترجمہ:

میں طعام نہیں جنگلی میوے کھاتا ہوں
پھول سے انجیر اور پتریک کے کا سرخ پھل

تب اس نے کمٹ منٹ (جنون) کا یونیفارم بھی پہن لیا۔ سفید چادر اتار، فقیراں لوئی پہن لی۔ یہ یونیفارم کوئی متشکل صورت میں تھوڑی ہوتی ہے؟ یہ تو:

سملئے سالانی زہیراں شنکینتغاں
(سمو کی برسوں کی یادوں نے بکھیر کر رکھ دیا ہے)

یادیں، یونیفارم۔ درد، وردی۔ لولا کی محبت، شناختی کارڈ!!

مست باقاعدہ اپنے پاگل پن کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا۔ یہ داؤ پیچ نہیں تو کیا ہے؟ آپ خود کو پاگل پن کے نیچے کیموفلاج کیوں کرتے ہیں اگر آپ کے پاس کرنے کو بہت بڑا کام نہ ہو؟۔ کوئی عام آدمی بھلا کہہ سکتا ہے؟ کہ،

روحہ رولو آں دل گنوخیں پہ سملا

ترجمہ:

میں روح کا جہاں گردہوں، سمو کے لیے دل پاگل ہے

یا.....

مس دے چومجنا یا گنوخ ساراں

ترجمہ:

میں بھی مجنوں کی طرح نیم پاگل ہوں

پھر اسی گنوخی میں، اسی پاگل پن میں، اسی وارفتگی، اسی جذب، اسی سالکی میں وہ اپنی ساری شاعری تخلیق کرتا ہے؛

روح گنوخیناں نشتغو شیرانہ جناں

ترجمہ:

میری روح پاگل ہے، بیٹھ کر شاعری گاتا ہوں

کیا پاگل شخص شاعری کرسکتا ہے؟ میرا یار' کا ڈویل تو کہتا ہے کہ، ''عظیم شاعری صرف ایک آزاد فرد ہی کرسکتا ہے''۔(3) اور آزاد تو آپ شاہی قلعہ میں مقید زنجیروں جولانوں سے جکڑے ہوئے بھی رہ سکتے ہیں۔ آزاد اور نجات یافتہ تو وہ ہے جو انسانیت کا بھلا چاہے، عالمی امن کا خواہاں ہو، سب کی خیر کا طالب ہو۔ اور صرف ایک آزاد فرد ہی چیخ کر کہہ سکتا ہے:

نی میں کملی ہاں!

اور یہی کملی، یہی مجنون، یہی مست تو بلوچستان کی روح کا استعارہ ہے جس کے افکار بلوچستان کے شعور کی روشنی اور جس کے نغمے ہمارے دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک ہم ہی نہیں وطن کی زمین کا ذرہ ذرہ اسی آفتاب سے جگمگا رہا ہے۔

اب پھر جب مست جیسا شخص خود ہی چاہتا ہو کہ اُسے پاگل یعنی مست بولا جائے تو اُسے صرف تو کلی کہنا تو بے حرمتی کے زمرے میں آئے گا ناں؟۔ جناب، حضرت اور صاحب وغیرہ

جیسے القاب بلوچی زبان میں ہیں ہی نہیں لہذا وہ ''مستیں'' بن گیا۔ یہی استعمال کرنا پڑے گا سائیں وگرنہ ناراض ہو جائے گا وہ، جو بہت اترا اترا کر، اٹھلا اٹھلا کر کہتا پھرتا ہے:

دل منی مجنابی ہماں روشی

بِد و بیزاراں مست و مدہوشی

ترجمہ:

دل میرا مجنوں اسی روز ہو گیا تھا

بِد کا ہوا ہوں، بیزار ہوں، مست ہوں، مدہوش ہوں

اور اسے ناراض نہ کرو ساتھی، وہ بہت پکا ہے اپنی بات کا:

مست پہ میٹرومنتاں سر یہالہ نہ وی

ترجمہ:

مست کا جنون میٹر ھ اور منتوں سے دور نہیں ہو سکتا

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ناں کہ وہ کتنے فخر سے، خود کو گنوخ، مست، مدہوش کہتا جا رہا ہے۔ جان بوجھ کر۔ گویا ایسٹیبلش کرنا چاہتا ہو اپنا پاگل پن:

اشتہ مس تڈا گوں گنوخ شلّی عقلاں

ترجمہ:

ہم نیم جنونی عقل کے ساتھ مہمان خانہ سے روانہ ہوئے

یا.....

پلو ے ماخ و پلوے گدّا

ہر دوں ما جوانیا نہ اوں سدھا

ترجمہ:

ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے گدا
ہم دونوں نیم پاگل ہیں

یا.....

اے گنو خیناں ، گو شتناں میغانہ نہ گیڑت
بیانواں پوہ بئے ، تہ گنوخانی اٹکلاں

ترجمہ:

یہ پاگل ہے، ہماری بات نہیں مانتا
آؤ شاید تمہیں سدھانا آئے پاگلوں کو

یا.....

نیں گنوخ کایئے مس سرا قربانت کناں

ترجمہ:

اے پاگل (مست)، اگر اب آجاؤ تو تمہارے لیے سر قربان کروں گی

یا.....

پاذا، او، دیوانع ترا درمانے کناں

ترجمہ:

اٹھو، اے پاگل (مست)، تمہارا علاج کرتی ہوں

یا.....

نَیں گنوخ گڑدی نیں کہ سہرابی چراغاں

ترجمہ:

نہ پاگل (مست) واپس آتا ہے نہ واپسی پہ کہیں نظر آتا ہے

یا.....

اے ہواں ترنپ انت کہ گنو خادیم داثغاں
پہ گنو خانی گوئشتنا بستو آتکغاں

ترجمہ:

یہ تو وہی بارش ہے جسے پاگل (مست) نے بھیج دیا ہے
یہ بادل اسی پاگل کے کہنے پہ بنے اور آئے

یا.....

سمو گوں ماندائیں دلے نوذاں پولہ کاں
شوا گنوخ نیشہ پہ پوا دانی چرغا

ترجمہ:

سمو پیار بھرے دل کے ساتھ بادلوں سے پوچھتی ہے
تم نے پاگل (مست) کو نہیں دیکھا پہاڑوں میں پھرتا ہوا

کچھ تو ہے سائیں اس جنون، گنوخی، مستالائی، مستی اور سالکی میں کہ اسی کے حصول کی لوگ تمنائیں کرتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں:

راشہ یو زلہ می ھسے خراب کڑہ
چہ خبر نہ شم لہ حالہ دھیچ

رحمٰن

ترجمہ:

آجاؤ، ایک بار مجھے یوں خراب کردو
کہ مجھے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہے

مبارک کے بیٹے شہ مرید کو قول دینا پڑا:

قولیں کہ کلاں الکہہا
مس گوں ہماں مڑداں رواں
لنگ و ملنگ دیوانغاں

ترجمہ:

قول ہے کہ علاقہ چھوڑ دوں گا
میں ان لوگوں کے ساتھ چلا جاؤں گا
جو مست ہیں، ملنگ ہیں، پاگل ہیں

آپ کوئی چانس نہیں لے سکتے دوست، آپ کو کوئی چانس دیا نہیں دیا جا سکتا۔ سماجی تبدیلی کا مافیہ سب سے پہلے خود اپنے خالق کے حلیے کو مسخ کر چھوڑتا ہے۔ مست جتنے بڑے جی نیئس کو اگر تخلیق و تبدل کے حالات میسر نہ تھے، عوامی حمایت رکھنے والی بڑی اور منظّم پارٹی نہ دی گئی، بحث و مباحثہ کا پلیٹ فارم مہیا نہ کیا گیا تو وہ عام آدمی کی طرح کیسے پیش آ سکتا تھا۔ کہ وہاں (یہاں) ہر بلوچ سردار، لیغاریوں والا جمال خان ہے جو ہر انقلابی کی پاکیزگی کو ٹیسٹ کرنے کے بہانے زخمی کرنے، اور اس کو ''غیر سیاسی'' رکھنے کے لیے کسی نہ کسی طوائف کا انتظام کیے رکھتا ہے۔ توکلی کی مستی اور مستالائی بہت ناگزیر، بہت معروضی اور بہت ضروری تھی۔

حوالہ جات

1۔ سلویا میتھی سن۔ ٹائیگرز آف بلوچ
2۔ گوئٹے نوجوان ورتھر کی داستانِ غم صفحہ 64
3۔ کاڈویل، کرسٹوفر 1991-Illusion And Reality، پیپلز پبلشنگ ہاؤس نیو دہلی صفحہ 33

مست کی شاعری

زندگی کا شاعر

''حکیم! آپ نے شاعر سعیدؔ کی نظمیں دریا میں کیوں پھینک دیں؟''، پوچھا گیا۔

''سچی شاعری دریا میں بہائی نہیں جا سکتی، کیوں کہ وہ لوگوں کے دلوں پر نقش ہوتی ہے۔ اگر شاعری کی قدر و قیمت بھی اتنی ہی ہو جتنی اس کاغذ کی جس پر کہ وہ لکھی گئی ہو تو ایسی شاعری کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ شاعر سعیدؔ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ایسی نظمیں لکھنے کی بجائے جو لہروں کے ساتھ بہہ جائیں، کوئی ایسا کام کرے جو واقعی مفید ہو''۔

مگر، مست کی شاعری تو سرے سے کسی کاغذ پر درج ہی نہ کی گئی۔ یہ دو سو برس تک پاک انسانوں کے سینوں میں کندہ ہوتی رہی اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہی۔ میں تیس برسوں سے اُس کی شاعری کاغذ پر اتارنے کے لیے انسانی سینوں کی یادداشت کی فائل کو کاپی کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ مگر میں تھک گیا، سینے، یادداشتیں ابھی باقی ہیں۔ انسان کے لیے مفید بات کہو تو وہ تو زندہ رہتی ہے خواہ اُسے کاغذ کی زرخیزی اور قلم کا پانی دستیاب ہو نہ ہو۔ تحریر، آڈیو، وڈیو ای میل جی میل جیسی ساری سہولیات کی غیر موجودگی کے باوجود انسانوں کے لیے مفید مست کی شاعری نہ مری، نہ باسی ہوئی، نہ بدنیتی کے ساتھ تحریف ہوئی اور نہ کسی منصوبہ بندی سے ترمیم۔

ہم جانتے ہیں کہ مست کا زمانہ قبائلیت کا زمانہ تھا۔ جہاں معمولی زراعت ہوتی تھی۔ شکار اور خانہ بدوشی طرزِ حیات تھی۔ بھیڑ پال معیشت ہی اولین روزی رسائی کا ذریعہ تھی۔ اس لیے

وہاں تو شاعری ایک سحر، ایک سرخوشی اور ایک انبساط ہوتی ہے۔ شاعری وہاں کے ابتدائی انسان کی معصوم زبان اور اس کا پہلا ذریعہ اظہار و ابلاغ تھی۔ مست کی شاعری سماج میں اُس حساس ترین روح کے اندر سماجی مظاہر کی بازگشت تھی جسے وہ باصلاحیت عقل اپنے اندر کے بے شمار پیچیدہ پراسیسوں میں ڈھال کر تخلیق کا روپ دیتی تھی۔ مست کی پوری کتاب، داستانِ حیاتِ عشق سے لبریز ہے۔ اس میں نہ تخت کی توصیفیں ہیں نہ تاج کی تمنا۔ نہ ذکرِ حور موجود ہے، اور نہ فکرِ دوزخ۔ بس وصلِ یار کی خواہش، بس وصلِ یار کی تمنا، دھاڑیں مارتی تمنا، فلک شگاف خواہش..... جڑنے جوڑنے کا مشن، اکٹھ اجتماع کا پیام، رفاقت و ہم کاری کی وکالت۔ سچی بات یہ ہے کہ فن جب تک انسان ذات سے محبت کی گلی میں سے نہ گزرے اس کا کندن بننا ناممکن ہے۔ اور مست کے اس مہر کی وجہ تسمیہ، سہارا، مخاطب، مہمیز اور منزل سمو ہے، اس محبت کا شکار مست اور اس مہر کا خلاصہ کلامِ مست۔ مست کا حوالہ سمو، سمو کا حوالہ امن، امن کا حوالہ زندگی اور زندگی کا حوالہ انسان، انسان کا حوالہ انسانیت، انسانیت کا حوالہ ہارمنی، مسرت اور اطمینان..... اور اُس کی مرکز و محور تھا: انسان ذات کی خیر خواہی۔

اور انسانیت تو لازوال ہے۔ اس لیے انسانیت کو لازوال کہنے اور بنانے والا مست بھی لازوال ہے، اس کی شاعری لازوال ہے۔

ہجر کا شاعر

سماج خواہ قبیلوی ہو یا کوئی دوسرا، اس میں ہر شخص شاعر، فن کار اور تخلیق کار ہوتا ہے لیکن رجحان اور میلان اُس نکاس کا بندوبست کرتے ہیں جو ایک خاص شعبے کی طرف ہوتا ہے۔ مست کے ہاں یہ نکاس شاعری کی طرف تھا۔ مہر اس کا مہمیز بنی۔ فراق اس کا مددگار بنا اور حدت و شدتِ فراق نے گریہ کی صورت اختیار کی۔ اُسے ''رونا'' لگ گیا تھا۔ بقول اس کے استاد اور ہمارے مرشد، جام درک کے:

ہجر مناں موہیناں جنت پاساں
چو کہیرانی آڑویں آساں

بیقراراں میں نیم شفی پاساں
قہر املّانی گہگریں نازاں
داں دمے گا رو، داں دمے بازاں
زیلتاں ساسارے دیاں جانا
نہ نخناں ژہ دوستہ فرمانا
چو اسپرا دیپانہ کناں جانا
چابکہ چم و دیذہ پیکانا

ترجمہ:

ہجر کی گھڑیاں مجھے چرّ کے لگاتی ہیں
کہیر کی لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالتی ہیں
آدھی آدھی رات کو میں بے قرار ہو کر اٹھتا ہوں
محبوب کا صبر آزمانا' زقیامت ڈھاتا ہے
کبھی ناپید' کبھی فراواں
کاش فراق کے غموں سے ستانے کا موقع مل سکے
میں دوست کے فرمان سے سرتابی نہیں کر سکتا
میں اپنے تئیں سپر کے مانند پیش کروں گا
آنکھوں کے تازیانوں اور نگاہوں کے تیر و پیکاں کے لیے

اسی ہجر نے، اسی عشق نے مست کو قرار سے جینے نہ دیا، ڈھنگ سے کھانے سونے نہ دیا، بے خوابی نے اُس سے فریادیں کروائیں، یہی فریادیں اس کی شاعری بنیں، اسی شاعری نے اُسے جنم دیا، اسی شاعری کو اس نے جنم دیا..... اور یہی شاعری جنم جنم برگزیدوں کو جنم دیتی رہے گی۔

شانت اور شانتی

بلوچستان جیسے خطے میں انیسویں صدی کے اندر کسی بھی مست کی سمو، سمجھو سماجی تبدیلی کے ایجنڈے کا ایک اہم نکتہ تھا؛ رَو کے خلاف چلنے کا، عالم گیر سچائی کی تلاش کا۔ چاکر کے عہد سے لے کر مست کے زمانے تک اور عصرِ مست سے لے کر اکیسویں صدی تک مست کے مسکن علاقے میں سارا زمانہ قبائلیت ہی کا زمانہ رہا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس کی شکل کبھی تیز، اور کبھی نرم رفتار حملوں اور مزاحمتوں پر مشتمل جنگوں اور مادی دولت کے حصول کی بھاگ دوڑ کی پیدا کردہ بگاڑ کے بعد پھر اصل پہ آ جاتی۔ بغیر صفتی تبدیلی پیدا کیے شکست وریخت، جنگ وجدل، خون اور شعلے سر قبیلوی عہد کی بدصورت نشانیاں ہوتی ہیں۔ اس پس منظر میں مست کی آواز ایک نرم کھسر پھسر ہے؛ امن کی آواز، پھول کی پتی کی آواز، چاہت کی سرگوشی، محبت، بھائی چارے، خلوص اور ہم دردی کی خوش گوار آواز۔ مست کا یہ ایجنڈا شارٹ ٹرم والا نہ تھا بلکہ یہ تا حیات ایجنڈا تھا۔ اس آواز سے محبت کرنے والوں کے ساتھ مست بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس آواز کے حسن کو بھدا بنانے کے لیے کوشاں لوگوں سے مست بے پناہ نفرت کرتا ہے۔ مست نے بڑی استقامت، استقلال اور کامیابی کے ساتھ بلوچی زبان بولنے، سمجھنے اور سیکھنے والوں کو جتلا دیا کہ یہ دنیا حاکمیت اور رقبہ بڑھانے والوں کے گھڑ سواروں کے ٹاپوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ دنیا تو صرف اور صرف عالم گیر محبت کے لیے پیدا ہوئی، محبت ہی سے پیدا ہوئی، سمو کے لیے پیدا ہوئی اور سموہی سے پیدا ہوئی اور سمو کے ذریعے پیدا ہوئی۔ مست کی شاعری کا الف بھی سمو، ی بھی سمو اور درمیان کی ساری ضخامت، سارے ورقے، سارے صفحے، سارے اکھر سمو۔ وطن اُسی کا، رعیت اُسی کی، مست اُسی کا.....

هـر چـه آیـد در نظـر غیـرِ تو نیسـت
یـا تـوئـی ، یـا بـوئـے تـو ، یا خوئے تو

امیر خسرو

مست، سمو کی آڑ میں پورے سماج سے مخاطب ہوتا ہے۔ سمو، سمو اور فقط سمو..... بقیہ سارے مظاہر تو اس مہر، اس سمو کے ساتھی ہیں، بدرقے ہیں۔ مست کی اقدار میں، افکار

میں، کردار میں، گفتار میں مہر ہی مہر ہے، بے لوث، گہرا اور ہمہ گیر مہر۔

عشـق قهـار اسـت و مـن مـقهورِ عشق

مولوی

موسیقیت ،رقص و رِدھم

مست کی شاعری کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاعری کامل موسیقی ہے۔ ہم نے جب بھی محفل میں مست کا کلام خواہ تحت اللفظ سنا یا موسیقی میں، لوگوں کو انگلیاں بجاتے ہوئے پایا، شرکا کی گہری سانسیں گونجتے سنیں، آنکھیں آب دیدہ دیکھیں، فکریں گہری ہوتی محسوس کیں اور سروں کو جھومتے ہوئے دیکھا۔ بلا شبہ مست موسیقی ہے۔ اور موسیقی تو موسیقی کو ہی جنم دیتی ہے، موسیقی رقص کو جنم دیتی ہے۔ آپ نے کبھی معصوم بچے کو مشاہدہ کیا؟ بہت کم عمری میں جب وہ ابھی بول بھی نہیں سکتا، موسیقی پر سر ہلانے لگتا ہے، یا جھومنے لگتا ہے۔ معصوم بچے کو کس نے یہ جھومنا یا موسیقی کی ہم آہنگی میں سر ہلانا، یا تالی بجانا سکھایا ہوتا ہے؟۔ لگتا ہے انسان پیدا ہی گائیک ہوا ہے، وہ پیدا ہی رقاص ہوا ہے۔ بچہ سوچنے سمجھنے سے پہلے موسیقی کی آغوش میں آ جاتا ہے۔ موسیقی اسے بنا لیتی ہے، لَے اسے اپنا لیتی ہے، اور ہارمنی اس کی تربیت کرتی ہے۔ لوری اُسے سلا لیتی ہے، نازینک اسے جگا لیتی ہے۔

مست نے کئی دیگر راز بھی پا لیے تھے مگر اس کا معجزہ یہ ہے کہ اس نے بالخصوص یہ راز پا لیا تھا کہ موسیقی کُل کائنات پہ حکم رانی کرتی ہے۔ لَے اور آہنگ، فطرت کی جدلیات کا اہم ترین مظہر ہیں۔ ردھم اور ہارمنی آسمانوں کا نظام ہے۔ سماج میں ردھم کا بنیادی کردار اس کے مختلف حصوں اور نظاموں کو جوڑنا ہوتا ہے۔ کشش ثقل، ہوا، دھند، درخت، چٹانیں، جڑیں، زمین، جھرنا، سانس، اور حرکت ہمہ پہلو ردھم میں ہوتے ہیں۔ اور پھر بھلا کرہِ ارض پر ہمیں کوئی بھی قوم ایسی ملے گی جس کی موسیقی نہ ہو، جس کا رقص نہ ہو؟۔ کوئی ایسا سائنس دان، مفکر، فلسفی، ولی اور مقبول عوامی آدمی ایسا گزرا ہے جس کو موسیقی سے رغبت نہ ہو، جو لَے میں، سُر میں، اور آہنگ میں فطرت کی غزل الغزال نہ پڑھتا ہو؟۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ بہت سارے سائنس دان اور ریاضی دان خود موسیقار

رہے۔ دور کیوں جایئے خود بلوچوں کو دیکھئے؛ جب وہ حال حوال کر رہے ہوتے ہیں، دُراہی دشا تکی کر رہے ہوتے ہیں، قصہ سنا رہے ہوتے ہیں یا گا رہے ہوتے ہیں تو وہ باتوں سے رقص کر رہے ہوتے ہیں، باتوں کا رقص کر رہے ہوتے ہیں۔ گانے والے بہت مقدس ہوتے ہیں۔ جس شخص کے اندر موسیقی نہ ہو، یا جو میٹھی آوازوں کے جادو سے متاثر نہ ہوتا ہو وہ سازش و غداری کے لیے ہی موزوں ترین ہوگا۔ آپ کسی کے ساتھ جس قدر ہم آہنگی میں چلیں گے، اتنا ہی اس شخص کے قریب آئیں گے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی یہ بات کس قدر سچ ہے کہ: ''صرف رقص ہے''۔

رقص، مولانا کا رقص، موسیقی، کائنات کی موسیقی، کلام کی موسیقی، مست کے کلام کی موسیقی .....موسیقی حق ہے۔

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرورِ انجمن

اقبالؔ

اور پھر مست کی شاعری میں موسیقیت کسی صورت بھی خام نہ تھی۔ یہ موسیقیت نہ صرف مست کی اپنی خدا داد صلاحیت والی تھی بلکہ اس میں بلوچستان کی داخلی جینیاتی لَے بھی شامل تھی۔ بہتے دریا کی موسیقی، خوش الحان پنکھ پکھیرو کی موسیقی، بلند چٹانوں پہ اگے سرسبز درختوں کی سرسراہٹ کی موسیقی، خامشی کی موسیقی، تمناؤں کی موسیقی، فطرت اور منظر نگاری کی موسیقی، بلوچ معاشرے کی ہم آہنگی کی موسیقی، اس کی بھیڑوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی، چرواہے کے بغو، ڈَو، چنگ، شفیلی اور گیت کی موسیقی، کھیت پہ کسان اور بیلوں کی محنت کی موسیقی، پانی بھرنے والی عورتوں کے جاد پہ لگی گھنگھروؤں کی موسیقی، بارش کے قطروں کی برپا کردہ موسیقی..... مست نے ایک ایک سُر، ایک ایک راگ کو اپنے کلام کا جزو بنا دیا۔

اس کے علاوہ ہمارے پورے خطے کے سرداروں کے ہاں اس کا آنا جانا ہوتا تھا۔ وہ وہاں کا معزز ترین مہمان بنتا اور خدمت و مہمان نوازی کا مخدوم۔ موسیقی' سرداروں کے اوطاق کا تو ایک لازمی حصہ ہوتی تھی۔ مست بھرپور انداز میں لے اور سر کو اپنے پور پور میں جذب کرتا رہا۔

پھر ہر شادی اور خوشی کی تقریب میں مست کی شمولیت ایک برکت اور رحمت سمجھی جاتی تھی۔ ساز و نغمہ یہاں بھی اُسے وافر نصیب ہوتا۔

موسیقی سے مزین و مرغن و منور درباروں درگاہوں میں تو شعرا کا کلام باقاعدہ سروں میں گایا جاتا، نئے نئے سُر ترتیب دیے جاتے۔ مست نے موسیقی کی بھرپور تربیت یہاں پر لی۔

اور پھر' مست تو خود موسیقی تھا۔ سریندا نواز پیرکؔ کا بھائی مست، اس زمانے کے مشہور موسیقار چتواںؔ کی ہمہ وقتی رفاقت کا مالک مست، اور خود دمبیر و بجانے کا ماہر مست.....مست تو سراسر موسیقی تھا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مست کی شاعری میں نغمگی رچی بسی ہوئی ہے .....مترنم، کانوں کو اچھی لگنے والی شاعری، دل میں اتر جانے والی شاعری، جسم و روح کی فریکوئنسی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے والی شاعری۔ صوتی اثرات سے پُر۔ موسیقیت جو روح اور دماغ کو تازگی اور تیزی بخشتی ہے۔ مسرت عطا کرتی ہے، روح کو بصارت بخشتی ہے۔

مست کی شاعری آوازوں صوتوں کی شاعری ہے۔ ذات اور فطرت کی ہم آہنگی کی شاعری ہے۔ اس کی شاعری فطرت کی ہمہ گیر بازگشت کے روادار پہاڑوں سے آتی ہے۔ نرم میٹھی ندی کی روانی کی نغمگیت کا نام کلامِ مست ہے، بادِ صبا کی سرسراہٹ، فصلوں گُلوں کے لہلہانے کا نام ہے دیوانِ مست۔ مست کی شاعری میں پرندوں کی چہچہاہٹ، اور ریت کے اڑتے بیٹھتے ذرات کی چھن چھن دَر آئی۔ سمندر کے موجوں میں پانی کے مالیکیولوں کے الیکٹرانوں کا منظوم ارتعاش ہے مست کی نظم۔ معشوقہ کی نقرئی ہنسی کا زیر و بم ہے گفتارِ مست۔ مست کی شاعری بلوچستان کا توازن ہے۔

مست کی وصیت کی لسٹ میں بھی سرِ فہرست خواہش یہ تھی کہ اس کی شاعری کو ترنم سے پڑھا جائے۔ وہ اپنی شاعری کو ترنم سے پڑھنے والوں کے گناہوں کی بخشش کی دعا و تمنا کرتے ہوئے اپنی دعا کی قبولیت کی بشارت دیتا ہے۔

یہ بھی دیکھیے کہ جنوب مغرب میں قلندر کے دربار اور دوسری طرف شمال مشرق میں کوہِ

سلیمان میں سخی سرور کے دربار کے بیچ کے سارے میدانی علاقے کی محبت ذرا سی ماتم کی سی کیفیت میں ہے۔ وہاں شاعری میں غمگینیت، شکست خوردگی، جفا، زخموں کی نمائش اور بے بسی کی کیفیت ذرا زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حیران کن بات ہے کہ مست ساری بے قراری کے باوجود کوئی ماتم والی شاعری نہیں کرتا۔ کوئی بہت بڑی مایوسی، شکست خوردگی اس کی شاعری میں آپ کو نہیں ملے گی۔ اس کے فراق کے گریہ کا Tone ذرا اونچا ہے' اُس کی کُوک میں ایک عزم سا جھلکتا ہے۔ تڑپتا ہے مگر صرف تڑپ کی گہرائی اور وسعت بیان کرتا ہے کوئی رحم طلبی نہیں کرتا۔ مست عمیق ترین عشق کرتا ہے مگر شادیاں بھی اٹینڈ کرتا ہے، اور خود شادیاں برپا بھی کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے بھاگتا نہیں لوگوں کے بیچ کا ''روشہ استار'' (صبح کا تارا) بن جاتا ہے۔ اور اپنے لوگوں (قبائلی لوگوں) کی سائیکی میں ڈوب کر مہر گاتا ہے.....

فکر و فلسفہ کی شاعری

دنیا کا ہر شاعر کسی نہ کسی فلسفے اور فکر کا پیروکار اور پرچارک ہوتا ہے۔ دانش کے بغیر دانش وری نہیں ہوسکتی۔ مست مستثنیٰ نہیں ہے۔

اُس کی شاعری میں معرفت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ نظریاتی شاعر ہے۔ محبت کا شاعر ہے۔ اسی محبت نے اسے سیاح بنایا، دانش ور وسیلانی بنایا۔ پیر بزرگ ولی بنایا۔ اس نے مہر کو محترم بنا لیا، مہر نے اسے مشہور کر دیا۔

مگر وہ بدنامی تو بہت تھرڈ کلاس بدنامی ہوگی جو اپنے مالک کو نیک نامی نہ بخشے:

شدم بد نام در عشق اش بیا اے پار سا اکنوں
نمی ترسم زرسوائی سر بازار می رقصم

شہباز قلندر

مست کو اپنے نظریہِ مہر سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ وہ اسے عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اسے پوجتا ہے۔

مہر اور معرفت عوام دوستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور مست بلوچوں کا سب سے بڑا عوام دوست شاعر ہے۔ اسی طرح معرفت نجی ملکیت، ارتکازِ زر اور جاہ وجلال کے سخت خلاف ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ درویشوں کے درویش حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر ابوذر غفاریؓ تک، مولانا روم سے لے کر شہباز قلندر تک، مارکس سے لے کر مدر ٹریسا تک، اور شاہ عنایت سے لے کر مست توکلی تک مہر اور معرفت کے سارے مفکرین نے خود کو declass کیے رکھا۔ ع:

داج دیہج نوں اُس کیہہ کرنا جس پریم کٹوری مٹھی

توکلی مست عقیدوں کی آزادی کا علم بردار دانش ور تھا۔ وہ عقیدے کو دنیاوی امور میں کبھی گھسیٹ نہ لایا، اس نے کبھی بھی عقیدے کی بنا پر دوستی دشمنی نہیں رکھی۔ وہ اپنے زمانے میں موجود بہت کم ترقی یافتہ سائنسی دنیا سے بھی بڑی یاری رکھتا تھا۔ ریل پہلی مرتبہ دیکھی تو اُس پہ ایک شہرہِ آفاق موسیقی بھری شاعری کر ڈالی۔ مست زندگی، مظاہر زندگی اور انسانی جذبات کو اپنی زبان میں بیان کرتا ہے۔ وہ کسی تنگ وتاریک اوطاق اور حجرے کا زنگ زدہ ذہن نہ تھا۔ وہ تو جہاں گرد تھا، عوام کے اندر، عوام کے غول کے اندر چلتا پھرتا تھا۔ جدھر قابلِ کشش منظر اور مظہر دیکھا دیکھنے رک گیا۔ مست کبھی بھی تنہائی پسند، تارک الدنیا اور راہب جیسا انسان نہ تھا۔

مست کی شاعری شعور اور تہذیب کی شاعری ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شاعر تھا۔ وہ شرافت، عزتِ نفس، انسان دوستی، اخوت، سادگی، سچائی، تلاشِ حق، اور حسن پرستی کا شاعر تھا۔ وہ جاہ پرستی کا دشمن، اور وطن کے ذرے ذرے کو اپنی سانس میں سمیٹ لینے والا دانش ور تھا۔ وہ مری تھا، مری پرست تھا، بلوچ تھا بلوچوں پر نازاں تھا، بلوچستان سے محبت کرتا تھا۔ بلوچستان میں بارشیں نہ ہوں تو وہ پریشان۔ بدامنی ہو تو وہ بے چین، بے اتفاقی ہو تو وہ ناراض..... مست' امن، وطن، خیر، مہر، اور انسان دوستی کا شاعر تھا۔

شاھد و مشاھد

مست اپنے عہد کے دانش وروں میں قوتِ مشاہدہ کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ایک سیلانی

اور جہاں گرد انسان کی حیثیت سے اُسے مشاہدہ وسیاحت کے مواقع ملے بھی بے شمار۔ وہ غضب کی قوتِ مشاہدہ رکھتا ہے۔ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی اس کی نگاہ سے بچ کر نہیں جاسکیں۔ وہ فطرت کے حسن کے ایک ایک انگ، ایک ایک زاویے کو بیان کرتا ہے۔ اس کا کلام آپ کو فطرت کے قرب میں دھکیلے رکھتا ہے۔ بلا کی منظر نگاری ہے مست کے بیانیے میں۔ ہم پیچھے پورا ایک باب اُس کی منظر نگاری پہ وقف کر چکے ہیں۔

سٹائل

مست کا اسلوب، اندازِ بیاں اور رنگ وآہنگ سب سے الگ' ممتاز اور مخصوص ہیں۔ مست' تمثیلات وتشبیہات کا بادشاہ ہے، رنگ برنگی تمثیلات، نوع بہ نوع تشبیہات، لامحدود استعارے۔ اس نے یہ سارے استعارے اور تشبیہات اپنے عہد اور اپنے ماحول سے لیے اور انہیں اس انداز سے برتا کہ دوسو برس گزرنے کے بعد بھی وہ'' آج'' کے لگتے ہیں۔ آفاقی، ..... زمان و مکاں میں رہتے ہوئے لامکاں۔ اس کی تخلیق میں ندرت ہے، اظہار میں انفرادیت ہے، حسنِ بیان میں یکتائی ہے۔

مستیں توکلی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اتنا بڑا ہے کہ کسی دوسرے بلوچ شاعر کے پاس ممکن نہیں ہے۔ یہ الفاظ بغیر محنت کے بھی اترتے ہیں، اور دردِزہ میں مبتلا کر کے بھی نازل ہوتے ہیں۔ اس کی شاعری پڑھتے ہوئے ایسے بے شمار الفاظ ملتے ہیں جو ذہن پہ بہت دباؤ ڈال کر خلق ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے الفاظ بھی جو غیر متوقع اور آفاق سے نازل ہوتے ہیں، بے ساختہ اور بن بلائے الفاظ، نیم گھڑے اور نیم ساختہ الفاظ، ڈھلے الفاظ، ڈھالے گئے الفاظ، کاٹ کھانے والے الفاظ، گلے لگانے والے الفاظ، ترش و تلخ الفاظ، شیریں شہد الفاظ، گریاں کناں الفاظ، 'گدّا' الفاظ، 'بہار خان' الفاظ، سموالفاظ، نفسک وگنبد الفاظ، سندھ و ہند الفاظ، شادان ورقصاں الفاظ، سجدہ ریز ومسجود الفاظ، گرنے والے الفاظ، گرانے والے الفاظ..... مست ان الفاظ کو گلے لگاتا ہے، اپنا بناتا ہے، چومتا ہے..... پیار کرتا ہے۔ کہ سب الفاظ اسی کے تو ہیں، اُس کی ماں بولی کے تو ہیں۔ وہ انہیں دھوتا ہے، ان میں جان ڈالتا ہے، ان کی لڑی بناتا ہے، ہار سجاتا ہے، شہد وشیر بناتا ہے' ان میں

زبان ڈالتا ہے..... اور عوام پہ نچھاور کرتا ہے۔ بلوچی زبان مست کے ہاں برق رفتار مگر حسین ترقی کرتی ہے: ابدی ترقی۔

بلوچوں کو کسی بھی چیز سے زیادہ مست کی شاعری زبانی یاد ہے۔ غبی سے غبی شخص بھی مست کا ایک آدھ مصرع ضرور بولتا ہے۔ محفلوں میں موجود ہر کوئی اپنے حصے کی گفتگو میں، بحث میں، دلیل میں، اپنی رضا مندی میں، اپنے اختلاف میں، اپنے اظہار میں، اپنی خامشی میں، اپنی حیرت میں، اپنی سرخروئی میں، اپنی پس پائی میں، اپنے استعجاب میں، اپنے ایجاب میں، اپنے حجاب میں مست کے کسی نہ کسی مصرعے کو اپنی ڈھال ضرور بناتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ مست شاعر ہے، فلاسفر ہے یا ضرب المثل ساز۔ وہ تو فوک شاعری کر چکا۔ عمومی روایات بھری، اقوال زریں سے پُر اور بہت دور بین شاعری۔ ایسی شاعری جسے گایا جاسکتا ہے جسے یاد رکھا جاسکتا ہے، جس میں کہانی ہے، جس میں ڈرامہ ہے۔

بلاشبہ جام درک کے بعد مست وہ پہلا عظیم مترنم ومنطقی شاعر ہے جس کے کلام میں بلوچی زبان اپنی پوری تابناکی، وسعت، لچک اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ اسے عوام کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس طرح وہ گویا متحرک مہر کو عوام میں انجیکٹ کرتا ہے، زندگی کو عوام سے جوڑتا ہے۔

وہ خطاب کے انداز میں نہیں گفتگو کے انداز میں، ان کی اپنی زبان میں، اور ان کی اپنی روایتی کہانیوں قصوں داستانوں میں لپیٹ کر، ان کی اپنی جڑی بوٹیوں، چٹانوں چوٹیوں، کھائیوں وادیوں میں معطر کر کے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔

یوں مست نے اپنے کلام کو بھی زندہِ جاوداں کر دیا اور بلوچی زبان کو بھی ابدی حیات عطا کر دی۔ اپنے کلام میں بھی جادو بھر دیا اور بلوچی زبان کو بھی جادو بیانی عطا کر دی۔

ان سارے مذکورہ اوصاف ہی کی بدولت تو مست کو ابدی مقبولیت نصیب ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ بلوچی زبان نے رندی عہد سے لے کر بالاچ تک اور نصیر خان نوری کے عہد سے لے کر رحم علی تک اور گل خان نصیر سے لے کر عطا شاد تک، سیکڑوں

ہزاروں عمدہ شاعر پیدا کیے، جنھیں پسند بھی کیا جاتا ہے، تحسین بھی کی جاتی ہے، تسلیم بھی کیا جاتا ہے، پیار بھی کیا جاتا ہے.....مگر ان میں سے کوئی بھی توکلی مست کی سی عالمی اور عالم گیر مقبولیت تک نہ پہنچ سکا.....اور شاید کوئی پہنچ بھی نہ پائے گا۔

مست کی شاعری زندہ ہے اس کے باوجود کہ اسے گدّاؤں نے چٹانوں سے نیچے دھکیلا، جمال خانوں نے سمندر برد کر دیا، اور پروئیوں نے ڈنڈوں سے پیٹا۔ مست کی ابدی شاعری زندہ ہے اس کے باوجود کہ غیرت نے اسے گلیوں میں گھسیٹا، روایت نے اس کا مذاق اڑایا، قبائلیت نے اس پر تھوکا، سرمایہ داری نے اسے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا اور ون یونٹ کی آمریت نے اسے کونے سے لگا دیا۔ مگر مست کی شاعری پہلے سے زیادہ اجلی بن کر، پہلے سے زیادہ شفاف و مقدس بن کر مسکراتی اِٹھلاتی، دماغوں کو کھینچتی ہوئی دلوں کو اپنی گرفت میں لیتی جاتی ہے۔

چاڑ دمی باب

پتھروں نے بولنا بند کر دیا

ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور میر مٹھا خان مری دونوں کی جمع تفریق کے مطابق سمو نے 1880 میں جھوٹی دنیا سے پردہ کر لیا۔(1).....اور عالموں نے اُسے رمضان کا ماہ لکھا۔(2) مجھے وڈیرہ وزیر ہان شیرانی کے ہاں سے کسی نامعلوم مصنف کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ ملا جس میں اس کی وفات کا سن 1873 دیا ہوا ہے۔ اس سات سالہ فرق کے باوجود، رمضان کے ماہ پر البتہ سب متفق نظر آتے ہیں۔ (میرا خیال ہے کہ ہمیں اگر کوئی ٹھوس نئی سائنسی دریافت نہ ملی تو ہمیں 1880 پر ہی متفق ہونا چاہیے۔ میر مٹھا خان مری اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کیلکولیشن کو ہی درست مان لینا ہوگا)۔

ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مردانہ بلوچ معاشرے کے پس منظر میں ایک عورت (خواہ وہ مقدسہ سمو ہی کیوں نہ ہو) کی بیماری کی نوعیت وطوالت اور موت کی تفصیلات کے بارے میں معلومات کچھ بھی نہ ملیں گی۔ سمو کا ایک ہی تو سوانح نگار تھا؛ توکلی مست۔ وہ بھی پتہ نہیں فراق کی آگ کو زیر کرنے کہاں نکلا ہوا تھا۔ لہٰذا مست کی شاعری میں سمو کی بیماری کے بارے میں کچھ ذکر نہیں ملتا۔ مگر مست کا یہ احسان کیا کم ہے کہ سمو کی قبر گمنامی سے بچ گئی۔ یہ قبر مخ ماڑ میں واقع ہے.....ترمنڑ میں۔ مست نے پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی قبر کو آستانہ بنا دیا۔

اُس زمانے کے عام لوگوں یا، آج کے میرے مصروف قاری کے لیے سمو کی موت کوئی اہمیت رکھے نہ رکھے، مگر مست کے ہاں ایسا نہ تھا۔ ہم کوئی ماتم مچائے بغیر صرف اندازہ ہی کر سکتے

ہیں کہ کسی کی دنیا اجڑ جانا کسے کہتے ہیں؟ ۔دیکھیے ،مست کی شادی نہ تھی ،اولاد نہ تھی ، بھائی بھتیجے نہ تھے،مِلک و جائیداد نہ تھے، مال مویشی نہ تھے، دوست احباب نہ تھے، گھر ٹھکانہ نہ تھا، شناخت وعہدہ نہ تھے.....صرف ایک سموتھی ۔اُس کی کُل لولاک وہی ایک ذات تھی ۔ دکھ سکھ کا اظہار ، ہجر کا موضوع ، دعا کی محور ومخاطب ۔سموہی بارش پہاڑ ، وہی منظر وناظر ، اسی کی خوشنودی میں ساری فطرت محو ومصروف ۔

سموتو جانِ مست تھی! راحتِ مست، حیاتِ مست ۔اُس کا ازل اُس کا ابد، اُس کی نظم اس کی ناظمہ، اُس کا انجام اُس کا آغاز، اُس کا تبسم اُس کی دمک، اُس کے وصل کی قدح' اس کی روح، اُس کی راہ، قطب نما، منزلِ مراد۔ وہی مست کی مسرت ، وہی افسردگی ، وہی آبِ حیات ، وہی قاتلہ ۔سموتو کلی کا امرت دھارا بھی تھی اور زہر بھی، کھیل بھی کھلونا بھی، سچ وہی حسن وہی، حصول وہی ماحصل وہی ، اس کی روح کا پرمسرت درد ، اس کے دل کی رگ رگ کو ڈنگ مارنے والی نشہ آور شہد کی مکھی، مست کی محبت ۔سموتو مست کے ہر تصور کی شریک تھی ، وہ تو مست کی مستی مستانگی کا موجب تھی، مست کی دوست، مخاطب، ممدوحہ، چاندنی، خیر کی علامت، دافعِ شر، مست کا چین، اس کی بے چینی، رہنما بدرقہ ، کا مرید، مست کی کوثر ، مست کا تلخاب، اُستانی، مسکان، آنسو، خواہش، میزبان، مہمان، مست کا شعر، قافیہ، موضوع، مست کی صبح بخیر مست کا شب بخیر.....اور پھر وہی سمو بھی نہ رہے۔

سمو مرگئی۔ سب کچھ مرگیا۔ .....درد کا اندازہ ہی کرلیں تو آپ سمجھو بہت بڑے دانش ور ہیں۔

اور پھر اس پہ یہ تلخ دکھ بھی ، کہ ظاہری اور ظاہر دار دنیا میں سموتو مست کی کچھ بھی نہ تھی ۔ نہ اس کے گھر فاتحہ خوانی کی چٹائی بچھنی تھی نہ لوگوں کا تانتا بندھنا تھا۔غم بانٹنے والا تھا کون؟ ۔ اور بدترین مردانہ سرقبیلوی معاشرے میں کسی کی محبوبہ کی موت کی نہ تو کوئی رسم موجود ہے نہ فاتحہ خوانی کے طریقے مروج ہیں اور نہ ہی افسوس کے کلمات بنائے گئے ہیں۔ لہٰذا شریکِ غم کوئی نہیں، پُرسہ والا بھی کوئی نہیں۔ اتنا بڑا غم اور تنہا سینہ۔ (مگر اُس جہاں شکن غم کے شایانِ شان سینہ بھی تو مست جیسے کا چاہیے)۔

مست کی اگلی بدبختی یہ تھی کہ سمو عام سی محبوبہ بھی تو نہ تھی۔ وہ تو مست کے جیون کا تکملہ تھی۔اسی شایانِ شان انسان کے لیے تو مست جیتا تھا، شاعری کرتا تھا، گاتا تھا، روتا تھا، سندھ جاتا تھا، سخی سرور کے مزار میں پناہ لیتا تھا۔اس کے لیے جنگلوں پہاڑوں شہروں سے اچھی چیزیں چنتا تھا .....مست کے تیئں سمو اتنی بڑی ہستی تھی کہ اسی کے لیے تو عرش تھا، فرش تھا، ہستی تھی، وجود تھا، وجودِ عالم تھا.....وہ محبوبہ مرگئی۔مست کے وجود کی شہ رگ کٹ گئی۔

آیئے' ہم اُس منظر کو دیکھیں جہاں مست کو یہ خبر پہنچتی ہے ۔ مست عشق کی بے خبر آوارگی میں اپنے علاقے سے بہت دور کہیں تخلیق کے ذکر وفکر میں غلطاں چلتا جاتا ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں کہ پیچھے اس کی دنیا لٹ چکی ہے۔ وہ بس یونہی وطن کے لیے اداس ہوجاتا ہے۔اس کا بے خبر دل اُسے کوہستان لے جانے اور محبوبہ سے ملنے کے لیے مجبور کرکے لاتا ہے ۔کوہستان کا مطلب سمو، وطن کے معنی سمو، مری قبیلے کا مطلب سمو، بلوچ بلوچیت سب سمو ہے.....مست وطن کے اُس علاقے میں آتا ہے جہاں سمو اور سمو کا گھرانہ، خیمہ زن، ہوتے ہیں۔ وہ سمو کے خیمہ کے گرد پتھر سے بنی دیوار سے جب جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے سمو نظر نہیں آتی، سمو کے نشاں نظر نہیں آتے ۔ وہ دیواروں میں لگے پتھروں سے سمو کا پوچھتا ہے، مگر پتھر خاموش ۔ پتھر خاموش کہ پتھر بے زبان ہیں۔ پتھر خاموش کہ مالکن موجود نہیں، اُس کا حکم موجود نہیں۔کوڈ، ورڈ اُسی کے پاس تھا۔

روح مناں شی کہ بیا تراپئے کوہاں براں
میں تراشوں داراں املّانی دروشماں
آتکغاں مس کہ سّملئے اَوحالاں گراں
کاتک اوشتاثاں سمّلئے سنگیں بانڈواں
سمّلئے کو ہیں بانڈواں جھاتی اے جناں
گارینا سمو، گارنتی دستانی نشاں
سنگ نہ گالا ینت، ہکّلے سنگانہ دیاں
سنگ نہ گالا ینت ، نیستناں سنگانہ زواں
سنگ نہ گالا ینت، باجے ژہ درّیں بانُکاں

ترجمہ:

دل کہے چلو تمھیں کوہستان لے جاؤں
محبوبہ کی صورت دکھا آؤں
آ گیا میں کہ سمو کی خبر گیری کروں
آن کے میں کھڑا ہوا سمو کے پتھر سے بنے گھر کی باقیات پر
سمو کے پتھر سے بنے گھر کی باقیات میں جھانکتا ہوں
(ارے) سمو تو نہیں ہے، اس کے ہاتھوں کی نشانیاں بھی نہیں ہیں
(پتھروں سے پوچھتا ہوں)' پتھر نہیں بولتے' انہیں ڈانٹ پلاتا ہوں
پتھر نہیں بولتے، پتھروں کی تو زبان نہیں ہوتی
پتھر نہیں بولتے جب تک کہ ان کی مالکن اجازت نہ دے

اور پتھر نہیں بولے۔ شجر خاموش، ہوائیں چُپ ..... ماتم میں تو بلوچستان گُنگ ہو جاتا ہے۔ موت اتھاہ خاموشی کی صورت اپنا نوحہ خود ہوتی ہے۔ لیلے میمنے چوکڑیاں بھرنا ترک کر دیں تو پوری کائنات سمجھ جاتی ہے کہ سمو مر گئی۔ جب ایک شام قبل ہیر نامی تین فرشتے آسمان پہ مرنے والے کے نام کی نوحہ خوانی کرتے گزریں تو کسی بریکنگ نیوز کے اعلان کی حاجت نہیں رہتی۔ مست سمجھ گیا کہ اس کی دنیا اندھیر، گھپ اندھیر ہو چکی ہے۔ سمجھ جاتا ہے کہ لیٹرا لوٹ گیا اس کی دکان۔ وہ بلوچ بن جاتا ہے' مرد بن جاتا ہے،.....یعنی سنگدل بن جاتا ہے اور مروج بات کہہ ڈالتا ہے کہ:

حقناں موث اومس پرے ارمانی نیاں

یعنی موت برحق ہے اور میں اِس پہ ارمانی نہیں ہوں ..... پر، اسی لمحے جسم کے ایک ایک حصے ایک ایک خلیے نے بلند آہنگ احتجاج کر کے بتا دیا کہ جھوٹ بول رہے ہو پارٹنر۔ تمہارے وجود کے گرم سرخ لوہے کو تو مہر کے پانی سے ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ تمہاری تو بُنت و میٹابولزم ہی محبت کی ہے .....فیوڈل بلوچ بنتے اچھے لگتے ہو؟۔ جھوٹی انا کے جھوٹے دکھاوے کرتے اچھے لگتے ہو؟۔

مست اپنی غلطی کی تاب نہ لا سکا۔ اسے اِس لمحاتی مصنوعیت نے بھی ہلا کر رکھ دیا۔ تب زمزموں دھلا ضمیر زمانوی گندے نالے سے سمشی فاصلوں دور بھاگا، توبہ کی، کفارہ ادا کیا اور اعلان کیا:

چلموا بیاریں کہ دلئے بُنڈا ایرکناں
سملئے کو ہیں بانڈوا سہرو لعل کناں

ترجمہ:

خنجر لا دو کہ اپنے دل کے پارا تار دوں
سمو کے پتھر کے بنے گھر کو اپنے خون سے رنگین کر دوں

ایسی ہیبت ناک خبر کے غم کا پیمانہ کیا ہو، درد کی شدت کا ریکٹر سکیل کون سا ہو، اس سکتہ طاری کر دینے والی خبر کی گہرائی و گیرائی کا تھرمامیٹر کیا ہو، ملاحظہ ہو:

غم تئ سمّو شوشاں چو بچّانی غماں

ترجمہ:

تمھارا غم بیٹے کی موت کے غم جتنا جلا ڈالتا ہے

ہم اور کیا تبصرہ کر پائیں گے۔ مست پر ہی بیتی، اُسی کا بیانیہ ہی کافی۔

یہاں فطرت بھی اپنے اندھے اور ازلی اٹل قانون پر کاربند ہوتے ہوئے بھی ملال و پشیمانی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پشیمانی تو شرمندگی ہوتی ہے۔ تو پھر ایسے میں ہرجانہ کیا ہو، خون بہا کیا ہو؟۔ چنانچہ فطرت ہمارے علاقے کے نیچ حاکموں کی طرح مست کو روپے پیسے اور وزارت و جھنڈے کی نیچ پیش کش کرتی ہے۔ پوری کائنات اپنی کُل سخاوت کے در کھول کر مست کو پیش کش کرتی ہے کہ:

تہ گِشیں کس زیر ہرکہ بی سمّو دروشاں

ترجمہ:

تم چُن کے اٹھا لو جو بھی تمھیں سمو جیسی لگے

تو مست کیا اٹھالے گا؟ آپ ملاّ ہیں تو کہیں گے؛ بہشت۔ آپ کا میلان دولت کی طرف ہے تو آپ کہیں گے؛ پٹ فیڈر میں گیارہ ہزار ایکڑ نہری زمین، آپ مریض ہیں تو مانگیں گے؛ شفا.....شمار نہ کی جاسکنے والی نعمتوں میں کوئی تو چیز ہوگی۔ مگر، مست بے چارہ کیا لے گا، کیا اٹھائے گا۔ ایک معزز سیاسی ورکر اپنا نظریہ کیا بیچے گا؟۔ امید بھری فطرت انتظار میں ہے کہ مست جو چاہے اٹھالے، اُس پہ قربان۔ قدرت سمو کی روح قبض کرنے کی اپنی کارستانی کی تلافی کے لیے ہمہ طور تیار.....کفارہ، روح کُش کا کفارہ، ایک حتمی اٹل قانون کا کفارہ..... حیاتِ کائنات پہ سکوت طاری کہ مست کیا چُنے گا، کیا اٹھائے گا.....

.....اور مست اپنی چادر زمین سے اٹھالیتا ہے،، جھاڑتا ہے، کندھے پر رکھتا ہے اور یہ کہہ کر ٹھوکر مارتا ہوا روانہ ہوجاتا ہے؛

پولغا سموئے بدل پیداشہ نواں

سمو کا بدل ہے ہی نہیں!

حوالہ جات

1- مری، مٹھان خان، ''تو کلی مست'' 1969، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 73

2- کوثر، انعام الحق ''تذکرہ صوفیائے بلوچستان''، 1976، مرکزی اردو بورڈ لاہور، صفحہ

سمو کی قبر

سمو کی قبر شہروں بازاروں سے بہت دور ایک ویرانے میں قائم قبرستان میں ہے۔ ٹیلوں تک کوئی آبادی موجود نہیں ہے۔ فطرت کی اتاہ گود میں سوئی پڑی ہے دانش کی تخلیق کار۔

اور پھر، کوئی مقبرہ گنبد نہیں، کوئی فقیر سجادہ نہیں اور کوئی عرس دھمال نہیں۔ ایک عقیدت مند نے سر یہ سیمنٹ والا گنبد بنانا چاہا تھا مگر رات کو مناظر کی ملکہ اس کے خواب میں آئی اور کہا: میرے اور مناظر کے بیچ کوئی رکاوٹ نہ بنا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔.....اب ایک دوسرے عقیدت مند نے سو سال بعد وہ قبر پکی کر ہی دی۔ سمو اب لوگوں کے خواب میں نہیں آتی۔ وہ سرمایہ داری نظام کی دیوی نہیں ہے۔ سرمایہ داری نظام میں دیوی دیوتا نہیں ہوتے، بھائی، باپ بیٹا نہیں ہوتے، صرف پیسہ ہوتا ہے۔ سمو پیسہ کے خواب میں نہیں آتی۔

یہ عام سی مگر خاصی بڑی قبرستان ہے۔ سمو کا مرقد اِس کے شمالی حصے میں ہے۔ ایسا بھی بے نشاں نہیں جیسا کہ جامعہ یوسفیہ کے وائس چانسلر کی قبر ہے۔ فطرت کے قریب رہنے والا انسان اپنا فطری تبریک تو پیش کرے گا ہی۔ چنانچہ دور سے ہی پتہ چلے گا کہ محبت کی لازوالی کی علامت وہاں ہے۔ کوئی بورڈ و کتبہ نہیں۔ بس، قبر کا سرہانا عوام کے لاکر ٹانگے ہوئے رنگ برنگے جھنڈوں، عورتوں کے سر کے گیسوؤں، ارمانوں سے بُنے ریشمی رومالوں اور، محبوب ترین دنبے کے گلے کی گھنٹیوں سے رنگین و ممتاز ہے۔

چوں کہ اردگرد گھٹا ٹوپ اتھاہ خاموشی ہے۔ کوئی انسان، آبادی آس پاس موجود

نہیں۔اس لیے جو اچھے راہی ہوتے ہیں، وہ راہ گزرتے ہوئے، عام لوگوں کی ضرورت کی چیزیں وہاں رکھ دیتے ہیں۔لوگ وہاں ریوڑی اور دیگر مٹھائیاں رکھتے ہیں،فروٹ اگر ساتھ ہوتو وہ بھی۔ جسمانی صفائی ستھرائی کے لیے بلیڈ رکھ دیے جاتے ہیں، وہاں میں نے گڑ، چینی، ماچس اور پتی رکھی ہوئی دیکھی۔سکّے یا ایک ایک روپے والے نوٹ میں نے کی قبر کے سرہانے رکھے دیکھے۔ اور چرواہے اتنے پاک اور غیر تصنع لوگ ہیں کہ وہ آتے ہیں اپنی ضرورت کی چیز،اور جتنی ضرورت ہواُتنی، بلاتکلف اٹھا جاتے ہیں۔سمو کی قبر پہ چڑھی چادریں بھی اگر زیادہ ہوں تو لوگ بلا جھجک اپنی بہو بیٹیوں کا سر ڈھانپنے ایک آدھ چادر لے جاتے ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں ایک سال تک وہ مرقد میرے ایک ڈاکٹر دوست کی گزرگاہ، اور زیارت گاہ رہی۔وہ گڑ، ریوڑی، سمو مائی کے مزار پر چادر چڑھاتا، اور اس کے سرہانے بلیڈز کا ڈبہ، ٹیٹرا سائیکلین کے کیپسول، ڈسپرین اور باسکو پان کی گولیاں اور کھانسی کے شربت کی بوتلیں رکھ جاتا۔واپسی پہ وہاں کچھ بھی نہ پاتا۔حق بہ حقدار پہنچ چکا ہوتا ..... بڑے لوگوں کی قبریں تک، ضرورت مندوں کے کام آتی ہیں۔

آؤ تمہیں اُس کی سنائی ہوئی ایک بات بتادوں۔

یہ علاقہ مون سونی بارشوں سیلابوں کا علاقہ ہے۔ملول و ہلاک کچی سڑکیں، اوپر سے ''سوریں کور'' نامی بارکھان سے سبی تک بہنے والا طویل سیلابی دریا.....جس کے پانچ چھ موڑ کراس کرنے پڑتے تھے۔ایسی بدتمیز مٹی کہ گاڑی چار قدم چلنے کے بعد گھٹنوں تک دھنس جایا کرتی۔یہاں گاڑیاں پھنسنے کا میلہ لگتا۔مگر اُس کی پستہ ایمبولنس کہاں پھنسنے دی جاتی تھی۔کہیں نہ کہیں سے دو تین چرواہے اپنے ریوڑوں کو بھیڑیوں کی امانت میں دے کر اتر آتے اور دھکوں سے اس کا بیڑا پار کرتے۔

''ایک بار مجھ سے پہلے ایک دو جیپیں پھنسی کھڑی تھیں۔افسروں کی گاڑیاں تھیں۔میری ایمبولنس بھی آ کر ریت و کیچڑ میں پھنس گئی۔مگر آدھ گھنٹے کے اندر اندر پھٹے پرانے کپڑوں والے چرواہے آئے، آواز سے آواز ملائی، قوت سے قوت ہم آہنگ کی، گاڑی نکالی اور چل پڑے۔

''میں نے دوسری گاڑیوں کو نکالنے میں مدد کے لیے کہا تو سولائزیشن گونجی: ''ہماری پاکی صفائی کے بلیڈ اور کھانسی نمونیا کی گولیاں یہی لمبی گاڑی رکھ دیتی ہے، ہم تو اُسے ہی نکالیں گے .....۔

''اور پھر میں نے اِس لمبی گاڑی کا واسطہ دیا تو احسان مند احسان کرنے لوٹے اور افسروں کی گاڑیاں دھکیل کر نکال لیں''۔

زندگی کو موت نہیں

مست اپنے فلسفے کے اختتامیہ پر مبنی پیراگراف کو سنوارنے کچھ برس مزید جیا۔ اس نے سمو کو امر بنوانا تھا۔ اپنی اپنی سمو کا باب بند نہ ہونے دینا ہی تو اصل عاشقوں کا فریضہ ہوتا ہے۔

موت تو ویسے ہی بقول فلاسفر، ''اپنے جال میں پھانسنے کے لیے رسہ تیار کیے بیٹھی ہے''، مگر ادھر مست کے لیے تو زندگی کا جواز ختم ہو چکا ہے کہ سمو تو رہی نہیں۔ اب محبوبہ کی قبر کی مجاوری کرنے اور سمو سے متعلق فکر و فلسفہ کو رنگ پالش کرنے کے علاوہ وہ اپنا سماجی رول ختم سمجھنے لگا۔ وہ وہیں رہ کر اپنی شاعری گاتا، گواتا۔ مست کے تئیں سمو البتہ کوئی روحانی، مافوق الفطرت ذات نہ رہی۔ وہ ہمیشہ سمو کا ذکر ایک زندہ اور ''وہیں موجود'' انسان کے طور پر کیا کرتا تھا۔ ہر وقت موجود، ہر وقت حاضر۔ نظر البتہ صرف اُسی کو آتی تھی۔

Love looks not with the eyes , but with the mind

ہمارے پاس اَکھر کاغذ اور تاریخ شجرہ تو موجود نہیں۔ اس لیے ہمیں واقعات، شعروں، روایتوں اور کہانیوں کی چھان پھٹک کرنا پڑتا ہے، اور ٹو ٹا ٹو ٹا ملا کر سلسلہ برقرار رکھنے کی ریسرچ کرنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ پڑہ کے علاقے میں ایک طرف سے مست چلا آ رہا تھا اور دوسری طرف سے خانہ بدوش وڈیرہ ڈیوا پوادی اپنا خانہ بدوشی گھرانہ لیے دوسری جگہ ڈیرہ ڈالنے جا رہا تھا۔ مدبھیڑ ہوئی، مست سے حال حوال ہوا تو مست نے اُس سے کہا، ''ڈیوا! بس، اب اِدھر ہی ڈیرہ ڈال دو، میرا تمہارا لمبے سفروں کا اب وقت نہ رہا''۔ چنانچہ ڈیوا کا گھرانا وہیں خیمہ زن ہوا۔ اور اسی روز ڈیوا

فوت ہو گیا۔

اور اسی سفر میں مست بھی بیمار ہوا اور اسی کی خواہش پر اُس کے قبیلے شیرانی کو اطلاع کر دی گئی۔ وہ لوگ پڑہ آئے اور بیمار مست کو چارپائی پر ڈال کر کندھوں پر لیے اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔ تمبو کے علاقے میں پہنچ کر مست نامی دریا' زمانے کے سمندر میں اتر گیا۔

مست نے سمو کی موت سے پند رہ برس بعد 1896 میں اس خوب صورت اور پُر بہار دنیا سے رخ پھیر لیا۔(1)

بلوچستان یک دم محروم ہو گیا۔ مست کی صورت میں ایک ایسا شخص نہ رہا جو سر سے پاؤں تک مہر تھا، محبت کا نشئی، پیشے کے اعتبار سے عاشق۔ میرے کوہساروں نے اپنے بچوں کو مست کی صورت جو ایک بہت بڑا دانش ور، ایک خوب صورت شاعر اور انسان دوست یوٹوپیائی فلاسفر عطا کر دیا تھا، وہ آج واپس لے لیا۔

آگے کیا ہوا؟۔ اچھے انسانوں سے متعلق اچھے عوام الناس کی اچھی روایتیں پڑھنے کے لائق ہوتی ہیں:

مست نے وصیت کی تھی کہ اسے بلند و بالا ٹکیل پہاڑ پہ دفن کیا جائے۔ مگر جس اونٹ پہ میت رکھی تھی وہ پہاڑ پہ چڑھنے سے انکاری ہو کر ''میذاں گری'' نامی ہم وار جگہ پر جا کر بیٹھ گیا، اور آگے جانے سے یکسر منکر ہوا۔ لوگوں نے تمام جتن کیے کہ اُسے ٹکیل پہاڑ کی جانب جانے پر آمادہ کیا جائے مگر اونٹ وہاں سے نہ اٹھا۔ چنانچہ وہیں مست کی تدفین عمل میں لائی گئی۔

قبر جو کھودی گئی اور میت اس میں رکھی گئی تو مٹی جتنی ڈالتے جاتے قبر بھرتی نہ تھی۔ مجبوراً مری کے ماضی قریب کے سردار، خیر بخش کے والد سردار مہر اللہ خان کو بلوایا گیا۔ اس کی چادر مست کی میت پہ ڈال دی گئی تو قبر خاموش ہوئی اور تدفین مکمل ہو گئی۔

یوں، مست کے ابدی گھر کا نام اب ''مستہ میذاں گری'' ہے۔ اُس کا جسد خاکی تو ''مستہ میذاں گری'' میں زمین میں دفن ہوا لیکن وہ آج بھی عشاق کے مستانہ دلوں میں بے قرار دھڑکن بن کر زندہ ہے۔

تو کیا وہ واقعی فوت ہو گیا؟۔ ہزاروں کی تعداد میں اس کے مزار پہ لوگوں کی حاضری بتاتی ہے کہ نہیں۔ مزار پہ لوگوں کی ہمہ وقت آمد و رفت رہتی ہے جیسے کوئی زندہ مددگار بیٹھا ہو۔ یہاں لنگر چلتا ہے۔ سال بھر دور دراز سے لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔ لوگ یہاں اپنے سر کے بال کاٹ کر منت میں رکھ دیتے ہیں، کُشک، اچھے پتھر، خوب صورت منکے رکھ جاتے ہیں..... عورتیں بیٹے مانگتی ہیں، بیمار صحت، مسافر امن، مقروض نجات، شکاری شکار، محبّ وصالِ یار.....اور جب ان کی منتیں پوری ہوتی ہیں تو پھر لوٹ لوٹ کر اِدھر آتے ہیں، شکریہ ادا کرتے ہیں، مسرت و اطمینان سے خیرات کرتے ہیں۔

ایک ایسے شخص کی قبر پر ہر سال ہزاروں لوگوں کی حاضری ہوتی ہے جس کا کوئی کاروبار نہ تھا، کوئی گھر نہ تھا، کوئی علاقہ جاگیر نہ تھی.....بس ایک نیم مجنوں شخص جو اپنی محبوبہ سمو کا نام جپتے جپتے وادی وادی، قصبہ قصبہ، مقبرہ مقبرہ بھٹکتا، اور شعر کہتا مر گیا۔ جو لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرتے ہیں، انھیں موت نہیں مار سکتی۔ جب تک دنیا میں دل کے ٹکڑے آنکھوں کی راہ پر نکلنے کو تیار ہوں، مست زندہ اور غیر فانی ہستی رہے گا۔ آج بھی لوگ بیماریوں، دکھوں، پریشانیوں، آفتوں کے وقت مست کا نام لے کر پکارتے ہیں۔ لوگ مست کی منتیں مانتے ہیں۔.....جس شخص کو اس قدر محبت حاصل ہو اُسے کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ وہ چرواہے کی پکار میں موجود ہے، موسیقار کی دُھن میں بولتا ہے، مہروندوں کی مدد کو آتا ہے، بے بس و بے کس کا سہارا ہے، وہ قلم کار مٹھا خان مری کے قرطاس پہ رقم لفظ ہے، قاری کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے .....مست محقق کی جستجو میں موجود ہے۔

وہ اپنے زندہ لفظوں کے ذریعے، اپنے سماجی پیغام کے ذریعے موت میں بھی زندہ ہے۔ آج مست کی محبوبہ کی دنیا نے منافع و مستی کی دوڑ میں بظاہر فکرِ مست کو پاش پاش کر ڈالا مگر مست پھر بھی افضل و اشرف ہے کہ عالم گیر صداقتوں کو کبھی انت نہیں، کبھی موت نہیں۔ منڈی خواہ جس قدر چاہے وسیع و طاقت ور ہو، دنیا کی کچھ چیزیں ترازو کے لیے ہوتی ہی نہیں۔ محبت اُن میں سے ایک ہے۔

ہمیں بھی کیا کہیے کہ ہم بلوچستان کے ایک لاکھ ساڑھے بائیس ہزار سرداروں، سوڈیڑھ سو موجودہ و سابقہ گورنروں، چیف منسٹروں، سیکڑوں وزیروں چیف سیکرٹریوں ڈپٹی سیکرٹریوں، کمشنروں، اور ہزاروں ڈی سی اوں، کرنیلوں کی تعریف و توصیف کی بجائے ایک مجذوب کی ثنا خوانی میں جتے ہوئے ہیں؛ بغیر کسی اجرت کے، بغیر کسی لالچ کے، اور بغیر کسی چالیس چوروں کی خوش نودی کے حصول کی تمنا کے۔ اس بے علم، مجذوب کی بڑائی کے سامنے ہم اپنے علم، حلم اور حتیٰ کہ انا کا سر جھکاتے ہیں۔

کیا یہ بغاوت ہے؟ جہالت ہے، پیر پرستی ہے؟ .....جو مزاجِ یار میں آئے کہہ دیجیے۔ خلقت تو اُس کے ابدی پیغام کے ساتھ اپنی شناخت کروا بیٹھی، اس کے فلسفے کی طرف داری کر بیٹھی، اور اس کی پیروی کرنے کا قصد کر چکی .....اور ہماری نظر میں اُن کا یہ فیصلہ شعوری بھی ہے اور متبرک تھی۔ شاید اسی لیے تو ہم Thorn Bird نامی پرندے کو جانتے ہیں کہ وہ کانٹا اپنے سینے میں پیوست کیے ایک ابدی قانون کی پیروی کرتا ہے، وہ اس قانون کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ خود کو لمبا کانٹا ٹھونک کر قتل کر رہا ہے۔ اور گاتے ہوئے مر رہا ہے۔ جس لمحے کانٹا مکمل طور پر داخل ہو جاتا ہے اُس لمحے اُسے موت کے آ جانے کا ادراک نہیں ہوتا۔ وہ صرف گاتا ہے اور گاتا جاتا ہے۔ جب تک کہ اتنی زندگی بھی نہیں بچتی کہ کوئی اور مصرع منہ سے نکل سکے۔ اور ہم، جب ہم اپنے سینوں میں پیار کا کانٹا رکھتے ہیں تو Thorn Bird کا انجام جانتے ہیں، مست کا انجام جانتے ہیں، پیار کا انجام سمجھتے ہیں مگر پھر بھی ہم یہ کرتے جاتے ہیں.....پھر بھی ہم یہ کرتے جاتے ہیں۔

پیار کا کانٹا.....مست کا کانٹا.....ازل کا، ابد کا، ابدیت کا کانٹا۔

حوالہ جات

1۔کوثر، انعام الحق ''تذکرہ صوفیائے بلوچستان'' 1976، مرکزی اردو بورڈ لاہور، صفحہ 275۔
میں یہ سال 1895 لکھا ہے، جب کہ گزٹیر کے صفحہ 82 میں میں 1892، اور میر مٹھا خان نے
اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 276 میں 1896۔

ضمیمہ جات

صوفی تا ج گوپا نگ کے سرائیکی میں تراجم

شاہ شمس ہے مرشد اصلوں

وصل وصال دی تانگھ اندر
دِل سموکان مونجھیندے
راہبر عشق دے رستہ لاون
ساتھ ہووے سجنڑاں دا
جام درک تے شاہ مریدن
بخش کرامت ڈیندے
پیر سُھری شہباز قلندر
پگ ولائت پویندے
حق بہاول مالک میڈا
کل مُلتان دا سایا
شاہ شمس ہے مُرشد اصلوں
خاص امداد کوں آیا

قاصد آیا

قاصد آیا یار دی سچی گالھ سنائیس
آکھیس کلتھوں مِل پئی اے او ملک پریم دی ملکہ
ساوی چُج چراندے وچ میں
سمو مائی کوں ہرنی وانگوں ٹرداڈھم
پٹ پٹ روے قسماں کھاوے
ہار ہنجوں دے پووے آکھے
آویں نہ دیدار کراویں
میڈا سر صدقے ھے تیئں توں
نین نماٹے تیئں توں گھولیے
تیڈی داری کراں
تیڈی تَسی گھوڑی کیتے
مشکاں ودی بھراں
تیڈی نوری صورت دی میں زیارت کراں

تو نڑیں ہاں میں تریمت

جندڑی تیئں تو واراں

میڈا سیندھ تے ہتھ ھے ڈھولا

میں تیڈی ہاں.....میں تیڈی ہاں

میڈا سفر سمودی خاطر

حاجی ٹُرسن حج کوں

میڈا سفر سمودی خاطر

جیند یاں چشماں دیکھن کیتے

مجنوں وانگ اُداس تھیومی

مست بہار دے موسم ولسن

تے میں ولساں

دم دم یاد ھے اللہ سئیں دی

جیر ھا دم دم بھال کریندے

بیاوت سوراں پیر علی کوں

کونجاں آپنڑیں ویلگے وقت کوں

پندھ توں ولسن

کونجیں دے کُرلاٹ ویندے ھن

ہاں دے پاروں

میڈے دل دے درد داداروں
سمودی من بھانوڑیں کھل اے
کونجاں ولسن میں وی ولساں
کونجیں دی ان تیند قطار اچ
شامل تھیساں
کونجاں ول وطناں ڈو ولسن
میں سموکوں ملساں
کونجاں ھن پرواز دے وچ
پر میڈے پندھ پیا دے
سندھڑوں کونج خراساں منزل
کونج اگونہی ٹُر دی راہسی
میں سیوی کھڑ تھیساں

اے دلّی دا شہر ے

اے دلّی دا شہر ے
چس رس اتھاں ھے
منظر عجیب ان نظارے عجب ان
ظالم یزیداں دڑ کے پئے ڈیندن
بزدل کتھوں دے ودھ گھٹ الیندن
بھل افسوس!
اج جئے میڈی پگ دے وارث
مَری اتھاں ہوندے
مہر اللہ شہداد شیرانڑیں کائنی
موہری صف لڑا کا اولا کھاوی کائنی
حسن میر یار ونتانڑیں نئیں ڈسدے
پرے راہندے شہباز مردِ جنگاور
کتھاں ڈیرہ بگٹی دے

رہ گن راچے

کتھاں گولاں کچھی دے سہراب خان کوں

نہ ھے میر کوہلی نہ میوہ نوتا نڑیں

نہ باثیل خان ھے نہ کوئی مسوری

بھل افسوس!

جواج شہر بارکھاں دا

قادر خان مزارانڑیں نئیں نال میڈے

مہران بلوچ کے انگلش تراجم

1

Emancipation

Sammo was walking on the path to fetch grass

My beloved goes to an arduous hill

Emotions wrench like snakes in my body

Heart and soul seethe a thousand times

Bring a new theme for poetry

You don't know the genre of my beloved

My beloved needs a lot of tending and care

Pampering like that of a adored son

She needs to be nurtured like a filly of the mare

She needs care, its good to take care

(For) comfort comes after hardships

At present (she is) young, (she) isn't swift

Give her reins in hands of skilled riders

Let experts exalt her

She'll learn to walk with elegance

2

Come O green bird, I'll send you as a marriage-counselor

Climb down the steep mountains, shrieking out longings

Take my regards and fly swiftly across plains and deserts

Her identification is that there are red threads in her eyes

Straight is the nose, joined are Sammo's eyebrows

Around her swan like neck is a circular necklace

Three layered amulet swing on beloved's chest

Longings of beloved give me whip lash pain

Go there O bird where my moon is seated in mists

Be cautious of thugs and cheaters

They may hunt you by shooting arrows

Take my regards and tie them with your silvery wings

Go there where my mistress sits amongst friends

Casually sit on her left shoulder

Chirp, taking your beak close to her ear ring laden ears

Lunatics faint on seeing her

Friends! Look at the mischief of my soul

Every moment every instant I miss the beloved

Is she a fairy or a heavenly angel?

Today again the soul is restless for her

I've uttered this poem 'cause of heart ache

May God destroy the enemy

Sammo is freed from iron imprisonment

Comes clad in cotton shawl

3

Sammo is one of the holy-fig trees on Koh-e-Zain

Sammo is a fruit of trees

Sammo is a bottle of wine

Sammo is a doe of steep mountains

Sammo is a red flower of pomegranate

Sammo is a lamp in pitch darkness

Or a prominent piece of cloud

Majestic eyes, paper thin lips

Sharp as killer swords

Gorgeous as rain drops falling in a row

Sweet as delicious milk of sheep

Sammo is a fig tree with large leaves

Grown on inaccessible high mountains

On which rocks cast their eternal shadows

Brought up on lakesides surrounded by mountains

She will gently hold and hide you in her stole

Where do you come from? What is the problem with you?

I've no problems, I'm merely the marriage-counselor

Have brought the message of your lover

Say "yes" Sammo, life will be splendid

Say "yes" beloved, don't take the curse of my heart

Deep gorges are home to her

No gush of wind could shake the tip of your twigs

Rises blood shot eyes (for prayers)

Like lightning in light clouds at night

Eyes shine like lit lamps

Tresses like wriggling snake

Eyes of Sammo are red as if tipsy

She is exotic in a queue of priceless friends

Her growl is like that of flying dragons

Leaps like wild deer

Camel rider of swift Mehri[1]

Voice is like melody of flute

Sparkes as striking of light

Absorbed Hina on her palms

Blesses cure to dying patients

Catches flying birds by stretching her arm

Bestows wisdom to obtuse

Makes wandering mystics speed up

Calms down wild deer

Silk-dressed body with elegant gait

Beauty like that of clouds coming from afar

Eyes complement her golden face

Thick hair, slim waist

Sharpness like that of Abdar sword[3]

Sammo doesn't suit with goatherds

She should have been amongst the ornamented ladies of Mahair[2]

Plains along creek side would have been her home

Young camels would have leapt early in the eve

Bellows of milk giving camels would have filled the air

Well-fed swift mares would have swirled dust in the air

1. Mehri: camel trained only for riding
2. Abdar Sword: Sword made by making iron red hot and then cooling it all of sudden by immersing it in water
3. Mahairi: Women of Mehair are known for their beauty

4

O Allah the master, thee do Godly deeds

(You) make it rain, make regions and areas green

Early in one morning heavenly clouds emerged

Water laden clouds, scented with divine fragrance of Lord

These are the same heavenly and fragrant clouds

That God has held with his might and miracle

Clouds that have come from afar, pour on abandoned area

of Sammo's residence

It rains and return back in their seasons

A fine drizzle of rain has brought the message of Sammo

Messages in which there are gentle greetings

Walking on foot I passed from Dhadhar and Beji

From Sibbi I started towards Badra

On this route I reached river Beji

I reached at the bank of Kachur, in the area of Banboor

The fourth day I arrived at the town of Kahan

(Sardar) Mehrullah Khan summoned me

"Taukali Mast let me give you a message

I have Sammo's messages and her green greetings

Return to the homeland, to the tribal armies of Proee."

"I am willing to go back Sirdar, but Proee tribe doesn't let

me do so."

With cries of wounded heart, I set of for the homeland

I arrived and was seen by the troops of Proee present

I am a victim of igneous memories of Sammo

(I) am blind, go astray at night

(Our) friendship is pure there is no evil in our hearts

(My) soul unsettled, heart crazy for Sammo

I returned and sat on a big rock

For a moment looked for the mistress

O God! Do a miracle, come for help

Lo! Sammo is sighted, walking a melodious gait with her

friends

With a dancing gait entered arduous mountains

(If I) walk along the path it will be too distant, Oh God! what

should I do?

I call the King of Mountains (Hazrat Ali) and Pir Suhri

This is the character that comes riding a white mare

Riding Duldul, Zulfiqar on shoulders

Recited the Kalma, I jumped of the high mountain

I was rolling, when saints held me in arms

On the sound of my falling on ground, Sammo alarmingly uttered "Allah mercy!"

"By jumping from such high peaks you bring bad name to me"

"You will never be ill famed amongst your friends

I am not ashamed of your pure love."

5

Affections (clouds) queue up from afar

These are the hay days, for blessings of God have turned into shower

Everyone is satisfied with farming and the harvest

'Cause of rains there is greenery

Tresses of a tree known as Zamur twirl in deep gorges

Day before yesterday I set of from the area of Baghaar

Crossed Manjra Stream sandaled

Pilgrims go for Hajj pilgrimage but I go to see Sammo

I've turned lunatic from the carving to see your eyes

At evenings I come from the mountains with vast plains

There was confrontation of Lundi and Kundi

Kundi advances (and) picks up stones from the ground

"If you move forward I'll dye your skin (with your blood)!"

For the courageous death is the truth; I've no regrets on it

Annoyed was the beloved; she sent messages to Mast

From that day my communication with Sammo ended

I strip the expensive costumes off

Hang my precious weapons on Kalair tree

God turned kind on the Kalair tree

Sammo looks at my weapons with doe like eyes

Love seethes in gloomy heart like snake venom

I get tipsy, seek help from God

Put it in mind of the royal servants

Order the terror of armors to help us

Send back Mast the sons of Sobha this time

The cameleer has called Dildar Chalgari

Mast will not heed to pleadings

He did even not yielded to Sammo and has made up his mind for the alleys of Lahore

Dildar brought the rival of Mast along

A person went crazy to meet Mast

Heart urges to raise the slogan of "Allah Ho!" right from here

Hang the necklace from some tree

"Stop for a while, pretty Sammo!", I may say

At the time of Zohar prayers I passed from Barkhan

Before break of dawn reached the shrine of Sakhi Sarwer

In front of mausoleum there is a congregation of respectable persons

Crowd of people riding carriers

Amongst them were riding golden faced (ladies) wearing bridal ornaments

Look! Is there anyone who resembles Sammo?

Sammo your memories lash like whips

(I) became guest at Pir Mehbub Shah's tomb

I'm guest of the Saint, he gives me milk and misri in meal

King of the valiant come for my help!"

I swam across the bluish ocean

Friends (saints) clutched me ashore

I witnessed the Might of God

The King took me out with His Masterly tactics

From the ships and boats of the British

Mir Jamal Khan fell ill

These deserts were the destination of that chieftain

This Holy site is the real destination and good place to stay

(For) here is the final resting place of Pearl like Master

(PBUH)

But Mir (Jamal Khan) is desperate to go to "Chotee"

Oh God! Make Mast's saying come true

Do me a favor

Delay the Angel of Death a bit

Save the honor of my beard this time

Let Mir (Jamal Khan) reach area of "Chotee"

6

The natives warned me

That your enemies have set up an ambush

There was a clamor and I was picked up

That "Be cautious of crocodiles and man-eaters of the sea."

Deep Ocean! How fierce is your thunder and noise

What kind of a loin could withstand your terror!

I in that testing moment

Saw Graceful Prophet (PBUH)

Beloved (PBUH) was clad in a shawl of Light

I looked upon Him (PBUH) with a loving gaze

He (PBUH) is happy, pleased and ever healthy

Full moon; shining like silver

"O Ali the Astounding

Sammo has come out with her friends

Looks around explores the zig zag lines of Lightening

O friends! Tie the ropes of the tent tightly, it seems to rain

wildly.

7

I was at the forefront in the battle of Chambarhi

And remained in the brutal / violent battle field

Zarkanrheen clan surrounded us from either side

Silver handled swords shadowed our heads

Armor piercing swords were on the verge of carnage

Leaving Walnar, I retreated

With the hope to spend a serene life

Not knowing that (I) would be caught in an even greater

trouble

Benevolence queued up from afar

Cloud rained, fresh buds blossomed greenery

Creepers named as Zumur and Leri, like sacred flowers

swing with current of air